بسم الله الرحمن الرحيم

فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ

وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ

كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ

قرآن کریم، سورہ انعام، آیات ۱۲۵، ۱۲۶

شمارہ ۲۰۲، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶

چیف ایڈیٹر: محمد حسین مظفری
ایڈیٹر: سیّد اختر مہدی رضوی

مشاورین علمی
سیّد امیر حسن عابدی، اوصاف علی، شاہ محمد وسیم
عبدالودود اظہر دہلوی، سیّد عزیز الدین حسین ہمدانی
سیّد علی محمد نقوی

تزئین جلد: عائشہ فوزیہ
صفحہ آرائی و کمپوزنگ: علی رضا

راہ اسلام میں شائع ہونے والے ہر مضمون کے لئے مقالہ نگار خود ذمہ دار ہے۔
مقالہ نویس کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔
راہ اسلام مقالات و مضامین کے انتخاب و اصلاح و ایڈیٹنگ اشاعت کے سلسلے میں پوری طرح آزاد ہے۔
اور اس سلسلے میں ایڈیٹوریل بورڈ کا فیصلہ آخری ہوگا۔
اشاعت کی غرض سے ارسال شدہ مقالہ کا خوشخط ہونا لازمی ہے۔ عبارت کاغذ کے ایک طرف ہی لکھی جائے
اور کاغذ A-4 سائز کا ہو تو بہتر ہے۔
صرف غیر مطبوعہ مقالات ہی ارسال کئے جائیں۔
تحقیقی مقالات کی آمادگی میں جن مآخذ و مدارک کا استعمال کیا گیا ہو۔ ان کا ذکر لازمی ہے۔
مقالہ کے ساتھ اس کا خلاصہ بھی ضرور ارسال کیا جائے۔
راہ اسلام میں شائع شدہ مقالات کی نقل یا ان کے ترجمہ و اقتباس کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں ہے
بشرطیکہ مآخذ کا ذکر کر دیا جائے۔

پریس: الفا آرٹ، نوئیڈا، یو۔پی

اسلامی علوم ومعارف اور علمی وثقافتی افکار وعقائد کا ترجمان

شمارہ ۲۰۲، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶

مقبوضہ سرزمین وآزادی دین

چیف ایڈیٹر

محمد حسین مظفری

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران

۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱

فون: ۲۳۳۸۳۲۳۲، ۳۳، ۳۴، فیکس: ۲۳۳۸۷۵۴۷

newdelhi@icro.ir

http://newdelhi.icro.ir

کتابوں کا تعارف : نقد و تبصرہ

	تبصرہ نگار	
تاریخ فیروز شاہی	پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین	۱۹۸
Political Representation of Muslims in India:1952-2004	پروفیسر مسعود احسن	۲۰۲
ساتھ رہتے ہوئے علیحدہ رہنا تاریخ و سیاست میں ثقافتی ہندوستان	پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین	۲۰۶

ثقافتی سرگرمیاں:

ہند و ایران ثقافتی تعلقات کا طلائی جشن	ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی	۲۱۱
اسلامی انقلاب کی ۲۸ ویں سالگرہ اور ''سعدی خصوصی انعام''	ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی	۲۱۶
ناگپور میں فارسی بازآموزی کا ساتواں دور	ناگپور یونیورسٹی	۲۱۹

فہرست

اداریہ:		۷
گفتگو:		
خانۂ فرہنگ ایران میں ایک روزہ سیمنار ''مقبوضہ علاقوں میں آزادی دین''		۱۴
مقبوضہ سرزمین و آزادی دین	محمد حسین مظفری	۲۵
نہج البلاغہ: اقدار بشریت و امن عالم کا سرچشمہ	سید اطہر رضا بلگرامی	۵۸
پیغمبرؐ اسلام کا آخری خطبہ اور حقوق انسانی کا عالمی منشور	نفیس احمد	۷۳
امیرالمؤمنین حضرت علیؑ کے سیاسی افکار نہج البلاغہ کی روشنی میں	رضا عباس علوی	۷۸
قرآن شناسی:		
قرآن اور سائنسی علوم	الطاف اعظمی	۱۰۸
عقاید شناسی:		
بارہ اماموں کے مختصر حالات زندگی	علامہ محمد حسین طبا طبائی	۱۳۴
تاریخ اسلام:		
زندگانی پیغمبرؐ اسلام: ایک مذہبی اور سیاسی سفر	آیت اللہ جعفر سبحانی	۱۶۳
ادبیات:		
مشاہیر کے کلام میں ذکر بے ثباتی	وسیم حیدر ہاشمی	۱۷۷

اداریہ:

مقبوضہ سرزمین اور آزادیٔ دین

آزادی، جمہوریت اور انسانی حقوق ایسی مقبول و پسندیدہ اصطلاحات ہیں جن کی افادیت، آفاقیت اور موثر کارکردگی سے انکار ناگزیر ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا ہر ذی شعور انسان ان اصطلاحات کی عظمت و اہمیت کا اعتراف کرتا ہے لیکن اس حیرت انگیز حقیقت کی تردید ناممکن ہے کہ عصر حاضر کی سامراجی طاقتیں انہیں اصطلاحات کو اپنا موثر ہتھکنڈہ بنائے ہوئے ہیں اور اقوام عالم کو مختلف النوع پابندیوں اور مہلک غلامی اور عدیم المثال بے سروسامانی کے چنگل میں دبوچنے میں ہمہ تن سرگرم ہیں۔ درحقیقت مغربی تہذیب وتمدن کے متوالوں اور علمبرداروں نے خود کو ان اصطلاحات کا خالق سمجھ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انفرادی آزادی کا سوال ہو یا سماجی آزادی کا مسئلہ، جمہوریت کی تشکیل کا معاملہ ہو یا انسانی حقوق کی پیروی وفراہمی اور حفاظت و بحالی کا معاملہ ہر جگہ مغربی اصول و قوانین اور اعمال و اقدار کو کسوٹی کا درجہ دیا جاچکا ہے۔ آزادی نسواں کا معاملہ ہو یا مغربی و دیگر بیرونی طاقتوں کے ذریعہ دنیا کے ترقی پذیر ملکوں میں حقیقی آزادی کا معاملہ ہر جگہ اور ہر مرحلہ میں حقیقی آزادی کی کسوٹی مغربی تہذیب وتمدن کے سایہ میں پروان چڑھنے والی آزادی ہی قرار پاتی ہے جس کے بموجب آزادی اور بے بند و باری کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور لامحدود و بے روک ٹوک والی آزادی مختصر سی مدت میں انسانی زندگی کو غیر معمولی گھٹن میں مبتلا کردیتی ہے۔ اسی طرح آزادی نسواں کی تحریک کے سایہ میں مرد وعورت کو، جنہیں افزائش نسل انسانی کا ضمانت دار بناکر بھیجا گیا ہے، ایک دوسرے کا مخالف بناکر پیش کردیا جاتا ہے حالانکہ اس حقیقت کی تردید آج بھی ناممکن ہے کہ مرد وعورت ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مرد کو عورت کی تکمیل اور عورت کو مرد کی تکمیل و زینت کا وسیلہ بناکر بھیجا گیا ہے۔ چونکہ یہ حقیقت مغربی معیار پر کھری نہیں اترتی اس لئے مغربی ذرائع ابلاغ عامہ نے اس کو مقبول نہیں ہونے دیا۔ جمہوریت کا بھی یہی حال ہے۔ مغربی دنیا خود کو جمہوریت کا خالق قرار دیتی ہے اور اس کا دعوی ہے کہ جمہوریت اور انسانی حقوق کی حفاظت کی آواز دنیا میں سب سے

پہلے مغربی مفکرین اور دانشوروں نے بلند کی ہے لیکن اب اس حقیقت کی پردہ پوشی کیسے کی جائے کہ گذشتہ نصف صدی سے آج تک مغربی اتحادی فوج فلسطین، لبنان، الجزائر، کویت اور اب افغانستان وعراق میں لاکھوں بے گناہوں کا قتل عام کرنے میں ہمہ تن سرگرم ہے اور اس کی نظر میں یہ مسلمان انسان نہیں ہیں؟ اسی وجہ سے انہیں آزادی اور جمہوریت جیسے بنیادی حقوق سے محروم کردیا گیا ہے! اور یہ سب کچھ انسانی حقوق و جمہوریت کی بحالی اور ان علاقوں کی ترقی وخوشحالی کے نام پر کیا جارہا ہے۔

درحقیقت آزادی جیسے گرانقدر مفہوم سے وابستہ مختلف النوع تحریکوں میں آزادی دین و مذہب کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے کیونکہ مذہب اس عظیم سرمایہ کا نام ہے جو محض اس دنیا تک محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ کار ابدی حیات تک وسیع ہوتا ہے اور اس آزادی کو مذہبی اور دیندار جماعت اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان ادیان و مذاہب کو سرکاری حمایت و پشت پناہی اسی وقت تک حاصل رہا کرتی تھی جب تک مذہبی مراسم کے ذریعہ حکومت کو کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا تھا۔

واضح رہے کہ حکمرانوں اور اقتدار کے متوالوں کا کوئی مذہب نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کے برعکس جب کبھی مذہب سے ان کے اقتدار کو خطرہ کی آہٹ محسوس ہوئی تو دین اور سیاست کے درمیان علحدگی کا راگ الاپتے ہوئے مذہبی عیسائی طاقت کو وائیکن شہر اور اسلامی مذہبی طاقت کو مسجدوں کی چہار دیواری کے اندر محدود کردیا۔ فقط اتنا ہی نہیں بلکہ دین وحکومت کے درمیان اتنا وسیع فاصلہ قائم کردیا گیا کہ دیندار افراد کا حکومت و سیاست سے اور حکمراں و ماہرین سیاست کا مذہب سے کوئی سروکار باقی نہ رہ جائے۔ مذہب اور مذہبی افراد کے ساتھ کھلواڑ کا یہ سلسلہ اسی جگہ ختم نہیں ہوتا بلکہ کبھی ارباب حکومت کے اقتدار کو زیادہ خطرہ محسوس ہوتا تو مذہب اور مذہبی اقدار کو ڈھال کی طرح استعمال کرنے میں ان لوگوں کو کسی ہچکچاہٹ کا احساس بھی نہیں ہوا اور وقت گذرتے ہی ارباب اقتدار کی حمایت کرنے والے علماء بقول علامہ اقبال: ''دو رکعت کے امام'' بن کر رہ گئے اور انسانی حقوق کی، جس میں انفرادی، اجتماعی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی حقوق بھی شامل ہیں، حفاظت کی ٹھیکیداری کا نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کے عام اجلاس میں انسانی حقوق پر مبنی منشور کو منظوری حاصل ہوئی اور اس عالمی تنظیم نے دنیا کے ہر گوشہ میں انسانی

حقوق کی حفاظت و بحالی کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر سنبھال لی اور اپنے پسندیدہ دین کی پیروی ہر انسان کا مذہبی حق قرار پایا لیکن حقیقی صورتحال کچھ اور تھی۔ اس منشور میں یہ کہا گیا ہے کہ صرف آزاد ملک کے لوگوں کو ہی نہیں بلکہ مقبوضہ سرزمین میں زندگی بسر کرنے والوں کو بھی اپنے پسندیدہ دین کی پیروی کا حق حاصل ہوگا لیکن ہندوستان پر برطانوی حکومت کے غلبہ کے دوران پری پیکر خواتین کے ذریعہ غیر عیسائی نوجوانوں کو عیسائیت کی طرف راغب کرنے والی داستانوں کو کیسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے اور اکبرالہ آبادی کی مشہور زمانہ نظم ''برق کلیسا'' کو کیسے فراموش کیا جاسکتا ہے جس میں اسلامی غیرت کی علمبرداری کے دعویدار خان صاحب پری پیکر دوشیزہ کو حاصل کرنے کے لئے اپنے پسندیدہ مذہب ''اسلام کو قصۂ ماضی'' کہنے میں ذرہ برابر شرم محسوس نہیں کرتے۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جب سابق عراقی صدر صدام حسین نے جملہ عالمی اسلامی اور انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کویتی مسلمانوں کا قتل عام کرتے ہوئے کویت پر اپنا قبضہ جمالیا تو امریکہ نے کویت کی آزادی کے بہانے اسلامی سرزمین پر اپنی فوجیں اتار دیں۔ بظاہر دنیا والوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی تھی کہ امریکہ نے خلیج فارس میں امن و سلامتی قائم کرنے اور کویت کو صدام کے چنگل سے نجات دلانے کی لئے اپنی فوج بھیجی ہے خود صدام کو بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ کویت کی آزادی اور اسلحوں کی نابودی کے نام پر عراقی عوام کو ایسے وحشیانہ مظالم کا شکار بنایا جائے گا جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ بات صرف فوجی کارروائی کے ذریعہ عراقی فوج سے کویت کی آزادی تک محدود نہ تھی بلکہ وہائٹ ہاؤس سے وابستہ مذہبی امور کے سربراہ نے عربی زبان میں ترجمہ شدہ بائیبل کے ہزاروں نسخے بھی امریکی فوج کے ساتھ کویت روانہ کئے تھے تاکہ کویت اور علاقے کے دیگر عرب ممالک کے مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف مائل کیا جاسکے اور انہیں یہ باور کرایا جاسکے کہ اسلام قتل و غارتگری کا مذہب ہے۔ واضح رہے کہ عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کو دہشت گرد، خونخوار، قاتل، ظالم اور بے رحم کی حیثیت سے متعارف کرانے کا بنیادی مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ بم دھماکوں اور لاشوں کے انبار کے سایہ میں زندگی بسر کرنے والے مسلمان اپنے مقدس دین اسلام سے بیزار ہوکر عیسائیت کی طرف مائل ہوجائیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ ان کے پیغمبر کے خلاف توہین آمیز کارٹون اور بیانات شائع کئے جارہے ہیں اور یہ بیانات کسی عام آدمی کے ذریعہ نہیں بلکہ دنیائی عیسائیت کے سربراہ پوپ کے ذریعہ

بھی منظر عام پر آ چکے ہیں اور اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مہلک سازشوں کا بازار گرم ہے اور گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگانے کا سامراجی کاروبار جاری ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو جس شخصیت کو خداوند عالم نے عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا تھا اس کے خلاف زہر آگین پروپیگنڈہ نہ کیا گیا ہوتا اور جس دین کی بنیاد ہی بارگاہ عالیہ خداوندی میں سر تسلیم خم کر دینا اور اپنی جملہ خواہشات کو رضای خداوندی کا تابع و فرمانبردار بنا دینا ہو اس کو دہشت گردی اور خونریزی سے وابستہ نہ کیا گیا ہوتا۔ بھگوڑوں اور ظالمانہ عمل انجام دینے والوں کو مجاہد و جانباز کہہ کر جہاد جیسے مقدس فریضہ کو بدنام کرنے کی کوشش نہ کی گئی ہوتی اور ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں اور ہزاروں بے گناہوں کے قاتل کو شہید کہہ کر شہادت کو داغدار نہ کیا گیا ہوتا۔ واضح رہے کہ عصمت و طہارت اور جہاد و شہادت خالص اسلامی اصطلاحات ہیں جن کو سب سے پہلے مذہب اسلام نے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا لہذا اسلام و قرآن نے ان کی شناخت کا جو معیار مقرر کیا ہے اس کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے اور اس قسم کی سازشوں کے ذریعہ اسلام کی نابودی کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے والا نہیں ہے لہذا مقبوضہ اسلامی علاقوں میں سادہ لوح مسلمانوں کی گمراہی و بے راہ روی کو اسلام کی ناکامی نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ سردست افغانستان پر امریکی اور یورپی اتحادی افواج کو بالادستی حاصل ہے اور فوجی سرپرستی میں کابل کے چوراہے پر افغانی مسلمانوں کی ریش تراشی اور افغانی خواتین کی نقاب سوزی کے ذریعہ اسلام کی نابودی کا خواب دیکھا جا رہا ہے۔ سردست ۴۱ سالہ افغانی باشندہ کی عیسائیت اور افغانستان کی عدالت میں اس کے خلاف زیر سماعت مقدمہ کی گونج پوری یورپی دنیا میں سنائی دے رہی ہے۔ امریکہ حکومت افغانستان سے پہلے ہی یہ مطالبہ کر چکا ہے کہ عبدالرحمٰن نامی اس افغانی شہری کو اس کے پسندیدہ دین عیسائیت پر عمل کرنے کی سہولت و آزادی فراہم کی جائے۔ جرمنی، اٹلی اور کینیڈا نے بھی حکومت افغانستان سے یہی مطالبہ کیا ہے۔ عبدالرحمٰن نے سولہ برس پہلے پاکستان میں پناہ گزیں جماعت کی امداد کرنے والی تنظیم کے ملازم کی حیثیت سے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا لیکن دو بچوں کی تولیت کے سلسلے میں عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے اور اس مقدمہ کی وجہ سے علماء اور اصلاح پسندوں کے درمیان کشمکش جاری ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ افغانی عدالت عبدالرحمٰن کو پھانسی کی سزا بھی دے سکتی ہے۔ اٹلی کی وزارت خارجہ نے یہ اعلان کیا ہے کہ اگر اس خبر کی

تصدیق ہوجاتی ہے تو اٹلی انسانی حقوق کے دفاع کی خاطر اس کی بھرپور مخالفت کرے گا۔

دوسری طرف واشنگٹن میں افغانی وزیر خارجہ عبداللہ کے ساتھ ایک پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے امریکی معاون وزیرخارجہ نیکولس برنس Nicholas Burns نے حکومت افغانستان سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ عبدالرحمٰن کے مذہبی حقوق کا احترام کرے۔ امریکی معاون وزیر خارجہ نے مزید کہا کہ ان کی حکومت آزادی دین کی بھرپور حمایت کرتی ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں افغانی آئین میں آزادی دین کی سہولت فراہم کی گئی ہے لہذا مجھے امید ہے کہ افغانی عدالت بھی اس آئینی حق کو قائم رکھنے میں معاون ثابت ہوگی۔

اس کے علاوہ بی بی سی نامہ نگار Jonathan Beale نے واشنگٹن سے خبردی ہے کہ اس واقعہ کی وجہ سے امریکہ بے چینی کا شکار ہے کیونکہ امریکہ جمہوریت اور آزادی کے قیام کے لئے افغانستان میں بہت بڑا سرمایہ لگاچکا ہے اور افغانستان کے حالیہ سفر کے دوران صدر بش نے اس بات پر اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے کہ کابل کو اب طالبانی مظالم سے پوری طرح نجات حاصل ہوچکی ہے۔ صدر بش کے اس بیان کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہ جاتی اگر افغانی عوام کو مذہبی آزادی جیسی چیز حاصل نہیں ہے۔

اٹلی کے وزیر خارجہ نے اس سلسلے میں یہ اعلان کیا کہ عبدالرحمٰن کی گرفتاری درحقیقت آزادی کے بنیادی اصول اور انسانی حقوق کے دفاع کی خلاف ورزی ہے اور جرمنی کے Cardinal Lehmann کا خیال ہے کہ اس واقعہ نے مذہبی آزادی کے خلاف خطرہ کی گھنٹی بجادی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کینیڈا نے افغانستان سے انسانی حقوق کی حفاظت کا مطالبہ کیا ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ عیسائیت قبول کرنے والے افغانی باشندہ کے خلاف تادیبی کارروائی افغانی شرعی قانون کی تنگ نظری کی علامت ہوگی۔

اگر ایک افغانی مسلمان کی عیسائیت پر حرف آجائے تو پوری دنیائے عیسائیت میں ہلچل پیدا ہوجاتی ہے اور یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ جمہوریت، آزادی اور انسانی حقوق کی پامالی کا بازار گرام ہوگیا ہے۔ بات فقط فلک شگاف نعروں تک ہی محدود نہیں رہ جاتی بلکہ سیاسی پناہ کے سایہ میں اس کو دیکھتے ہی دیکھتے اٹلی بلالیا جاتا ہے اور اٹلی کے وزیر اعظم کی طرف سے یہ اعلان جاری ہوتا ہے کہ اس افغانی باشندہ کو افغانی عدالت کی طرف سے ممکنہ سزائے موت سے بچانے کے لئے اسے اٹلی میں پناہ دی گئی ہے۔ واضح رہے کہ اسی اثنا میں اس ۴۱ سالہ عبدالرحمٰن نامی افغانی باشندہ کو پاگل و دیوالیہ

قرار دیتے ہوئے عدالت نے آزاد کردیا اور اس آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے دیکھتے ہی دیکھتے اٹلی پہنچادیا گیا اور افغانی پارلیامنٹ کی یہ آواز صدا بہ صحرا ہوکر رہ گئی کہ عبدالرحمٰن ملک سے باہر نہ جانے پائے!

واضح رہے کہ افغانستان پر حکمرانی کرنے والی موجودہ حکومت، اسلامی شریعت کی پابند ہے اور اسلامی شریعت کے بموجب کسی مسلمان کو اسلام سے روگردانی اور ارتداد کی اجازت نہیں ہے بلکہ اس کو مجرمانہ عمل قرار دیا گیا ہے اور اس کی سزا بھی بیان کی گئی ہے لیکن افغانستان کے داخلی امور میں اعلانیہ مداخلت کرتے ہوئے عبدالرحمٰن کو اٹلی میں پناہ دے دی گئی اور دنیا بھر میں قتل و غارت گری پھیلانے والے ملک امریکہ کے نائب وزیر خارجہ مسٹر برنس Mr. Burns نے اس اقدام کی ستائش کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ان کی حکومت مذہبی آزادی کی بھرپور حمایت کرتی ہے اور افغانستان کا آئین بھی آزادی دین کی حمایت کرتے ہوئے افغانی باشندوں کو اس آزادی سے محروم نہ رکھے گا بلکہ افغانستان کی عدالت بھی اس آزادی کا احترام کرے گی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ حکومت امریکہ نے افغانستان کی تعمیر و ترقی کے نام پر اس ملک میں اپنی فوج تعینات کررکھی ہے اور آزادی و جمہوریت اور انسانی حقوق کی بحالی کے بہانے اس ملک پر اپنا ناجائز تسلط برقرار رکھے ہوئے ہے اور اس مقبوضہ سرزمین میں آزادی دین کے نام پر تبدیلی دین کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے جو تمام عالمی قراردادوں اور معاہدوں کی خلاف ورزی ہے لیکن طاقت، دولت اور اسلحوں کی مدد سے اس غیر قانونی عمل کو قانونی قرار دیتے ہوئے غیر معمولی عملی و سیاسی بیداری سے مالامال موجودہ دنیای بشریت کی آنکھ میں دھول جھونکتے ہوئے جنوں کو خرد اور خرد کو جنوں کے نام سے موسوم کیا جارہا ہے۔

اسلامی آئین وقوانین سے ناواقف اور نام نہاد و بے عمل مسلمانوں کی مفلوک الحالی کو اسلام کی بے سروسامانی قرار دینے والے مغربیت کے متوالے دانشوروں کو بخوبی سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام ایک مجموعۂ قوانین اور مکمل ضابطۂ حیات کا نام ہے۔ اس کا کوئی خفیہ پروگرام نہیں ہے بلکہ اس کا قانون قرآنی تعلیمات اور سیرت نبوی پر منحصر ہے اور یہ انسان کو اس بات کی مکمل آزادی فراہم کرتے ہوئے اس سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ زر، زن اور زمین کی لالچ، خوف و دہشت اور زور و زبردستی سے پوری طرح آزاد رہتے ہوئے اسلامی شریعت کا بھرپور مطالعہ و تجزیہ کرے اور پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ خداوند عالم کی وحدانیت اور رسول مقبول حضرت محمد مصطفیٰ کی رسالت کا اعتراف کرتے ہوئے

پوری رضا و رغبت کے ساتھ بارگاہ عالیہ خداوندی میں سرتسلیم خم کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہوجائے اسلام قبول کرنے کے بعد اب مرد مسلمان کو ہمہ وقت اور ہر حال میں رضای الٰہی اور خوشنودی پروردگار کے لئے کام کرنا ہے۔ اب اس کی اپنی کوئی رضا و رغبت نہیں بلکہ اسے ہر حال میں راضی بہ رضای الٰہی رہنا ہے اور خداوند عالم کی رضا و خوشنودی کو ہی اپنے اعمال و افعال کی کسوٹی قرار دینا ہے۔ خداوند عالم نے جن اعمال کے انجام دینے کا حکم دیا ہے انہیں انجام دینا ہے اور جن اعمال کی بجاآوری سے روکا ہے ان سے دور رہنا ہے۔ اسلام خداوند عالم کا پسندیدہ دین ہے۔ قرآنی ہدایت کے بموجب ''لَااِکْرَاہَ فِی الدِّینِ'' اس کی تبلیغی راہ و روش کی اساس ہے یہ جبر وتشدد اور ظلم و جور کے ذریعہ نہیں بلکہ اخلاق حسنہ کے ذریعہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بناتا ہے اور اپنی بشر دوستی کے ذریعہ ہی اس نے پوری دنیا میں حیرت انگیز وسعت ومقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ دوسروں کی عیب جوئی کے بجائے انسان کو محاسبۂ نفس کی تعلیم دیتا ہے اور دشمن کے خلاف جنگ کو جہاد اصغر اور اپنے نفس کے خلاف جنگ ونبردآزمائی کو جہاد اکبر سے تعبیر کرتا ہے اور حقیقت بیں نگاہوں سے دیکھا جائے تو یہی ''راہِ اسلام'' ہے۔ والسلام

گفتگو

خانۂ فرہنگ ایران میں ایک روزہ سمینار

مقبوضہ علاقوں میں آزادیٔ دین

مذہب وہ گرانقدر سرمایہ ہے جس کا انسان کی زندگی سے گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہوا کرتا ہے اور انسان اس کو اپنی زندگی سے زیادہ عزیز رکھتا ہے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ایسے بیشمار حوادث موجود ہیں جن کی روشنی میں بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ انسان اس سرمایہ کی حفاظت کی راہ میں اپنی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ بھی قربان کرسکتا ہے۔ مذہبی آزادی ہر انسان کا ذاتی اور بنیادی حق ہے۔ اسی وجہ سے دنیا کے قومی اور بین الاقوامی آئین و قوانین میں آزادی دین کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے اور واضح لفظوں میں یہ کہا گیا ہے کہ ہر انسان کو اپنے پسندیدہ دین کی پیروی اور اس کی تبلیغ و اشاعت کا بھرپور حق حاصل ہے لیکن اس آزادی کے ناجائز استعمال کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اور کسی ایک مذہب کی پیروی کرنے والے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ آزادی دین کے سایہ میں دوسرے ادیان و مذاہب کی بے احترامی و رسوائی کا سامان فراہم کرے یا دھمکی و لالچ، مال و متاع اور لوٹ کھسوٹ و قتل و غارت گری کے ذریعہ تبدیلی دین کا بازار گرم کرے۔ البتہ کسی مذہب کے فضائل و محاسن سے متاثر ہوکر اگر کوئی فرد یا جماعت اپنی رضا و رغبت کے ساتھ اپنا مذہب بدل دے تو کوئی مضائقہ اور قانونی خلاف ورزی نہ ہوگی۔ واضح رہے کہ انتخاب مسلک کا معاملہ ہو یا تبدیلی دین و مذہب کا مسئلہ، مذہب اسلام نے اس معاملے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیا بلکہ واضح لفظوں میں یہ اعلان کیا کہ اسلام اس سلسلے میں زور و زبردستی اور جبر و تشدد کا قائل نہیں ہے بلکہ ہر فرد کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے قرآن مجید میں یہ کہا گیا ہے کہ: "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" یعنی دین میں جبر و اکراہ کی گنجائش نہیں ہے البتہ اپنے دین کی خوبیاں اور اس کے سایہ میں حاصل ہونے والی نعمتوں کی تبلیغ و اشاعت ضرور کی جاسکتی ہے۔

لیکن بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے ابتدائی دور میں رونما ہونے والے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ زدہ اور مقبوضہ علاقوں میں حملہ آور جماعت غلام قوموں کے مذہبی عقائد کے ساتھ کھلواڑ کررہی ہے۔ فلسطین، بوسنیا، افغانستان اور عراق میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کو جان

کی دھمکی اور مال کی گرمی اور حسین چہروں کی رعنائی اور عریانیت و برہنگی کے ذریعہ اسلام سے علیحدگی اور عیسائیت پسندی کی طرف مائل کیا جارہا ہے۔ واضح رہے کہ مصیبت زدہ اور مفلس ومحروم طبقے کے ساتھ ہمدردی اور انسان دوستی کے مظاہرے کے ذریعہ انہیں مذہب کی تبدیلی کے لئے مجبور کرنا ایک غیر انسانی اور خلاف قانون عمل ہے۔ ہر ملک میں دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمی سطح پر ایسے آئین و قوانین اور معاہدہ وقرارداد موجود ہیں جو اس امر کی اعلانیہ نفی وتردید کرتے ہیں۔

موضوع کی اہمیت و افادیت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران میں اس موضوع پر ایک روزہ سیمنار کا اہتمام کیا گیا ہے جس میں شریک ماہرین قانون اور دانشوروں نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا بھرپور تجزیہ کرتے ہوئے اپنی بات کہی۔ ذیل میں بعض دانشوروں کی تقریر کے اہم اقتباسات حاضر خدمت ہیں تاکہ قارئین کرام حقائق سے مطلع ہوسکیں۔

پروفیسر شاہ وسیم صاحب

خواتین وحضرات! میں مذہبی آزادی کو انتہائی محترم جانتا ہوں کیونکہ مذہبی آزادی ہی اصل آزادی ہے اس کے علاوہ عالمی سماج کو متمدن کرنے کے لئے بھی مذہبی آزادی کا ہونا اشد ضروری ہے لہذا یہ آزادی بہرصورت انسان کا بنیادی حق سمجھی جانی چاہئے کیونکہ جب تک انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا دوسرے سارے حقوق متاثر ہوتے رہیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی حقوق اور جمہوری نظام کے سلسلے میں بات کرنے والے ہمیشہ زد پر رہا کرتے ہیں اور یہ حقیقت بھی آشکار ہے کہ یہ سب ان نام نہاد ترقی یافتہ ملکوں کی طرف سے ہوتا ہے جو خود کو انسانی حقوق، عالمی مسائل اور جمہوری نظام کا حقیقی محافظ تصور کرتے ہیں۔

اس موقع پر ایک چیز ضرور تذکرہ میں آنی چاہئے اور مجھے یقین ہے کہ یہ اس وقت بھی تذکرہ میں آئی ہوگی جب حقوق العباد سے متعلق انسانی حقوق کمیشن نے قوانین بنائے، نافذ کئے تو انہیں اس متوقع دشواری کا سدّ باب کرنا چاہئے تھا جس کے نتیجے میں مختلف مقامات پر ایسی فکریں ابھر کر سامنے آتی ہیں جو ان سے اس کی مذہبی آزادی چھین لیتی ہیں جو اس کا بنیادی حق ہے، ایسے نظریات کی بیخ کنی کرنی چاہئے تھی جو تصور آزادی کے خلاف ہیں وہ کسی بھی ذی شعور کے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں۔

ہمیں عالمی عقائد کے تئیں احترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے متعلق عالمی قوانین میں بہت سی تبدیلیاں لانی چاہئیں جس کے ذریعے جنگی مزاحمت سے متاثر علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے

بادلِ ناخواستہ تبدیلی مذہب کے مسائل کا حل نکالا جاسکے یا ان مقامات کے علاوہ جہاں کہیں بھی ایسا ہوتا ہو کہ اجباری صورت میں کسی کو مذہب بدلنا پڑے تو مذہبی آزادی سے متعلق عالمی قانون اس کی مدد کرسکے جیسا کہ ۱۴ فروری ۱۹۱۶ء کو مدراس میں عیسائیوں کے ایک پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے بابائے قوم مہاتما گاندھی نے کہا تھا: ''تبدیلیٔ مذہب سے متعلق بیشتر مسائل میں میں نے یہ پایا کہ اس میں مذہبیت کا دخل کم ہے خارجی عناصر زیادہ کارفرما ہیں''۔

اس طرح کا استحصال بالکل ناقابل معافی ہے جس کے نتیجے میں کسی آدمی کو اپنی بھوک کی اتنی بڑی قیمت چکانی پڑے کہ اسے اپنا مذہب بدلنا پڑجائے۔

اس کے علاوہ فلسطینی عدلیہ کے مطابق اسرائیلی فوجوں کا برتاؤ فلسطینیوں کے مذہب کو لے کر بھی کبھی اچھا نہیں رہا۔ منجملہ ان مظالم کے جو انہوں نے فلسطینیوں پر روا رکھے ان میں یہ زیادتی انتہائی دل آزار تھی کہ وہ اہل فلسطین کی عبادت گاہوں اور عبادت گزاروں پر سخت نظر رکھتے ہیں یہاں تک کہ ایک زمانے میں ۴۰ سال سے کم کا آدمی عبادت گاہوں میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی پابندیاں مذہب کے دامن آزادی کو تار تار کرنے کے لئے کافی ہیں جو انتہائی شرمناک حرکت ہے۔

آقای مظفری

محترم ایم۔ایچ ۔مظفری نے سب سے پہلے پروفیسر شاہ وسیم صاحب کا شکریہ ادا کیا اور پھر سیمنار میں تشریف لائے ہوئے جملہ مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے گفتگو شروع کی۔ آپ نے فرمایا کہ آج اس سیمنار کے ذریعے ہمیں یہ موقع ملا ہے کہ ہم آزادی مذہب اور تفریق مسلک سے متعلق انتہائی مفید اور کارآمد گفتگو کریں جس سے عوام الناس کے شک وشبہات کو دور کیا جاسکے۔

انسانی حقوق کے عالمی منشور کی آمادگی کے وقت اسے آرٹیکل نمبر ۱۸ کے طور پر شامل کیا گیا تھا۔ لبنانی وفد کے منبر جناب ملک نے بین الاقوامی اعلانیہ کے آرٹیکل ۱۸ میں اس نکتہ کے اضافہ کی سفارش کی کہ انتخاب مذہب کی آزادی کے ساتھ ساتھ تبدیلی مذہب کے سلسلے میں بھی عام آدمی کو خود مختاری حاصل ہونی چاہئے تاہم بیشتر ترقی یافتہ ممالک کے سربراہوں نے اس کی ممانعت بھی کی۔

اس صورت حال کے پیش نظر ہمیں چاہئے کہ ہم آزادی مذہب کے اصل تصور کو لوگوں کے سامنے لائیں اور یہ طے کریں کہ تبدیلی مذہب اور عقیدہ سے متعلق کیا قانونی صورت ہے؟ اور کیا ہونی

چاہئے؟ تاکہ جنگی تاراجی کے شکار ممالک اور مقبوضہ علاقوں میں پیش آنے والے تبدیلی مذہب کے مسائل میں یہ بہ آسانی پتہ لگایا جاسکے کہ تبدیلی مذہب وعقیدہ کرنے والا شخص اپنی ذاتی اور آزادانہ رائے سے مذہب بدل رہا ہے یا کسی خارجی اور عارضی تاثر میں اسے عقیدہ بدلنا پڑ رہا ہے جیسا کہ جنگ کے نامساعد حالات میں نظر آتا ہے مثلاً ایک شخص اسپتال میں داخل کرایا جائے اور اس کے بیٹے کو بلوا کر اس سے علاج کے اخراجات کے بدلے تبدیلی مذہب کا مطالبہ کیا جائے ظاہر ہے کہ یہ طرز کسی صورت بھی قابل قبول اور لائق ستائش نہیں سمجھا جاسکتا اس لئے کہ یہ اس کی زندگی کے بنیادی حقوق پر ڈاکہ ڈالنے جیسا ہے۔

مجھے امید ہے کہ تمام دانشور اور مفکرین ایسے پیچیدہ مسائل پر اپنے مفید و گرانقدر خیالات سے ہمیں مستفید فرمائیں گے۔

پروفیسر اقبال احمد انصاری صاحب

مذہبی آزادی کا حق حقوق انسانی کے عالمی معیاروں کے علاوہ خود اسلام کی بنیادی تعلیم کا لازمی جزو ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت مشرکین مکہ کے نزدیک مذہبی عقیدہ و مسلک آبائی ورثہ کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک فرد کو یہ آزادی نہیں تھی کہ وہ اپنے ضمیر اور عقل و تفکر کی بنیاد پر جو عقیدہ و مسلک چاہے اختیار کرے۔ عیسائی اور یہودی لوگوں کا یہ خیال تھا کہ نجات اخروی کا انحصار صرف ان کے اپنے فرقہ وگروہ سے تعلق پر تھا۔ اس کے بجائے اللہ تعالی کی وحی کے ذریعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو دعوت دی اور کہا کہ اللہ نے انسان کے ذہن و ضمیر وقلب کو جو صلاحیتیں دی ہیں انہیں استعمال کرکے آزادانہ تفکر اور آفاق وانفس میں اللہ کی آیتوں کا مشاہدہ کرے۔ اسی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے لوگوں نے اسلامی عقیدۂ توحید اور اعمال صالحہ کی بنیاد پر آخرت میں جزا وسزا کے مسلک کو قبول کیا۔ عیسائیوں و یہودیوں کے برعکس اسلام نے تمام سابق انبیاء کی تصدیق کرتے ہوئے نجات کا انحصار عقیدۂ توحید اور اعمال صالحہ قرار دیا۔ اس آفاقی پیغام آزادی کی مخالفت قبائلی و مذہبی تعصب اور سیاسی رقابتوں کی بناپر ہوتی رہی جس کی وجہ سے گروہ مسلمین کو سخت صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن جماعت مسلمین نے موعظہ حسنہ کے علاوہ کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا حتی کہ انہیں اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی سازش ہوئی جس کی وجہ سے انہیں ہجرت کرنی پڑی۔ دس سالہ مدنی دور میں مشرکین

مکہ نے حربی تصادم کا راستہ اختیار کیا۔ اس صورت حال میں اللہ نے مسلمانوں کو اپنی جان و ایمان کے تحفظ کے لئے دشمنوں سے جنگ کی اجازت دی جس کا مقصد طاقت سے اسلام کی اشاعت نہیں بلکہ طاقت کے ذریعہ اسلام و اہل اسلام کو زندگی اور طریقہ عبادت کے بنیادی حقوق سے محروم کرنے کا جو عزم مخالفین اسلام نے کیا تھا اس سے انہیں باز رکھنا تھا۔ اس مسلسل حالت جنگ کے سیاق میں بعض منافقین اور مفاد پرستوں نے اسلام قبول کرنے کا ڈھونگ رچا اور بعد میں اس سے نہ صرف پلٹ گئے بلکہ دشمنوں کی صفوں میں شامل ہوکر اسلام دشمنی کی روش اختیار کی۔ اسلام میں ایسے باغیوں کی وہی سزا رکھی گئی جو حالت جنگ میں ملک و قوم دشمنی میں مبتلا فوجیوں اور شہریوں کو اب تک دی جاتی ہے۔

اس خصوصی صورت حال کو چھوڑ کر اسلام نے "لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ" یعنی دین میں کوئی جبر نہیں کے عمومی مسلک کا اعلان کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بارہا اللہ نے یہ بھی تلقین کی کہ آپ کا کام پیغام حق پہنچادینا ہے اس کی قبولیت کی ذمہ داری آپ پر نہیں اور اللہ نے صاف یہ بھی کہا کہ اللہ چاہتا تو ہر فرد بشر کو ایمان کی توفیق دیتا لیکن اسی کی مرضی ہے کہ لوگ جو عقیدہ و مسلک چاہیں اختیار کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کہا کہ آپ ان سب لوگوں پر نگہبان نہیں۔

اس مسلک کا تقاضہ ہے کہ حقوق انسانی کی آزادی کے آفاقی معیاروں کی مسلمان علماء و قائدین اور حکومتیں بھرپور تائید کریں اور اپنے ملکوں کے دستور و قانون کے ذریعہ اس کے تحفظ کی ضمانت دیں۔ مذہبی آزادی کے حق کا یہ لازمی جزو ہے کہ انسان اپنی مرضی سے اپنے ضمیر و ذہن کے فیصلہ کے مطابق اپنا آبائی مذہب یا اختیار کردہ سابق مذہب بدل کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے۔

البتہ سوسائٹی وملت اور حکومتوں کا یہ فرض بھی ہے اور حق بھی کہ وہ اس کی قانونی نگرانی کا انتظام کریں کہ مذہبی آزادی کے حق کو استعمال کرتے ہوئے کوئی مذہبی تبلیغی انجمن یا مبلغ یا حکومت کسی طرح کے براہ راست یا بالواسطہ خوف یا لالچ یا فریب کے ذریعہ معاشی و سیاسی و سماجی کمزوری میں مبتلا افراد و گروہوں کو تبدیلیٔ مذہب پر آمادہ نہ کریں مثلاً کسی فاتح و قابض اور ان کی حلیف جماعتوں کو اس کا حق نہیں دیا جاسکتا کہ مفتوحہ و مقبوضہ علاقے کے لوگوں کو وہ تبلیغی مشن کے ذریعہ تبدیلیٔ مذہب کے لئے آمادہ کریں۔ یہی بات پناہ گزیں (Refugees) اور پناہ چاہنے والے افراد (Asylum Seeker) پر صادق آتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر ملک کے شہریوں میں مفلس و ان پڑھ اور

مجبوریوں ومحرومیوں میں مبتلا افراد و طبقات میں فلاحی کام کے ساتھ مذہبی تبلیغ کے کام سے اس کا خدشہ ہوسکتا ہے کہ فلاحی کام محرومین کو تبدیلی مذہب پر آمادہ کرنے میں تحریص کا رول ادا کررہا ہے۔ اس لئے یہ اصول اختیار کرنا ہی صحیح ہے کہ مقبوضہ علاقوں اور پناہ گزینوں اور کمزور طبقات میں فلاحی کاموں کے ساتھ کوئی تبدیلی مذہب کا تبلیغی کام نہ کیا جائے۔ اگرچہ افراد کو یہ آزادی ہوگی کہ وہ اگر آزادانہ یہ اعلان کریں کہ انہوں نے اپنی مرضی سے مذہب بدلنے کا فیصلہ کیا ہے تو انہیں حکومت یا معاشرہ اس سے نہ روکے۔ ضمانت صرف اس کی حاصل کرنی ہوگی کہ تبدیلی مذہب کا عمل واقعی آزاد مرضی سے اختیار کیا گیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ عالمی سطح پر تمام قائدین و داعیان مذاہب ایک ضابطہ اخلاق پر اتفاق کرکے اسے نافذ کریں جس کی رو سے مجبوری وضعف میں مبتلا افراد کے درمیان تبدیلی مذہب کی سعی نہ کی جائے اگرچہ روحانی و اخلاقی تعلیمات کی اشاعت کی اجازت ہو۔

اس تبدیلی مذہب کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے مسلمانوں کو اس عقیدہ سے دستبرداری نہیں کرنی پڑے گی کہ اسلام اللہ کا آخری دین حق ہے جس کی تکمیل ساری انسانیت کے لئے ان کی دنیاوی فلاح واخروی نجات کے لئے اللہ نے کی۔

جو لوگ صرف رائے کی وجہ سے بغیر کسی فتنہ وشر دائرہ اسلام سے الگ ہوجائیں ان کو راہ حق پر دوبارہ لانے کی سعی میں کوئی قانون حارج نہیں۔

ایم۔ایل سنگھوی صاحب

اجلاس کے دوسرے مقرر کی حیثیت سے ایم۔ ایل سنگھوی صاحب نے اپنی گفتگو میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ حملہ آور اور جنگجو لوگوں نے ہمیشہ دینی اور مذہبی عقائد کو پامال کیا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جنگ زدہ علاقوں میں دینی اعتقادات و عقائد کو غیر معمولی فروغ حاصل ہورہا ہے۔ واضح رہے کہ ۱۹۸۸ء میں اقوام متحدہ تنظیم کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی کہ دنیا کے تمام مذاہب سے اذیت رساں اعمال کو خارج کردیا جائے لیکن بعض ممالک نے اس تجویز کی مخالفت کی اور اس کو تنظیم کی قبولیت حاصل نہ ہوسکی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی مذہب ایک پیچیدہ موضوع ہے، اس پر صد در صد اطمینان بخش جواب ملنا مشکل ہے ممکن ہے پروفیسر اقبال انصاری کے پاس اس سلسلے میں تشفی بخش مواد موجود ہو چونکہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا مطالعہ آزادیٔ مذہب جیسے موضوعات کے پیش نظر اصول ساز

صلاحیت کا حامل ہوتا ہے۔

سچائی یہ ہے کہ ایسے مسائل پیدا ہی نہ ہوں اگر ہم انسانیت پر مبنی اصولوں پر آئینی رشتوں کو استوار کرنے پر زور دیں جیسا کہ میں نے ڈاکٹر مظفری صاحب سے دورانِ گفتگو کہا کہ عرب ممالک کی سائنسی تنخیوں کا سبب یہی ہے کہ ان کے یہاں رشتوں کی استواری اور سعی باہم کا فقدان ہے۔ کوشش کریں تو مسائل کا خالص دینی جائزہ بھی سیکولر ہوسکتا ہے اور اس کے نتائج بھی بڑے مؤثر ہوسکتے ہیں بشرطیکہ اسے انسانی حقوق وفرائض کے تعین کے وقت اہم رکن کی حیثیت سے برتا جائے۔

میرا خیال ہے کہ سیکولرزم کا صحیح مفہوم عوام تک نہیں پہنچا ہے۔ ہندوستانی نقطۂ نظر سے سیکولرزم کی تعریف یہ ہے کہ سارے مذاہب کا احترام کیا جائے اور یہی سیکولرزم کا اصل تصور ہے کہ ہر انسان کو عقائد وعبادات کی مکمل آزادی حاصل ہو۔

اس موقع پر ہندوستان کی دو عظیم شخصیتوں کا مکالمہ یاد آرہا ہے جس میں یہودیوں کے عظیم مذہبی قائد فادر اینڈریوز اور ہندو قوم وملت کے مہاتما گاندھی شامل ہیں فادر اینڈریوز نے گاندھی جی سے کہا کہ میں آپ سے چند انتہائی فطری اور سطحی قسم کے موضوع پر بات کرنے کے لئے معذرت خواہ ہوں مگر آپ ہمیں بتائیں کہ ایسے کون سے فرائض ہیں جو ہم آپس میں تقسیم کرسکتے ہیں؟ گاندھی جی نے کہا کہ ایک دوسرے کے مذہب وعقائد نیز اعمال عبادات کو ہم محترم جانیں یہی ہمارا عظیم ترین فریضہ ہے نیز اچھی خبریں ایک دوسرے تک پہنچائیں جس سے ایک مضبوط اور مہذب معاشرہ کی تعمیر ہوسکے یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہبی آزادی کی تاریخ اغلاط سے پُر ہے مگر مجھے یاد ہے کہ شکاگو میں مذہبی آزادی پر ۱۹ ویں صدی کے آخری دہائی میں ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں ایک دانشور نے کہا کہ خدا نے مختلف مذہب بنائے ہیں اور یہ بات کسی مذہب کے خدا نے نہیں کہی کہ دوسرے مذاہب کی توہین کی جائے۔

اس کے ساتھ ہی ایک آدمی کو اپنے مذہب سے متعلق فیصلوں پر اتنا مضبوط ہونا چاہئے جیسا کہ نوجی کا واقعہ ہے کہ میں جو ہوں وہ ہوں دوسرے چاہے جو بھی کہیں، میں اسی پر قائم رہوں گا جو میرا عقیدہ ہے اور مجھے اس پر کسی کے سامنے صفائی دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پس یہ کہا جاسکتا ہے کہ اصل آزادی ذاتی تجزیہ وتفہیم پر بھی بہت حد تک منحصر ہے۔

اب تک کی گفتگو میں آزادی مذاہب کا جاہے جو بھی مفہوم طے پایا ہو مگر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ

ہیومن رائٹس کمیشن اور عالمی مفہوم آزادیٔ مذہب میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ دراصل آزادی مذہب ایک ایسا مسئلہ ہے جو بین الاقوامی قانون کے بجائے سماج اور نظام شہریت کی ضرورت کی حیثیت سے جاننا چاہئے اور ظاہر ہے کہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسانی وقار کا تحفظ ہو سکے اور ایک مہذب معاشرہ تعمیر ہو۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہیومن رائٹس اس میں کچھ زیادہ نتیجہ خیز ہوسکتا ہے اگر عالمی سماج اس کے نفاذ پر راضی نہ ہو۔

یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ دوسرے مذاہب کا احترام کریں اور ہر انسان اپنے طور پر اس کا خیال رکھے اور اس کو بہر صورت دنیا کے ہر گوشہ میں بھی عملی جامہ پہنانا چاہئے اور جو ملک اور نظام اس کی خلاف ورزی کرے اس پر ملامت کرنی چاہئے نیز سماج کے ماہرین کو چاہئے کہ اس قسم کے قوانین پر بہتر عمل درآمد کرائیں۔ کچھ ہندوستان میں بھی سیکولرزم کے نام پر اس کا غلط پرچار کرتے ہیں۔ جن ممالک نے اس سے متعلق عالمی قرارداد کو مانا انہیں بہرحال بطرز احسن اس کا نفاذ کرنا چاہئے۔

مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہورہا ہے کہ ہندوستان، انڈونیشیا، ایران، اسرائیل، اٹلی، جارڈن جیسے ممالک میں ابھی بھی باقاعدہ اس پر عمل نہیں ہورہا ہے جو بہت ضروری ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں یہ ممالک اور بقیہ ممالک بھی متحد قسم کے بین الاقوامی قوانین کو نہ صرف مانیں گے بلکہ مؤثر عمل درآمد بھی کرائیں گے۔ چونکہ سماج پر سب سے بڑا اثر اس کے سیاسی نظام کا ہوتا ہے۔

پروفیسر دیسائی

آزادی مسلک و آزادی عمل ایک ایسا جامع عنوان ہے جو مذہب وعقیدہ سے متعلق تمام مسائل کا احاطہ کئے ہوئے ہے یعنی تبدیلی مذہب کا مسئلہ بھی اس کے حدود امکان سے باہر نہیں ہے۔

میرا خیال ہے اس سلسلے میں آئے دن ہم لوگوں کو ایک ایسے مسئلہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو کسی بھی سماج و معاشرہ اور ملک و جمہوریت میں اکثر و بیشتر دکھائی دیتا ہے وہ تبدیلی مذہب کا مسئلہ ہے جو کبھی کبھی اتنا طولانی ہوجاتا ہے کہ عدالت عظمیٰ (سپریم کورٹ) تک کی نوبت آجاتی ہے جس کے ذریعے ایک مذہب سے دوسرا مذہب اختیار کرنے پر لوگ چراغ پا ہوجاتے ہیں اور اسے غلط ٹھہراتے ہیں۔

اس موقع پر میرا یہ ماننا ہے کہ ہر ایک کو اپنی پسندیدہ راہ پر چلنے اور مذہب بدلنے کا پورا حق ہے اگر وہ دوسروں کے لئے مضر اور غلط نہ ہو اور یہ کہ وہ دوسرے مذاہب اور اہل مذاہب کے لئے دل آزار نہ ہو۔

پس یہ مسئلہ بالکل صاف اور واضح ہے کہ ہر فرد فرید کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک مذہب سے

دوسرے مذہب پر یا بقول سماج و معاشرہ ایک صحیح سے غلط کی طرف جاسکتا ہے۔

آزادی مسلک کا اصل تصور اور اس کی حقیقی تصویر یہی ہے جسے غیر جانبدار اور اسلامی بھی کہا جاسکتا ہے چونکہ اسلام کا آغاز ہی تبدیلی مذہب کے انقلابی رجحان سے ہوا تھا چنانچہ جہاں کچھ لوگ پیغمبرؐ خدا کی نیک نیتی پر بھی دعوت حق پر لبیک کہتے ہوئے مسلمان ہوگئے وہیں کچھ لوگوں نے مخالفت بھی کی کہ محمدؐ نے لوگوں کو بھڑکا دیا لوگ ہمارا اتنا قدیمی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہوتے جارہے ہیں۔ حالانکہ یہ بات طے ہے کہ کسی انسان کا شعوری زندگی کی ابتدا میں کسی مذہب کا اختیار کرنا یا دوران زندگی مذہب بدل دینا کسی اعتراض کا جواز نہیں فراہم کرتا یہ اس کا خالص نجی معاملہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر فاطمہ شہناز (یو۔ایس۔اے)

سب سے پہلے میں شکرگزار ہوں مظفری صاحب کی اور ان تمام لائق احترام سامعین کی جو انتہائی دلجمعی سے یہاں جمع ہوئے ہیں۔

تحفظ حقوق کے نقطۂ نظر سے بین الاقوامی اداروں کے ذریعے بنائے گئے قوانین اور اعلانیہ اس جہت میں ایک کوشش تو ہیں مگر عراق، افغانستان، کشمیر اور تمل ناڈو جیسے مقامات پر انتخاب مسلک اور تبدیلی مذہب جیسے مسائل سے اس کی افادیت پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ مسئلہ مزید پیچیدہ ہوتا جارہا ہے، بالخصوص ان جگہوں پر جہاں جنگ یا قتل و غارت گری کی صورت حال ہے وہاں تبدیلی مذہب کا مسئلہ انتہائی افسوس ناک منزل کو پہونچ چکا ہے۔

کشمیر اور تمل ناڈو جیسی جگہوں پر عیسائی کارندے سماجی خدمت سے وابستہ تنظیم (این۔جی۔او) کے نام پر لوگوں کو تبدیلی مذہب کی نہ صرف رغبت دلا رہے ہیں بلکہ انہیں عیسائی ہونے پر مجبور بھی کررہے ہیں۔ اس طرح کے معاملات طشت از بام تب ہوئے جب سنامی لہروں سے متاثرین میں سے تمل ناڈو کے رہنے والے افراد نے تبدیلی مسلک کی عیسائی پیشکش کو کسی بھی قیمت پر قبول کرنے سے انکار کردیا اور اب تو یہ عام ہورہا ہے کہ کسی نامساعد حالات کے شکار آدمی کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے معمولی مال و متاع کے عوض مذہب بدلنے کی بات کہی جاتی ہے اس طرح سے ایک نئی مذہبی دہشت گردی کا چہرہ ابھر کر سامنے آرہا ہے جس کا وجود آہستہ آہستہ نہایت گھناؤنا روپ حاصل کرتا جارہا ہے۔ ایسے میں ہمارا فریضہ ہے کہ ہم ایسے معاشرہ کی تعمیر کریں جہاں ہر ایک کے

جذبات کی قدر ہو، ہر ایک اپنے پسندیدہ دین کی پیروی کے لئے آزاد ہو اور سب کو حریت و آزادی حاصل ہو۔ واضح رہے کہ کسی شخص یا جماعت کی اقتصادی بے سروسامانی اور مفلوک الحالی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے مذہب کی تبدیلی کی شرط پر اس کی اعانت کرنا درحقیقت ایک غیر انسانی عمل ہے۔

دھیان رہے یہی اصل حقوق العباد ہے جو فطری طور پر ایسا ہے کہ کسی خارجی دباؤ کو برداشت نہیں کرتا بالخصوص انتخاب مسلک و مذہب میں ہرگز دوسرے کی رائے کو لائق توجہ نہیں گردانتا۔

ڈاکٹر اجے سندر جی (سابق ہائی کمشنر)

میں سمجھتا ہوں کہ آزادی مذہب مقبوضہ علاقوں اور جنگ سے متاثر معاشروں کے عنوان سے قطع نظر محض آزادی مذہب ہی خاصا پیچیدہ اور وضاحت طلب مسئلہ ہے۔

اس قسم کے موضوعات سے متعلق اٹھنے والے سوالات کا سوفیصدی تشفی بخش جواب شاید ہی کسی کے پاس ہو۔ ایسے افراد جو مذہبی آزادی کی برابری اور غیر جانبداری کے اصولوں کی وکالت کرتے ہیں انہیں بھی انتخاب مسلک اور تبدیلی مذہب جیسے مسائل کے لئے ایسے مدلل جوابات کی تلاش کرنی ہوگی جو سماج کے ہر طبقہ کے لئے قابل قبول ہوں۔

میرا خیال ہے اس موضوع پر پروفیسر اقبال انصاری کی تحریریں اور تقریریں انتہائی تشفی بخش مواد کی حامل ہیں جس میں انہوں نے آزادی فکر وعقیدہ کے ساتھ ہی ساتھ اپنے پسندیدہ دین کی پیروی کو بھی انسان کا بنیادی حق قرار دیا ہے اور دنیا کے زیادہ تر ملکوں میں پسندیدہ مذہب کی پیروی کی آزادی کو آئینی ضمانت بھی فراہم کی گئی ہے۔ اس آزادی میں مذہب کی تبدیلی کا حق بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ آزادی بیان کے ذیل میں آزادی دین کی بات بھی شامل ہے۔ ہندوستانی آئین کی دفعہ ۲۵ میں اس بات کی مکمل وضاحت موجود ہے۔ تبدیلی مذہب کے سلسلے میں کسی قسم کے دباؤ یا ظالمانہ و حرص آفریں ہتھکنڈوں کے استعمال کی مخالفت کا ذکر بھی موجود ہے اور تبدیلی مذہب کے سلسلے میں آزادانہ انتخاب پر بھی تاکید کی گئی ہے۔ اس موضوع کے سلسلے میں یہ ذہن نشین رکھنا بہت ضروری ہے کہ آزادی مذہب کی تاریخ اغلاط سے پر ہے۔ جناب محمد حسین مظفری صاحب نے ہمارے لئے اس موضوع پر انتہائی مفید معلومات فراہم کی ہیں۔

مجھے یاد ہے شکاگو میں مذاہب کے سلسلے میں عالمی کانفرنس تھی۔ ایک آدمی جسے صدر جلسہ بنایا گیا تھا اس نے اپنی تقریر میں بڑی عجیب بات کہی کہ خدا نے ہی مختلف مذاہب بنائے ہیں مختلف قسم کے

لوگ پیدا کئے ہیں لہذا یہ کسی مذہب کے خدا کو منظور نہیں کہ ایک مذہب کو اپنانے کے بعد بقیہ تمام مذاہب کا انکار کر دیا جائے۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ لوگ اپنے لئے مذہبی آزادی کے خواہش مند ہوتے ہیں مگر دوسروں کو اس کی اجازت نہیں دیتے اور یہی جذبہ دوسرے مذاہب کی اہانت اور اہل مذاہب کی دل آزاری کا سبب بنتا ہے جو تصور آزادی مذہب کے بالکل خلاف ہے۔

مقبوضہ سرزمین و آزادیٔ دین

محمد حسین مظفری

سرزمین عراق پر غاصبانہ تسلط اور اتحادی افواج کے فرائض کے بارے میں ماہرین قانون کے درمیان عالمی سطح پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری ہے۔ مقبوضہ سرزمین میں دین کی پیروی کی آزادی ایسا اہم موضوع ہے جس پر تمام عالمی معاہدوں اور کنونشنوں میں بھرپور تاکید کی گئی ہے لیکن گذشتہ چند برسوں کے دوران امریکی سیاسی ماہرین کے خیالوں اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے والی تہشیری یعنی عیسائی مبلغین کی جماعتوں کی منصوبہ بند سرگرمیوں کو دیکھنے کے بعد کسی مبالغہ و ہچکچاہٹ کے بغیر مکمل وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سرزمین عراق و دیگر مقبوضہ علاقوں میں آزادی دین کے سلسلے میں کئے گئے عالمی معاہدوں کی پیروی کا اہتمام نہیں ہے۔ محترم مقالہ نگار نے عصری عالمی حقوق کی روشنی میں آزادیٔ دین کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ اتحادی افواج کی ذمہ داری ہے کہ وہ عراقی عوام کو ان کے پسندیدہ دین کی آزادانہ پیروی کے لئے لازمی وسائل و امکانات فراہم کریں اور انسان دوستانہ امدادی سرگرمیوں پر بھرپور اور غیر جانبدارانہ نظارت کا فریضہ بھی انجام دیں۔ ادارہ

عراقی قبضہ سے کویت کی آزادی کے بہانے کی گئی فوجی سرگرمیوں کے دوران وہائٹ ہاؤس سے وابستہ عیسائی مبلغ فرینکالن گراہام نے انجیل کے ہزاروں عربی نسخے سعودی عرب میں واقع فوجی امریکی ٹھکانوں کو ارسال فرمائے تاکہ امریکی فوجیوں کے ذریعہ انہیں مقامی لوگوں کے درمیان تقسیم کیا جاسکے۔ عیسائی مبلغ کے اس اقدام سے نہ صرف عربستان کے قانون کی خلاف ورزی ہوئی بلکہ دونوں ملکوں کے درمیان ہونے والے معاہدہ کی روشنی میں بھی یہ بات ناجائز اور غیر قانونی تھی۔ جب نورمن شوارتسکوف نے اس موضوع کے بارے میں شکایت کی تو اس نے بتایا کہ وہ اعلیٰ افسروں سے لازمی احکام حاصل کرچکا ہے۔[1]

عراق میں عیسائی تبلیغی سرگرمیاں درحقیقت شمالی عراق میں ''آسمان امن'' کی ایجاد کے زمانے

1- Jane Lampman "A crusade after all? Plans of some Christians to envangelize as they offer aid pose dilemma for Iraqi reconstruction" the Christian Science Monitor April 17,2003

میں شروع ہوگئی تھیں کیونکہ آسمان امن کی ایجاد کے سایہ میں بہت سی عیسائی تبلیغی تنظیمیں انسان دوستانہ امداد کی فراہمی کے بہانہ شمالی عراق کی طرف روانہ ہوگئی تھیں۔ ان تنظیموں سے وابستہ ماہر سبلغین لوگوں کے درمیان کھانا اور دوا تقسیم کرتے وقت ایسی کتابیں بھی تقسیم کیا کرتے تھے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زندگی اور ایسے موضوعات کی وضاحت ہوتی تھی جن کے ذریعہ قرآنی ارشادات کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان شکوک پیدا کئے جاسکیں۔[۱]

عراقی حالات سے وابستہ انسانی مسائل کا تذکرہ قرارداد ۶۸۸ میں موجود تھا۔ اس قرارداد کے ذریعہ عراق سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ عالمی امدادی تنظیموں کو جملہ لازمی وسائل و امکانات فراہم کردیئے جائیں تاکہ وہ اپنے مقصد کو پورا کرسکیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان تنظیموں سے وابستہ افراد کے خلاف طاقت کا استعمال ہرگز نہ کیا جائے۔ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے اس قرارداد کو اہم دستاویز قرار دیتے ہوئے عراقی کردوں اور شیعوں کو لازمی حفاظت فراہم کرنے کا بہانہ بناتے ہوئے آسمان امن (No fly zone) کی ایجاد کا کاروبار شروع کردیا اور تھوڑے دنوں کے بعد پرواز کے لئے ممنوع علاقے کی نشاندہی کردی گئی۔[۲] اسی طرح ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو رونما ہونے والے دردناک حوادث کے بعد امریکی صدر جمہوریہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کو صلیبی جنگ کا نام دے دیا۔ اگرچہ اس متنازعہ بیان پر ہونے والے داخلی اور بیرونی ردعمل اور احتجاجات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے اپنا یہ بیان فوراً واپس بھی لے لیا۔ پھر بھی دنیا کے اکثر لوگ اس متنازعہ بیان کے سلسلے میں متفکر ہیں کہ صدر جمہوریہ امریکہ نے اچانک ان کلمات کا استعمال نہیں کیا تھا۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں مقامی اور بیرونی مشیروں کے درمیان متضاد خیالات اور ٹکراؤ کے بارے میں مطالعہ کرنے والی جماعت کے سربراہ ڈاکٹر جان وایٹ اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عراق درحقیقت مغربی تبلیغی جماعتوں کی موجودہ پریشانی کا دوسرا منظر نامہ ہے۔ ان مبلغوں کو اپنے دینی عقائد کی تبلیغ کے لئے ایک نیا بازار حاصل ہوگیا ہے حالانکہ مقامی لوگ ان کی تبلیغ کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں اور عراقی سماج کے کسی طبقہ میں بھی ان کے تبلیغی مال کی کھپت اور مقبولیت بالکل نہیں ہے۔[۴]

دنیا کے اکثر ناظرین و ماہرین نے ''صلیبی جنگ'' نامی عبارت کو خفیہ مقاصد کی طرف ایک اشارہ

۱- شمالی عراق..... Tanseer htm

۲- بش ڈاکٹرین اور عراقی حملات کے قانونی پہلو'' از محمد حسین مظفری'' اطلاعات سیاسی و اقتصادی شمارہ ۱۱۰-۱۸۹، ص ۳۱

3- Johan Witt, Head of law and Religious Program. Atlanta Emory Univ.

4- Jane Lampman, op. cit

سے تعبیر کیا ہے۔ بُش نے دوسرے موقع پر اس تاریخی تعبیر میں اصلاح کی کوشش تو کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے زیادہ تر سیاسی رہنما اس سلسلے میں مشابہ خیال کے حامل ہیں۔ افکار و عقائد کا تجزیہ کرنے والے ایک ادارہ کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ کے ۷۰ فیصد عیسائی رہنما اسلام کو درحقیقت ''دہشت گردی کا مذہب'' قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے ۸۱ فیصد لوگ مسلمانوں کو نصرانی بنانے کا خیال رکھتے ہیں اور یہ کام ان لوگوں نے Protestant عیسائیوں کی ایک بڑی تنظیم کے سپرد کر رکھا ہے۔[۱] مثال کے طور پر ایک کلیسا میں ایک بلند مرتبہ امریکی فوجی افسر کے بیان نے مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کر دیئے۔ بی بی سی نمائندہ واشنگٹن میں کہتا ہے کہ جنرل ویلیام بوئیکین، معاون وزیر دفاع (جمع آوری اطلاعات) نے اعلان کیا کہ اسلامی دہشت گرد امریکہ سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ امریکہ ایک عیسائی ملک ہے.....''۔ اس نے ایک دوسری نشست میں اپنے خدا کو اسلام کے خدا سے عظیم تر بتاتے ہوئے کہا تھا کہ ''اسلام کا خدا بُت ہے'' اس کے علاوہ بوئیکین کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ یہ عوام کی اکثریت کی حمایت نہیں بلکہ خدا کی مرضی تھی کہ جارج بُش امریکہ کے صدر ہوگئے''۔[۲]

سیکولرازم: مخصوص صادراتی مال: برسوں سے مغربی ماہرین سیاست غیر معمولی حرص و طمع کے ساتھ لوگوں کو یہ مشورہ دیتے چلے آرہے ہیں کہ تم اپنے ملک میں مغربی ممالک کی پیروی میں سیکولر سیاسی و حکومتی نظام قائم کرلو کیونکہ مذہبی امور میں حکومت کی بیطرفی اور غیر جانبداری کے ذریعہ دیگر ادیان و مذاہب کی پیروی کرنے والوں کے حقوق اور ان کی مذہبی آزادی کی بہتر حفاظت کی جاسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض اسلامی ملکوں میں ایسے مفکرین و دانشوروں کی بڑی تعداد موجود ہے جو اپنے ملک میں سیکولر حکومت کی تشکیل کے خواہاں ہے جب کہ سمندر کے اس پار اس فکر و دانش کے مرکز میں ایک گروہ سے وابستہ لوگ فوجی ساز و سامان اور اسلحوں کے ذریعہ اپنے مخصوص اور پسندیدہ دین کی تبلیغ و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں اور دوسری طرف وہائٹ ہاؤس سے وابستہ مذہبی امور کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل [۳] کو عراق میں غیر حکومتی تنظیموں کا سرپرست مقرر کیا جاتا ہے۔ پس وہ ماہرین سیاست جو کل تک جو سیکولرازم یعنی حکومت کی مذہبی غیر جانبداری پر مبنی نظام کو انسانی سماج کا اہم کارنامہ بنا کر پیش

۱- ''مجموعہ انجلیکانیہ امریکیہ لتنصیر العراقیین'' جن کو روزنامہ الوطن قطر کے انٹرنیٹ سے درج ذیل پتہ پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ http:/www.alwatan.com/data/20030426/printit.asp?news=translate

۲- بی بی سی ۲۱ اکتوبر ۲۰۰۳ء

۳- Faith based initiatives. نامی مذکورہ رجسٹر میں مندرج، سماجی مسائل و مشکلات کے حل کے بارے میں کی جانے والی سرگرمیوں میں مذہبی تنظیموں کی شرکت کے بارے میں ۲۰۰۱ء میں پاس شدہ قانون کی بنیاد پر (Community Solutions Act 2001)

کیا کرتے تھے آج وہ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی سب سے زیادہ مسلح فوج کو عیسائی تبلیغاتی مشن کا تابع اور فرمانبردار بنادیں۔ کیا یہ ممکن و مناسب ہے کہ سیکولرازم کی حمایت و ترویج کی دعویداری و علمبرداری کرتے ہوئے کسی آزاد ملک کے خلاف فوجی طاقت کے استعمال یا اس ملک کی سرزمین پر فوجی قبضہ کے بعد رعب و دبدبہ و دہشت گردی کے سایہ میں کسی مخصوص مذہب کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا جائے اور ایک منظم منصوبہ بند پروگرام کے تحت تبلیغی مشن کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے؟ ایسے عالم میں جب کہ اسلامی ممالک میں دانشوروں کی ایک جماعت سیکولر نظام حکومت کی حمایت میں فلک شگاف نعرے بلند کررہی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغربی مفکرین اور مصلحین اپنے تمدن کے اس عظیم کارنامہ پر نظر ثانی میں لگے ہوئے ہیں یا نہایت خوش فہمی کے ساتھ اس کی نئی تفسیر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۱ ستمبر کے دردناک حادثہ کے بعد امریکی صدر جمہوریہ کے ذریعہ ''دعا و عبادت کے قومی دن'' کا اعلان تھا۔[1] دوسری طرف گذشتہ دہائیوں کے دوران ''تحریک دہ فرمان'' نے یہ کوشش کی کہ دس فرمان کی تحریری کاپیاں چوراہوں، سرکاری عمارتوں اور درسگاہوں میں لگادی جائیں جب کہ امریکی عدالت عالیہ کے ۱۹۸۰ کے حکم کے مطابق ''دہ فرمان'' کو درسگاہوں میں لگانا اس ملک کے آئین کی اعلانیہ خلاف ورزی ہے۔ اس کے باوجود گذشتہ چند برسوں کے دوران اس تحریک نے قومی سطح پر غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے۔[2] شکاگو ٹریبیون (Chicago Tribune) کا بیان ہے کہ دہ فرمان فقط ایک مذہبی یا معنوی تحریک ہی نہیں بلکہ عیسائیت کو ملک کا سرکاری دین بنانے کی راہ میں اہم اقدام ہے۔ آج کل انجلی کلیسا کی پیروی کرنے والے اکثر سرکاری عہدیداروں کے پیغامات کی ترویج و اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ اس عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کا اہتمام ہے جو صرف Protestant فرقہ تک محدود ہے اور اس میں کیتھولک (Catholic) اور دیگر فرقوں کے عیسائی شامل نہیں ہیں۔[3] الاباما ایالت کے سپریم کورٹ کے قاضی روی مور نے دہ فرمان کے تحریری کتبہ کو عدالت گاہ کی ''مونت گومری'' نامی عمارت کے سامنے ۴ فٹ کی بلندی پر نصب کروایا ہے۔[4] اس سلسلے میں اس کا یہ قول ہے کہ یہ وہ قوم نہیں ہے جو بودائی یا ہندوئی اصول کی بنیاد پر وجود میں آئی ہو۔ اسلام بھی ہمارا دین نہیں ہے اور ہم قرآن کی پیروی نہیں کرتے ہیں بلکہ ہم لوگ انجیل کے پیرو ہیں اور یہ

1- "Some fear Bush's call to faith will blur church state lines". Bob-Kamper
2- Available at: http://www sulivan country.com/identitop fundies-declare. htm.
3- Lewis Loflim, op. cit 4- Ibid

قوم عیسائی قوم ہے''۔[1]

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہائٹ ہاؤس کو چاہیے کہ وہ صدر جمہوریہ امریکہ کے دوستوں کی ان سرگرمیوں کی باقاعدہ روک تھام کرے تاکہ لوگ یہ سوچنے پر مجبور نہ ہو جائیں کہ امریکہ نے عراقی عوام کو عیسائی بنانے کے لئے اس ملک پر فوجی حملہ کیا ہے۔ ڈاکٹر وایٹ کا خیال ہے کہ یہ پابندیاں قانونی اصولوں کی حاصل ہیں۔ درحقیقت قانون اس قسم کے مفروضات کی اعلانیہ تردید کرتا ہے اور فوجی قوانین نے اس سلسلے میں بہت سی پابندیاں بھی لگائی ہیں۔[2] جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر ڈاکٹر سید حسین نصر کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی حقوق کے عالمی منشور میں مذہبی حقوق و آزادی کو باقاعدہ جگہ دی گئی ہے لیکن مناسب تبلیغاتی وسائل اور طریقہ کار جیسے اہم مسائل کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔[3] مادود بری[4] ان اقدامات کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے عملی رنگ و روپ کے بارے میں کہتا ہے''۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عیسائیوں کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ لوگوں کو اپنے دین کی طرف دعوت دینی چاہیے لیکن اس سلسلے میں وقت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس وقت عیسائیوں اور امریکیوں کے سلسلے میں بی اعتمادی کا بازار گرام ہے لہذا اس ضمن میں جو بھی قدم اٹھایا جائے اس کے لئے عراقی عیسائیوں او رعربستان میں موجود عیسائی تنظیموں کے درمیان بھرپور تعاون لازمی ہے۔[5]

اس تحقیقی مقالہ کی ابتدا میں انسانی حقوق کے عالمی قوانین کے سایہ میں آزادیٔ دین اور اس کے مسائل کے مختلف پہلوؤں کا بھرپور مطالعہ پیش کیا جائے گا تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ آیا ڈاکٹر وایٹ کا یہ خیال درست ہے کہ عیسائی تبلیغی جماعتوں کو اس سلسلے میں مطلق حق حاصل نہیں ہے یا ڈاکٹر نصر کا یہ خیال صداقت پر مبنی ہے کہ عیسائی تبلیغی جماعتیں مذہبی حقوق و آزادی کے سلسلے میں خلاف قانون سرگرمیوں میں لگی ہوئی ہیں اور آخر میں یہ دیکھنا بھی لازمی ہوگا کہ مختلف عالمی اسناد و مدارک اور اصول و قوانین کے سایہ میں ان سرگرمیوں کو کیسے جاری رکھا جاسکتا ہے؟ اس مقالہ کے آخر میں عراقی عوام کو ان کے مقبوضہ وطن میں فراہم مذہبی حقوق و آزادی کا مکمل تجزیہ پیش کیا جائے گا مقالہ

1- J. Dudley Woodberry. Prof. of Islam at fuller theological Seminary in Pasadena Calif.
2- Lewis Loflim, op. cit 3- Ibid
4- J. Dudley Woodberry. Professor of Islam at fuller theological Seminary in Pasadena Calif.
5- Lewis Loftin, op. cit

کے آخری حصے میں اس مسئلہ کی وضاحت کی جائے گی کہ عراقی عوام کو مذہبی اعمال انجام دینے اور انہیں مذہبی حقوق سے مالا مال رکھنے کے لئے حملہ آور اور قابض افواج کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور مقبوضہ سرزمین میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے کن اصول وقوانین کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔

آزادیٔ دین اور عیسائی مذہبی تبلیغات: تاریخی اعتبار سے ان ادیان مذاہب کو قدرے حمایت و سرپرستی حاصل رہا کرتی تھی جو نظام حکومت کے لئے خطرہ نہیں پیدا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر قدیم روم میں حکومتی اصول وقوانین کی خلاف ورزی نہ کرنے والے مذہبی اعمال انجام دینے کی سہولت و آزادی حاصل تھی[1] قرون وسطی میں عیسائیت کو یوروپ پر حکومت کرنے والا مذہب تسلیم کیا جاتا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی میں تحریک اصلاح دین کا سلسلہ شروع ہوتے ہی ایک سرکاری دین کی حیثیت سے کیتھولک مذہب کے اقتدار میں زوال سا پیدا ہوگیا۔ جیسے جیسے کیتھولک کلیسا کی طاقت میں کمی واقع ہورہی تھی، ویسے ویسے دیگر تمام مذہبی جماعتوں اور فرقوں کے درمیان مذہبی عداوت اور اختلافات کو دور کرنے کا خیال شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ حکومتیں اپنے ہم جماعت لوگوں کی حفاظت و حمایت کے لئے پڑوسی ملکوں میں مداخلت بھی کرڈالتی تھیں۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ صلح و سلامتی کی حفاظت اور ضمانت درحقیقت ایک سیاسی ضرورت میں تبدیل ہوگئی۔[2]

موجودہ بین الاقوامی قوانین میں آزادی دین: تاریخی اعتبار سے مذہبی جماعتوں کی حمایت کا معاملہ اقلیتی جماعتوں کی حفاظت وحمایت سے وابستہ رہا ہے۔ اقلیتی جماعتوں کی حمایت وحفاظت کا پہلا دستورالعمل انیسویں صدی میں ''معاہدہ برلن ۱۸۷۸'' تشکیل ہوا۔ اس معاہدہ کے بموجب بالکن علاقہ کی حکومتوں پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی کہ وہ اپنے عوام کی جان و مال اور عزت آبرو کا بھرپور احترام کریں۔ اس معاہدہ کے پچاس سال بعد پہلی عالمی جنگ اور یورپ کے سیاسی نقشہ کی دوبارہ تشکیل کے ساتھ ہی ساتھ دنیا کے اکثر لوگوں کو اپنے مذہبی تعلقات و رجحانات کی وجہ سے مجبوراً جدید بین الاقوامی سرحدوں کے درمیان ادھر ادھر ہونا پڑا۔[3] دوسری عالمی جنگ کے اختتام اور نازی

1- Jay A. Sigler "Minority Rights" A comparative Analysis, 1983, p 41. 2- ibid, p 56.

۳- بعنوان مثال معاہدہ ۳۰ جنوری ۱۹۲۳ء کی دفعہ ۱ میں لکھا ہوا ہے کہ آرتھوڈیکس عیسائیوں کو ترکی سے یونان منتقل ہوجانا چاہیے اور جو مسلمان یونان کی نئی سرحدوں کے درمیان سکونت پذیر ہیں وہ ترکی جاسکتے ہیں۔

حکومت کے ذریعہ یہودیوں کی بے مثال مذہبی تعقیب کو مستند حیثیت حاصل ہو چکی تھی اور نازی حکومت نے مذہبی تعلقات کو ایک اہم سیاسی مقصد میں تبدیل کر دیا تھا۔ بین الاقوامی برادری کا ردعمل جنگ کے دو ہولناک مظالم اور دو مختلف سمتوں میں جلوہ نما ہوا۔

عالمی انسانی حقوق کا اعلان: اقوام متحدہ میں شعبہ اقلیت کے سربراہ نے انسانی حقوق کے منشور کے اجراء کو اقلیتوں کے مسائل کے حل کے لئے ایک ممکن تجویز قرار دیا۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے مذہبی اقلیتوں کے حالات کے بارے میں کہا کہ ان لوگوں کے حالات کا صحیح اندازہ اسی وقت ممکن ہوگا جب عالمی برادری کی ضمانت و حمایت کے ساتھ انسانی حقوق کے ایک منشور کو سبھی لوگوں کی حمایت و منظوری حاصل ہو جائے۔[1] دوسری عالمی جنگ کے دوران رونما ہونے والے انسان سوزی اور بے رحمانہ قتل عام کے جو حوادث رونما ہوئے تھے ان کی روشنی میں انسانی حقوق کے عالمی معیاروں کی غیر معمولی ضرورت کو پوری طرح واضح کر دیا تھا چنانچہ اقوام عالم کے درمیان مشترکہ معیاروں پر مشتمل انسانی حقوق کے عالمی منشور کو ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کے عام اجلاس میں پیش کیا گیا اور اس عالمی ادارہ نے اس منشور کو مکمل اکثریت کے ساتھ پاس کر دیا اور کسی ممبر ملک کی جانب سے اس کی مخالفت نہیں ہوئی۔[2]

واضح رہے کہ انسانی حقوق کے اس عالمی منشور کو اقوام متحدہ کی قرارداد کی حیثیت سے مکمل منظوری حاصل ہو چکی ہے کیونکہ اس معاہدے میں جن باتوں پر ہم لوگوں کا اتفاق ہے وہ اخلاقی ارزش و اقدار کی حامل نہیں قانونی اعتبار سے ان باتوں کو لازمی قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ دوسری عبارت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو حضرات صف میں کھڑے ہوئے ہیں انشاء اللہ فرصت ملتے ہی ان کے مسائل کی طرف توجہ دی جائے گی۔

اس قرارداد کو قانونی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ اس کے باوجود اس کو ایک مستحکم اخلاقی معاہدہ شمار کیا جاتا ہے اور عالمی برادری سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس معاہدہ کی مکمل پیروی کرے گی۔ درحقیقت وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ آج ان معاہدوں کو مکمل قانونی آثار و دستاویز کی حیثیت

1- League of Nations and National Minorities R.D. Azacarate an experiment-1945, p. 6
2- Proclamation preceeding the text of the Declaration. G.A. rexuturs No. 217-A

حاصل ہو چکی ہے اور ان معاہدوں سے وابستہ بعض قواعد کو عالمی حقوق کے خصوصی قواعد میں تبدیل کیا جا چکا ہے۔[1] بعض ماہرین قانون کی نظر میں، اس اعلانیہ میں مذکورہ و مندرج اکثر حقوق اور آزادیوں کو اب قانون کے اصول کلی کا درجہ حاصل ہے اور ان میں سے بعض کو بین الاقوامی قوانین کے عرفی قواعد کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔[2]

عالمی انسانی حقوق قرارداد کی ۱۸ویں دفعہ کے پہلے بند میں اس موضوع کی مکمل وضاحت موجود ہے کہ مذہبی آزادی کے ساتھ مذہب کی تبدیلی کا حق بھی لازمی ہے۔ ہر فرد کو فکر و وجدان و دین کی آزادی کا حق حاصل ہے جس میں دین وعقیدہ کے انتخاب کے ساتھ اس میں تبدیلی کا حق بھی حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ دین کی تبدیلی کی آزادی کی تجویز لبنان کے ایک عیسائی نمائندہ کے اصرار کی وجہ سے معاہدہ میں درج کی گئی اسلامی ممالک کے نمائندوں نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی۔ عربستان کے نمائندہ کے اصرار کی وجہ سے معاہدہ میں درج کی گئی اسلامی ممالک کے نمائندوں نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی۔ عربستان کے نمائندہ نے اپنی مخالفت کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ کوئی مسلمان اپنا مذہب تبدیل کرے لیکن پاکستان کے نمائندہ نے، جو قادیانی مذہب کا پیرو تھا، لبنانی نمائندہ کی تجویز کی حمایت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ تجویز شدہ عبارت اسلام کی روح سے مطابقت رکھتی ہے۔ چنانچہ ووٹنگ کے وقت عربستان کے علاوہ اجلاس میں موجودہ کسی دوسرے اسلامی ممالک نے اس تجویز کی مخالفت نہ کی لہذا اس بات کی نفی و تردید ناممکن ہے کہ عالمی انسانی حقوق معاہدہ کے منشور میں تبدیلی دین کی آزادی کا حق درج ہے اور آزادیٔ دین کے حق کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ تبدیلیٔ دین کی آزادی کا حق بھی تصویب شدہ ہے۔

منشور میں اس عبارت کے اندراج کی مخالفت کرنے والے اسلامی ملکوں کا اس سلسلے میں یہ استدلال تھا کہ منشور میں اس دفعہ کو محض عیسائی تبلیغی جماعت کے مفاد کو نگاہ میں رکھتے ہوئے شامل کیا

1- Proclamation preceeding the text of the Declaration. G.A. Res. 217 A (III) U.N. Doc. A/810 at 71, 1948

2- Reservation to the Convention on the Prevention and Punishment of the Crime of Genocide, Advisory Opinion, 28 May 1951. International Court of Justice. عالمی عدالتی ادارہ کے قاضی نے حکومتوں کو ان معاہدوں کا پابند قرار دیا ہے۔ بین الاقوامی عدالت گاہ کے قاضی نے قتل عام کنونشن پر اعلامیہ حق شرط کے بارے میں اپنے مشاورانہ و مخالف و ذاتی نظریہ کو بیان کرتے ہوئے یہ دعوی کیا ہے کہ مندرجہ اصول کنونشن میں پاس ہو چکا ہے اور متمدن اقوام کے ساتھ کسی معاہدہ و قرارداد کے بغیر بھی حکومتوں کے ذریعہ اس کی پیروی کو لازمی قرار دیا جا سکتا ہے۔

گیا ہے تاکہ لوگوں کی احتیاج اور پریشانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں تبدیلی دین و مذہب کی طرف راغب کرسکیں۔[۱] اس منشور کی تدوین و تالیف میں سرگرم لوگوں نے یہ امید لگارکھی تھی کہ ان حقوق اور آزادیوں کو آئندہ ہونے والی کسی مفصل قرارداد میں شامل کرتے ہوئے اس پرعمل کو لازمی قرار دے دیں گے چنانچہ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۶ء کو دومختلف معاہدوں میں اس اصول کو شامل کرتے ہوئے اس پرعمل کو لازمی قرار دے دیا گیا۔

عالمی سیاسی اور تہذیبی حقوق کا معاہدہ

اس معاہدہ کے مقدمہ میں اقوام متحدہ کے مذکورہ بالا منشور کے بنیادی اصول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بنیادی انسانی حقوق اور آزادیوں کی تائید وحمایت کی گئی ہے اور اس معاہدہ میں زیادہ تر انہیں حقوق و آزادیوں کا ذکر ہے جن پر عالمی انسانی حقوق کی پیروی کی تائید کی گئی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عالمی انسانی حقوق منشور کی دفعہ ۱۸ کی عبارت کو اس معاہدہ میں نقل کردیا گیا ہے۔

۱- ہر فرد کو فکر و وجدان اور دین و مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہوگا۔ اس حق کے ذیل میں اس شخص کو اپنے پسندیدہ مذہب کے اختیار و پیروی کی آزادی بھی حاصل رہے گی۔

۲- کسی شخص کو کسی مذہب کے قبول کرنے یا کسی مذہب کی پیروی کرنے کے لئے مجبور نہ کیا جائے گا اور نہ ہی اس کے مذہبی عقیدہ پر کسی کو حملہ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ مذہب کی پیروی میں زور زبردستی یا کسی دباؤ کی ممنوعیت کو درحقیقت دین وعقیدہ کی مکمل آزادی شمار کیا جاتا ہے۔ پس دین میں جبر کی ممنوعیت کا مطلب ہے کہ کسی شخص کو اس بات کے لئے مجبور نہ کیا جائے کہ وہ اپنے باطنی اور پسندیدہ مذہبی عقائد سے روگردانی کرتے ہوئے کسی دوسرے مذہب سے اپنی پسندیدگی اور لگاؤ کا اظہار کرے۔ درحقیقت انسانی حقوق کے بارے میں اسلامی ممالک کی بدگمانی کے نتیجے میں اس معاہدہ کی تدوین میں لفظ ''تبدیلیٔ دین'' کی اصلاح ہوجائے۔ چونکہ اس معاہدہ کو بین الاقوامی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا تھا لہذا اس کی عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لئے تمام حکومتوں کی جانب سے اس کی حمایت بھی لازمی تھی اسی وجہ سے اسلامی ممالک کو اس کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے عالمی انسانی حقوق معاہدہ کی قرارداد کی دفعہ ۱۸ میں دوسرے بند کو شامل کردیا گیا۔

۳- **مذہبی عدم تحمل کا اعلانیہ:** مذہبی عدم تحمل و عدم مساوات کے اعلانیہ کے مقدمہ میں کہا گیا ہے کہ

۱- محمد حسین مظفری، نا بردباری مذہبی، تہران ۱۹۹۷، ص ۷۴، ۷۵

اس میں کوئی شک نہیں کہ دین و مذہب پر عقیدہ و ایمان رکھنے والے شخص کے لئے مذہب زندگی کے حقیقی معنی و مفہوم کی شناخت کا بنیادی سبب ہوتا ہے لہذا مذہب وعقیدہ کی آزادی کی مکمل ضمانت ہونی چاہیے۔حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مذہبی عدم تحمل کے منشور کو غیر معمولی توجہ کے ساتھ آمادہ کرتے ہوئے یہ کوشش کی گئی ہے کہ عالمی انسانی حقوق کے منشور میں حق تبدیلی مذہب کو فراموشی کے سپرد کردیا جائے۔ہوناتو یہ چاہیے تھا کہ مذہبی حقوق و آزادیوں سے متعلق تمام باتوں کی مکمل وضاحت کردی جاتی۔ بہرحال موجودہ معاہدہ کے متن میں قدرے تخفیف کے ساتھ یہ کہا گیا کہ ہر شخص فکر و وجدان اور دین و مذہب کی آزادی کا حامل ہے اور اس حق کے ذیل میں انسان اپنے پسندیدہ دین و عقیدہ کی پیروی کے لئے آزاد ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان عالمی اسناد و مدارک میں مندرج مفاہیم کے درمیان ہم آہنگی کیسے قائم کی جائے؟ انسانی حقوق کمیشن سے وابستہ تحقیقی امور کی صدر ایلیزابتھ اوڈیو بینیٹو نے اس سوال کے جواب میں یہ کہا کہ منشور کے بغور مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان دستاویزوں کی عبارتوں کے درمیان اختلاف تو پایا جاتا ہے لیکن ان کا مفہوم ایک ہے کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دین و مذہب وعقیدہ کو ترک کرکے دوسرے دین وعقیدہ کا انتخاب کرلے یا لامذہب اور بے عقیدہ رہتے ہوئے زندگی بسر کرے۔منشور کے اعتبار سے ضمنی طور پر یہ مفہوم آزادی فکر و وجدان اور دین و مذہب کے مفہوم سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے بشرطیکہ عبارت کے اندازِ بیان کی طرف زیادہ توجہ نہ دی جائے۔[1] اگرچہ اعلان یہ کیا گیا ہے کہ مختلف دستاویزات کی عبارتوں میں موجود اختلافات کی وجہ سے انسانی حقوق کی ماہیت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اسناد کے تطبیقی مطالعے کی روشنی میں مفہوم کے درمیان موجود تردید و اختلاف کی نشاندہی ہوجاتی ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ عبارتیں مختلف مفاہیم کی حامل ہیں اور عبارتوں کے درمیان موجود اختلاف کی وجہ سے مختلف قسم کی تفسیروں کے بیان کی راہ ہموار ہوجاتی ہے۔[2]

بہرحال عیسائی تبلیغی جماعتوں کے ذریعہ اس قانون کے ممکنہ ناجائز استعمال کو روکنے کی غرض سے ''دینی عدم تحمل'' کی ایسی اصلاح کردی گئی کہ لوگوں کی احتیاج اور پریشانی کو ان کے دین کی تبدیلی کا

1- Elizabeth Odio Benito, "Study on the Current Dimension of the Problems of Intolerance and Discrimination on grounds of Religion of Belief". UN Poc. E/CN.4 su6/2/1987/26/31 Aug. 1986, p. 50.

۲- محمد حسین مظفری، ایضاً

ذریعہ نہ بنایا جاسکے اور لوگ اپنی مجبوری و مفلوک الحالی کے دباؤ میں اپنا دین تبدیل کرنے پر مجبور ہوجائیں۔ اصلاح شدہ عبارت سے مذہب وعقیدہ کی آزادی کا مفہوم بالکل واضح ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ تبدیلی مذہب کے لئے لوگوں پر دباؤ ڈالنے یا ان کی پریشانیوں کے ناجائز استعمال کا امکان بھی نہیں رہ جاتا۔[1]

کرشنا سوامی نے اپنی تحقیق میں شدت پسند افراد و جماعتوں کے خلاف قانونی اقدام کی تجویز پیش کی ہے انہوں نے اپنے مجوزہ قاعدہ شمارہ ا میں تبدیلی مذہب کے لئے ''اجبار''، ''نامناسب ترغیب'' اور ''بے جا دباؤ'' کو پوری طرح ممنوع قرار دیا ہے۔ اسی طرح قاعدہ شمارہ ۳ میں جس میں عدم مساوات کی روک تھام اور اقلیتی جماعت کے لوگوں کی حمایت کی بات کہی گئی ہے، مادی اور نفسیاتی دباؤ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔[2] دوسرے لفظوں میں اس ممنوعیت کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب لوگوں کو مال و متاع اور مادی فائدہ دے کر یا دینے کا وعدہ کرتے ہوئے انہیں اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب کو قبول کرنے کے لئے راغب کیا جائے۔[3] بہرحال یہ بات تسلیم کرلینی چاہیے کہ تبلیغ دین کے جائز اور ناجائز طریقوں کے درمیان کوئی نمایاں سرحد قائم کرنا بہت دشوار ہے لہذا دنیا کے مختلف ممالک اپنے سماجی اور ثقافتی حالات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مناسب اقدام کرتے ہیں

۴- **انسانی حقوق کا اسلامی منشور:** بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلامی انسانی حقوق منشور کی دفعہ ۱۰ میں عالمی انسانی حقوق اسناد میں مندرج معیاروں کی خلاف ورزی کی گئی ہے[4] لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ان اسناد کے ابتدائی امور کے مطالعے سے ہی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مذکورہ عبارت ان اسناد کی حقیقی روح اور ان کے مولفین کے مقصد و ارادہ سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔ درحقیقت اسلام دین فطرت ہے اور یہ انسان کے خلاف جبر و اکراہ اور دباؤ و زبردستی کے استعمال اور انسان کی مفلسی و جہالت کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے اسے تبدیلی دین کے لئے یا ملحد بنانے کے لئے کی جانے والی ہر حرکت کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ سردست حق آزادی دین کے ذیل میں ایسی باتوں کو شامل

۱- محمد حسین مظفری: ایضاً

2- Arcot Krishnaswamy, Study of Discrimination on the Matter of Religious Rights and Practices, 1960, pp.40-41

3- See Generally, Religious Human Rights in Global Perspective: Legal Perspectives 349 and 360 (Johan D van dar vyer Johan witt, Jrs eds) 1996

4- See J. Schwartlander H. Beilfaldt. "Christians and Muslims Facing the Challenges of Human Right" German Bishop Conference, Jan. 1994 i pp. 23-24

کرلیا گیا ہے جس کے ذریعہ بعض افراد و جماعتیں لوگوں کو مالی، معالجاتی، تربیتی اور تعلیمی سہولتیں فراہم کرکے ان کے دین و مذہب کی تبدیلی میں ہمہ تن سرگرم نظر آتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے منصوبہ بند ہمدردانہ ہتھکنڈوں کے ذریعہ انہیں اپنا مذہب بدلنے پر آمادہ کرلیتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی حقوق کی تدوین و پیروی کی اصول وقوانین پر مشتمل جو سند تیار کی جاتی ہے اس میں ادیان و مذاہب کے ان ٹھوس وعدوں کو مناسب انداز کے ساتھ پسندیدہ مقام پر پیش نہیں کیا گیا ہے جن میں انسانوں کی اخروی نجات کی ضمانت فراہم کی گئی ہے بلکہ اسلامی انسانی حقوق کی دفعہ ۱۰ میں ان امور کا ترک کچھ اس طرح کیا گیا ہے جس سے دوسرے لوگوں کو غلط فہمی اور توہم کے علاوہ کچھ نہیں حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی انسانی حقوق کی عبارت کلیسائی بیانات سے بہت نزدیک معلوم ہوتی ہے۔ اس عبارت سے مخاطب یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ مادی اور نفسیاتی اکراہ اور دباؤ ایسی صورت میں مجاز نہیں ہے کہ اس کا استعمال مسلمانوں کے خلاف کیا جائے"[۱] لیکن دوسری طرف اسلام کی تبلیغ وترویج کے لئے اگر طاقت اور جبر کا استعمال کیا جائے تو جائز ہے۔ جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ اسلام نے نہایت واضح لفظوں میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ مذہبی جبر واکراہ و دباؤ کی ہر شکل کو مذموم قرار دیتا ہے اور زور و زبردستی کو اپنی تبلیغی سیاست میں نہ صرف کوئی جگہ فراہم کرتا ہے بلکہ اس کی بھرپور مذمت بھی کرتا ہے۔ بہتر تو یہی تھا کہ جبر واکراہ کی ممنوعیت والی آیۂ کریمہ سے استناد کرتے ہوئے یہ اعلان کردیا جاتا کہ اسلام دین و مذہب کی تبلیغ و ترویج کے لئے زور و زبردستی کے استعمال کو ممنوع قرار دیتا ہے چاہے دین حق کی اشاعت کے لئے ہی اس ظالمانہ روش کا استعمال کیوں نہ کیا گیا ہو۔

آزادی تبلیغ دین اور عیسائیوں کی تبلیغی سرگرمیاں: مجموعی اعتبار سے مذہبی تبلیغ کے مسائل ایک طرف آزادی بیان اور دین کے اظہار میں انسان کے انفرادی حق سے اور دوسری طرف انسان کے دین یا اس کے عقیدہ کی حفاظت کے لئے اس کے انفرادی حق سے مربوط ومبسوط ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر شخص اپنے پسندیدہ دین وعقیدہ کی حفاظت دوسروں کے اثر ورسوخ اور مداخلت کے بغیر انجام دے سکتا ہے چاہے یہ مداخلت حکومت کی طرف سے ہو یا افراد و جماعتوں سے جڑے ہوئے لوگوں کے ذریعہ کی جارہی ہو۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ ہر شخص

۱۔ محمد علی تسخیری، حقوق الانسان بین الاعلان الاسلامی والعالمی، طہران ۱۹۹۷، ص ۸۰

کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی نجات کی نوعیت کے بارے میں خود فیصلہ کرے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس اہم کام کے لئے سماجی اثرات سے الگ تھلگ رہتے ہوئے تنہائی کے عالم میں اس کام کو انجام دے۔ جیسا کہ دین وعقیدہ کے اظہار کی آزادی کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہر شخص اپنی دینی تعلیمات اور مذہبی اغراض و مقاصد کی ترویج و تبلیغ کے لئے پوری طرح آزاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ادیان و مذاہب اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس طرح کی تبلیغی ذمہ داری انجام دیں۔ اگرچہ دین کی تبدیلی کے حق کو انسانی حقوق کے یوروپی کنونشن کے دوران کسی اختلاف و مخالفت کے بغیر پاس کیا جاچکا ہے پھر بھی انسانی حقوق سے وابستہ یوروپی عدالت اور کنونشن نے اس حق کو نہایت مضیق مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اس کے باوجود بعض ادیان و مذاہب نئے پیروی کرنے والوں کی جستجو نہیں کرتے ہیں لیکن اکثر مذاہب اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ لازمی طور پر اپنے دین کے پیغام کو دوسرے لوگوں تک پہنچائیں چنانچہ وہ لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اپنے دین میں شامل کرلیں اور ان کے ہم مسلک لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے پس تبلیغ دین کے مسئلہ کا دو پہلوؤں سے مطالعہ کرنا لازمی ہے۔ پہلے مرحلہ میں ادیان و مذاہب کے اعتبار سے دینی تبلیغ، دین وعقیدہ کے اظہار کی آزادی کے اہم پہلوؤں میں سے ایک ہے اور ساتھ ہی اطلاعات کی آزادی کی مصداق بھی ہے۔ اسی وجہ سے انسانی حقوق کے منشور اور مذہبی عدم تحمل نامی قرارداد میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ دوسری طرف آزادی بیان اور اطلاعات کی آزادی سے وابستہ اصول و قوانین پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ لوگوں کی ایک مذہب سے علحدگی اور دوسرے مذہب کی طرف ترغیب میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ ایسے لوگوں کی راہ میں رکاوٹ بن جائے جو اپنے پسندیدہ دین کی پیروی اور حفاظت کے خواہاں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ دیگر ادیان و مذاہب کی پیروی کرنے والے مذہبی افراد یا جماعتوں کی طرف سے مخالفانہ کارروائی کا سلسلہ شروع ہوجائے اور مذہبی تبلیغات مختلف مذہبی جماعتوں کی پرامن وصلح آمیز باہمی زندگی پر بھی اثرانداز ہوجائیں اور تبلیغی پیغامات کی نوعیت اور تبلیغی راہ و روش کی ناپسندیدگی کی وجہ سے مختلف مذہبی جماعتوں کے درمیان جھگڑے اور ٹکراؤ کا ماحول پیدا ہوجائے۔[1]

1- See Natan Lerner, "Proselytism, Change of Religion and International Human Rights, Emory International Review, No. 12, 1998. p. 477, Martin shupack

۱- **عدالتی قوانین و روش میں دینی تبلیغ:** انسانی حقوق کمیشن کے خصوصی افسران کی رپورٹ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بعض ممالک نے عیسائی تبلیغی سرگرمیوں کے لئے اقدامات کی تجویز پیش کی ہے جب کہ بعض دوسرے ملکوں نے سزا کی بات فقط ان امور میں کہی ہے جن میں عیسائی تبلیغی جماعت سے وابستہ افراد لوگوں کے سامنے مادی مفاد کی تجویز پیش کریں۔ کچھ ممالک کے داخلی قوانین میں بیرونی ممالک کی ایسی تبلیغی سرگرمیوں کی ممنوعیت کا ذکر بھی موجود ہے جو لالچ اور مادی وسائل و امکانات کی فراہمی کے ذریعہ مقامی لوگوں کو مذہب کی تبدیلی کے لئے آمادہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ بعنوان مثال ۱۹۴۴ء میں ہایلہ ثلاثی نے ایک فرمان جاری کرتے ہوئے عیسائی تبلیغی جماعت کی ان سرگرمیوں کو غیر قانونی اومنوع قرار دے دیا جس کے ذریعہ وہ آرتھوڈیکس عیسائیوں کے مذہب کی تبدیلی کے خواہاں تھے جب کہ ان جماعتوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے ذریعہ تمام لوگوں کو متاثر کریں۔[1] اسی طرح یونان کے داخلی قانون میں بھی عیسائی تبلیغی جماعت کے بارے میں خصوصی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے: ''مختلف مذہبی عقائد میں دخالت کے لئے اٹھایا گیا براہ راست یا بالواسطہ اقدام یامادی و اقتصادی امداد کے ذریعہ یا مکر وفریب سے کام لیتے ہوئے کسی شخص کے کم اعتماد و تجربہ اور محدود عقل و دانش اور سادگی کا نا مناسب استعمال عیسائی تبلیغی سرگرمیوں کا اٹوٹ حصہ ہیں''۔[2]

عدالتی روش میں بھی اس قسم کی مثالیں موجود ہیں مثلاً یوروپی انسانی حقوق عدالت نے کوکیناکیس بنام یونان نامی مقدمہ میں اس بات کی تائید کی ہے کہ مذکورہ شخص نے اپنی سرگرمیوں میں ایسا طریقۂ کار اختیار کیا ہے جس سے مرد مخاطب کے ذاتی مذہب وعقیدہ اور آزادیٔ دین کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔[3] اس سے قبل کوکیناکیس یونان کی داخلی عدالت گاہوں میں اس بات کا مجرم قرار پاچکا تھا کہ اس نے متعلقہ قوانین کی طرف سے لاپرواہی اور بے توجہی سے کام لیا ہے۔ عدالت کی نظر میں اس کا جرم یہ تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ خانم کاریاکی کے گھر گیا اور یہ بہانہ بناتے ہوئے کہ اس کے لئے خوش خبری لایا ہے، اس کے سامنے اپنے مذہب کی فضیلتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں اپنے دین کی طرف راغب کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی دوران کاریاکاکی کا شوہر آ گیا۔ وہ ایک

1- Ethiopia: A Country Study> Foreign Mission, Library Congress. Web. http:/www/toe.gou/rr/fri/httml 2- Law 1972/1939

3-Kokkinakis vs Greece, 260 Euro. Ct. H.R. (Ser. A) At 13, 1993

آرتھوڈیکس چرچ میں شماس کے عہدہ پر تعینات تھا۔ جیسے ہی اس کو حقیقت کا علم ہوا اس نے فوراً پولیس کو خبر دے دی اور کوکینا کیس اور ان کی بیوی دونوں کو پولیس نے فوراً گرفتار کرلیا۔ خانم کوکینا کیس کی بہت سی باتیں کاریاکا کی کو یاد نہیں رہ گئی تھیں پھر بھی اس نے بتایا کہ کوکینا کیس کی باتیں اسے اپنے مذہبی عقائد سے منحرف نہیں کرسکیں۔ اسی طرح چاہے ابتدائی مرحلہ ہو یا تجدید نظر کا مرحلہ اس کی سادگی یا اس کے مذہبی جذبات کے مجروح ہونے کی بات نہیں آئی البتہ کوکینا کیس کو یونان کی تمام عدالتوں نے مجرم قرار دیا لہذا اس نے یوروپی انسانی حقوق عدالت میں اپنی شکایت پیش کی۔

یہ معاملہ مختلف پہلوؤں سے توجہ و تجزیہ کے لائق ہے خصوصی اعتبار سے دین کے اظہار کے سلسلے میں عدالت کا یہ خیال تھا کہ لوگوں کو اس بات کا حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے لوگوں سے دین حق کے بارے میں بحث و مباحثہ کرتے ہوئے انہیں متقاعد کرنے کی کوشش کریں اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو کنونشن کی دفعہ ۹ کی عبارت جس میں تبدیلی دین کی بات کہی گئی ہے، بالکل بے معنی ہوجائے گی۔[1] عدالت نے اپنے اس استدلال میں حق اظہار دین کو آزادی بیان قرار دیا ہے کیونکہ مطبوعات یعنی پریس پر لگائی جانے والی پابندی صرف ان افراد کے حق میں مداخلت نہیں ہوتی ہے جو عملی طور پر اطلاعات کی جستجو میں رہا کرتے ہیں بلکہ اس پابندی سے ان لوگوں کی حق تلفی بھی ہوتی ہے جو اگر اطلاع حاصل کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں۔[2] اس قیاس کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ تبدیلی دین کے بارے میں لازمی اطلاعات سماج کے سامنے ہمیشہ موجود رہنی چاہیے تاکہ اگر کوئی شخص اس کی طرف مائل ہونا چاہے تو فوری طور پر مطلوبہ اطلاع اسے فراہم ہوجائے۔

اسی طرح بعض مصنفین اس خیال کے حامل ہیں کہ مذہبی تبلیغات پر صرف اس وجہ سے کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی کہ اس کی وجہ سے ممکن ہے کہ لوگوں کے جذبات مجروح ہوجائیں بلکہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ لوگوں کو مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیے اور انہیں دین حق کے بارے میں اپنے افکار و عقائد کی تبلیغ و ترویج کی آزادی حاصل ہونی چاہیے کچھ لوگوں کی ناپسندیدگی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مذہبی مبلغین کی تبلیغی سرگرمیوں کو ہرگز نہ روکنا چاہیے اور نہ ان سے خاموشی اختیار کرنے کا مطالبہ کرنا چاہیے۔[3] اس کے باوجود عدالت یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ عیسائی تبلیغی جماعت کی

1- Kokkinakis vs Greece, 260-Eur Ct. H.R. (Ser A) at 13, 1993

2- Sunday Times vs United Kingdom, Eur Ct. H.R. (Ser A) at 40, (1979)

3- The Right to Religious Liberty 70-71 (Barry Lynn et al eds 1995)

سرگرمیوں پر پابندی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ یونانی ماہرین قانون کے مطابق دوسرے تمام لوگوں کے حقوق کا دفاع کیا جاسکے جسٹس مارمینز نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا بلکہ ان کا خیال ہے کہ آزادی دین کا حقیقی اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ حکومت کو اس بات کا قطعی کوئی حق حاصل نہ ہونا چاہیے کہ وہ دین کی حفاظت یا اس کی تبدیلی کے سلسلے میں کوئی مداخلت کرسکے۔[1] اس اصول وفکر کے بموجب اس موضوع کا حکومت سے کوئی ربط ہی باقی نہیں رہ جاتا کہ کوئی شخص اپنے ضمیر و وجدان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنا مذہب تبدیل کرنا چاہتا ہے یا اس نے لوگوں کے بہکاوے میں آکر دین تبدیل کرنے کا فیصلہ لیا ہے۔ جب دنیا کے زیادہ تر ادیان و مذاہب اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی دین حق کی دعوت دیں تو حکومت کو اس سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرنی چاہیے اور حق اظہار دین میں کوئی مداخلت نہ کرنی چاہیے۔[2] کیونکہ انسان کی عظمت و آزادی کے احترام کا یہ تقاضہ ہے کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ ہر شخص میں اتنی صلاحیت بہرحال ہوتی ہے کہ وہ اپنی قسمت کے سلسلے میں جو فیصلہ کرنا چاہے کرسکتا ہے لیکن جسٹس موصوف یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بعض معاملات میں یہ آزادی اپنے دین کی حفاظت کے سلسلے میں دوسروں کے حق سے میل نہیں کھاتی ہے لیکن دوسرے قاضی حضرات نے اس خیال کی تائید نہیں کی۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دین کی تبدیلی کا حق اس سلسلے میں قطعی مانع نہ ہوگا کہ حکومت ایسے اقدامات کرے کہ لوگ ان افراد یا جماعتوں کی حمایت کریں جو منظم طریقے سے لوگوں کے دین کی تبدیلی کے خواہاں ہیں۔[3] اس معاملے میں کوکیناکیس درحقیقت اس سادہ لوح خاتون کے لئے بشارت وخوش خبری کے بہانے اپنے تجربہ و اعتمادنفس کو استعمال کرتے ہوئے اسے یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ آرتھوڈیکس مذہب سے علحدگی اختیار کرلے اور کوکیناکیس جس مذہب کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے اس میں شامل ہوجائے۔ تبلیغ دین کے اس طریقے کو کسی اعتبار سے منطقی اور معقول تبلیغی مباحثہ ہرگز نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔

سرحد پار سے مذہبی تبلیغات: بعض ملکوں میں مذہبی تبلیغات کے سلسلے میں سماج اور حکومت کا طریقۂ کار نہایت واضح اور فیصلہ کن ہے کیونکہ جب کبھی کسی ملک میں سرحد پار سے کسی دین یا دینی عقیدہ کی تبلیغ وترویج کی کوشش کی جاتی ہے اور چونکہ یہ دینی تبلیغات بیرونی مبلغین کے ذریعہ انجام پاتی ہیں اسی وجہ سے اس ملک اور عوام کو ایک نئی تہذیب کا تجربہ حاصل ہوتا ہے جو اس ملک میں رائج

1- Kokkinakis vs Greece op.ct at 33 2- ibid-34 3- Arcot Krishnaswami. op.cit

تہذیبی اور ثقافتی روایات سے بالکل مختلف ہوا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ اس ملک کے قومی اتحاد کو خطرہ لاحق ہوجائے اور ملک پر خارجی تسلط کی زمین ہموار ہوجائے۔ استعماری حکومت کے دوران اس مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوا کرتی تھی کیونکہ برسراقتدار استعماری حکومتیں اس بات کی ہر ممکن کوشش کیا کرتی تھیں کہ اپنے زیر اثر نوآبادیاتی علاقے میں اپنے پسندیدہ دین یا مذہب کی خاطر خواہ تبلیغ انجام دیں آج ایسے بہت سے ملک موجود ہیں جہاں استعماری دور حکومت میں ان کے مذہب کو تبدیل کیا جاچکا ہے۔[1] پس اگر کسی ملک میں مذہبی تبلیغات سرحد پار تبلیغی جماعتوں کے ذریعہ انجام پاتی ہیں اور مبلغین بیرونی حمایت و سرپرستی کے حامل ہوتے ہیں تو ممکن ہے کہ اس ملک کی حکومت اس قسم کی تبلیغ کو قومی اتحاد کے خلاف تصور کرے اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں کو نفسیاتی دباؤ قرار دیتے ہوئے ایسے لوگوں کی حمایت پر آمادہ ہوجائیں جن کو بیرونی حمایت کے سایہ میں مذہبی تبلیغات کا نشانہ قرار دیا جارہا ہے۔[2]

روسی آرتھوڈیکس کلیسا کے رہبر دوم نے ۱۹۹۱ء میں اس سلسلے میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا کہ ان کے ملک میں مذہبی اور اقتصادی مبلغین کی ایک بھیڑ جمع ہوگئی ہے۔ انہوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ ان مبلغین کا یہ خیال ہے کہ سوویت یونین کے بکھراؤ کے بعد روس میں جو مذہبی بازار لگا ہوا ہے اس میں یہ لوگ اپنے مذہبی افکار اور اپنی معنوی پونجی پیش کرنے میں ہمہ تن سرگرم ہیں۔[3] کلیسا کے دوسرے ذمہ دار نے یہ اعلان کیا کہ: ''ملک کی سالمیت کے خواہاں گروہ مادی اور ظالمانہ راہ و روش کا استعمال کرتے ہوئے نومذہبی لوگوں کو روسی ادیان و مذاہب ثقافت اور خانوادوں کے خلاف تحریک کررہے ہیں''۔[4] ۱۹۹۳ء میں روسی آرتھوڈیکس کلیسا نے عیسائی تبلیغی جماعتوں بالخصوص مغربی دنیا سے تعلق رکھنے والے پادریوں پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ بھاری رقم اور منظم وسائل و امکانات کے ذریعہ بیرونی ادیان و مذاہب کی تبلیغ و ترویج میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ انسان دوستانہ امداد اور سیر و سیاحت کے وعدوں کے ذریعہ لوگوں کو اپنے دین کا گرویدہ بناتے ہیں جب کہ ملک کی اکثر آبادی ان کی اس حرکت کو پسند نہیں کرتی ہے کیونکہ ان بیرونی مبلغین کی وجہ سے ان کے قومی اور مذہبی احساسات کو چوٹ لگتی ہے۔ سردست روس میں غیر آرتھوڈیکس عیسائی کو ہر آدمی ناپسندیدگی کی نظر سے

۱- محمد حسین مظفری، ایضاً ۲- ایضاً

3- Joham Witt jr. Soul Wars, The Problem and Promise of Proselytism in Russia

4- ibid

دیکھتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایسا شخص روسی عوام کی معنوی وحدت اور مذہب آرتھوڈیکس کو نابود کرنا چاہتا ہے۔ ان لوگوں کی نظر میں حقیقی سامراجی وہ لوگ ہیں جو نامناسب وسائل کے ذریعہ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ملک کے عوام کو کلیسا سے دور کردیں"۔[1]

بیرونی عیسائی تبلیغی جماعتوں کی سرگرمیوں پر پابندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے روسی آرتھوڈیکس کلیسا کے پادری نے اعلان کیا کہ: "آزادی کا مطلب مکمل اختیار کا حامل ہونا نہیں ہے۔ درحقیقت حضرت مسیح نے آزادی کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں پر ایک بڑی ذمہ داری بھی عائد کی ہے اور وہ ذمہ داری دوسرے لوگوں کی آزادی کا احترام ہے۔ اس کے باوجود بیرونی مبلغین کے اصولوں کو طاقت اور ظالمانہ راہ و روش کے ذریعہ ہم لوگوں پر لادنا دراصل ہم لوگوں کے مذہبی اور ثقافتی حقوق کی خلاف ورزی ہے کیونکہ یہ لوگ ماحولیاتی اعتبار سے بالکل بیگانہ معلوم ہوتے ہیں"۔[2]

اسی طرح ان تبلیغی جماعتوں کی سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں کا معاملہ ہے جس میں اسپتالوں، اسکولوں اور ننھے منے بچوں کی نگہداشت کرنے والے مراکز کی ایجاد شامل ہے جن کو نامناسب تبلیغی راہ و روش میں شامل کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ سہولتیں دین کی تبدیلی میں ایک موثر وسیلہ کا درجہ رکھتی ہیں اور افریقی ملکوں میں ان تبلیغی جماعتوں کی سرگرمیوں کو نمونہ کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ درحقیقت بعض معاملات میں غیر مادی اجبار کا یہ حال ہے کہ معاشرہ کے مفلس و نادار طبقے کے لوگوں کو رشوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔[3]

مذہب کی منظم و منصوبہ بند تبدیلی: مذہبی تبلیغ متضاد حقوق کے تنازعہ کا میدان ہے۔ ایک طرف آزادی بیان دینی حمایت کے سایہ میں ہر قسم کے مذہبی اور غیر مذہبی افکار و عقائد کی ترویج و تبلیغ کو جائز قرار دیتی ہے اور دوسری طرف مخاطبین کے دینی عقائد کی حفاظت بھی لازمی ہے تاکہ نادار و مفلس لوگ اپنے دینی عقائد سے دستبردار ہونے کے لئے مجبور نہ ہوجائیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان متضاد و متعارض حقوق کے درمیان توازن کیسے قائم کیا جائے۔ سیاسی اور تمدنی حقوق کی قرارداد کی دفعہ ۱۸ بند ۲ کے مطابق کسی شخص کی آزادی کے حق کو نقصان پہنچانے کے لئے زور زبردستی کے استعمال کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۱ء میں جاری شدہ ایک اعلامیہ کی دفعہ ۱ بند ۲ کے مطابق کسی شخص کو ایسے دباؤ یا جبر و اکراہ کا نشانہ نہ بنانا چاہیے کہ وہ اپنے پسندیدہ دینی

1- Johan Witt Jr. Soul Wars: the Problem and Promise Proselytism in Russia
2- ibid
۳- محمد حسین مظفری، ایضاً

عقیدہ کے انتخاب و تحفظ سے عاجز ہوجائے یا اس کی آزادی کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔

یہ باتیں انسانی حقوق کے اس منشور میں دکھائی نہیں دیتیں جو ۱۹۴۸ء میں پاس ہوا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس قانون کی تشکیل اسی وجہ سے عمل میں آئی تھی کہ استعماری دور میں رائج ظالمانہ تبلیغی راہ و روش کی مخالفت کرنے والے لوگوں کے مسائل کا حل پیدا ہوسکے۔ بہرحال ان قوانین و قرارداد کی تشکیل کے بعد تبلیغی راہ و روش کو منطقی استدلال، عملی مباحثات اور عقل و فکر کا تابع بنادیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں دوسروں کو متقاعد کرنے کے لئے جو طریقۂ کار اختیار کیا جائے اس میں جبر اور زبردستی کا کوئی دخل نہ ہونا چاہیے۔[1]

دین درحقیقت افکار و عقائد اور اعتقادات کا مجموعہ ہوتا ہے[2] اور اصولی اعتبار سے اس کو ایک انفرادی اور ذاتی مسئلہ قرار دیا جاتا ہے[3] اسٹراوڈ قانونی لغت میں دین و مذہب کی تعریف کے ذیل میں اس کے دو بنیادی عناصر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ خدا پر مکمل اعتقاد و ایمان اور اس کی عبادت و بندگی دین کے دو اہم بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔[4] اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین ایک ذاتی اور خصوصی مسئلہ ہے جس کی وجہ سے انسان روحانی اعتبار سے اپنے پروردگار سے منسوب ہوجاتا ہے۔ اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس بات کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی کہ اس کو عالمی انسانی حقوق قرارداد کا موضوع بنایا جائے کیونکہ ان متحدہ پہلوؤں سے اس کا انسانی قلب کے نہایت مخفیانہ پہلو سے گہرا تعلق ہے۔

تبدیلی دین کا مرحلہ: دین و مذہب کی تبدیلی کیسے حاصل ہوتی ہے؟ جو شخص کسی دین کا گرویدہ ہوتا ہے وہ اس کی خصوصیات اور نمایاں صفات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ امید کرتا ہے کہ اس کا پسندیدہ دین سعادت و سربلندی کا حامل ہو اور اس کو روحانی نجات و کامیابی سے مالا مال رکھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے ایسے حالات ہیں جن کی وجہ سے کوئی شخص اپنے پسندیدہ دین کی خصوصیات اور نمایاں صفات کی تردید کرنے لگے یا اس اعتقاد کا حامل ہوجائے کہ اس کے دین میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس کی روحانی امیدوں کو پورا کرتے ہوئے اسے معنوی نجات عطا کرسکے۔ ایسے حالات

1- See generally: Malcolm D. Evans, Religious liberty and International law in Europe: 1997.
2- "Study on the Current Dimensions of the Problems of Intolerance and Discrimination on Grounds of Religion or Belief". Op. cit at p. 3
3- Brice Dickson, "The United Nations and Freedom of Religion" Int comp L. Q. No. 44, 1995, p. 327. 4- Stroud's Judicial Dictionary p. 2218 (5th Edition 1986).

میں اس بات کا قوی احتمال و امکان ہوتا ہے کہ وہ اپنے دین سے دستبردار ہوجائے اور اپنے ارمانات کی تکمیل کے لئے کسی دوسرے دین کی تلاش کرنے یا پوری طرح سے بے دین اور لا مذہب زندگی بسر کرنے لگے۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ کل انسان دین کے سلسلے میں خود کو مکلف مانتا تھا اور اس بات کی کوشش میں لگا رہتا تھا کہ وہ دین کے سلسلے میں اپنے فرائض سے پوری طرح آگاہ رہے اور حتی الامکان ان فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔ لیکن آج صورت حال میں مکمل تبدیلی آچکی ہے آج انسان مذہب سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا اس کا مذہب اس کی امیدوں کو پوری کرسکتا ہے؟ لیکن مذہب کی تبدیلی ہمیشہ انسان کی فکری روش میں تبدیلی پیدا ہوجانے کی وجہ اس کے ذاتی ارادہ یا وجدانی حکم کی وجہ سے انجام نہیں پاتی ہے۔ زیادہ تر امور میں یہ دیکھا گیا ہے کہ بیرونی عوامل کی دخالت افراد یا جماعتوں کے دین کی تبدیلی میں بہت موثر رہی ہے۔ لہذا یہ لازمی ہے کہ تبدیلی دین کے مرحلہ اور تبدیلی دین کے پروجیکٹ کے درمیان فرق تسلیم کیا جائے۔ وہ اسباب وعوامل جو انسان کی عقل اور اس کی وجدانی تصدیقات کے علاوہ اس سلسلے میں اثرانداز ثابت ہوں ان کے سلسلے میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ جملہ افراد، جماعتوں اور دینی اداروں کے اقدامات پر مشتمل ہوں[1]۔ ان اداروں اور تنظیموں کے نمائندے اس کوشش میں سرگرم رہا کرتے ہیں کہ اپنی دینی تعلیمات کو پیش کرتے ہوئے لوگوں کو اپنے مجوزہ دین کو قبول کرنے کی دعوت دیں اور ان افراد کے ذریعہ اس دین کی تعلیمات کی پیروی کے ذریعہ دوسرے لوگوں کو بھی اس دین کی پیروی پر آمادہ کرلیں۔ اس بات کی وضاحت پہلے بھی کی جاچکی ہے کہ ان سرگرمیوں میں تبلیغی طرز و ادا کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ بعض حکومتوں نے نامناسب اور خطرآمیز تبلیغی راہ و روش کو ممنوع قرار دیتے ہوئے اس کام میں لگے ہوئے افراد کے خلاف سزا بھی تجویز کی ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالمی منشور میں جس ''تبدیلی دین'' کی بات کہی گئی ہے اس سے کونسی تبدیلی مراد ومقصود ہے؟ کیا اس عبارت کے ذریعہ اس تبدیلیٔ دین کی حمایت مقصود ہے جو کسی شخص کی ذاتی فکر اور اس کی وجدانی تحقیقات کے نتیجے میں انجام پائی ہے؟ یا اس عبارت سے مراد وہ تبدیلی دین ہے جو خارجی عوامل کی ترغیب اور نفسیاتی و روحانی دباؤ کے نتیجے میں ظاہر ہوئی ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ جاننا ضروری ہے کہ کیا اس عبارت کا حقیقی مقصد اس فرد کی آزادی کی ضمانت ہے جو

1- See Eugene P. Heideman, Proselytism Mission and the Bible, int' L Bull Missionary Res. No. 20. 1996 p. 10

اپنے دین کو اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق یا بیرونی اسباب وعوامل کے دباؤ کے نتیجے میں تبدیلی دین کا خواہاں ہے یا اس عبارت کے سایہ میں ان افراد یا جماعتوں کے حق کی ضمانت مقصود ہے جو دوسروں کے دین کی تبدیلی کا خواہاں ہے یا اس عبارت کے سایہ میں ان افراد یا جماعتوں کے حق کی ضمانت مقصود ہے جو دوسروں کے دین و مذہب کی تبدیلی میں ہمہ تن سرگرم ہیں؟

واضح رہے ایسے جبر و اکراہ اور زور و دباؤ کے استعمال کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جس کی وجہ سے کسی کے پسندیدہ دین وعقیدہ کے لئے خطرہ لاحق ہو۔ اس ممنوعیت کے دائرہ میں وہ مادی جبر اور دھمکی بھی شامل ہے جس کے ذریعہ کسی فرد واحد کے دین و مذہب کی تبدیلی کی زمین ہموار کی گئی ہو یا اپنے مطلوبہ دین سے دستبرداری اختیار کرنے کے لئے مجبور کیا گیا ہو، یا کسی فرد یا جماعت کو کسی مخصوص مذہب کے فریضہ کو انجام دینے یا انجام نہ دینے کے لئے مجبور کیا گیا ہو۔ ان تمام باتوں کے باوجود عالمی منشور کے اس بند میں غیر مادی اور نفسیاتی دباؤ کے استعمال کے سلسلے میں خاموشی سے کام لیا گیا ہے اور اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ کیا اس ممنوعیت اور پابندی کا اطلاق نفسیاتی اور اقتصادی اجبار اور دباؤ پر بھی ہوتا ہے اور بنیادی اعتبار سے جبر و دباؤ کی وہ کونسی شکلیں ہیں جن کو اس ممنوعیت اور پابندی کے دائرہ میں شامل کیا گیا ہے[1]۔ بہرحال داخلی قانون یا عالمی قانون کے مطابق اجبار اور دباؤ کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ دنیا کے زیادہ تر ملکوں کے داخلی قانون میں جبر و دباؤ کے سلسلے میں خصوصی توجہ اور وضاحت سے کام لیا گیا ہے اور اس ضمن میں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ جبر و زبردستی کا استعمال معاملہ میں عدم نفوذ کا باعث ہوتا ہے اور بین الاقوامی قانون میں بھی لفظ جبر سے مراد اس قہری اور جابرانہ طاقت کا استعمال ہے جو معاہدوں کو باطل کردیتی ہے لہذا اس بات کی اہم ضرورت ہے کہ انسانی حقوق کے عالمی منشور اور معاہدہ میں اس موضوع کا بھرپور مطالعہ و تجزیہ کیا جائے تاکہ نامفہوم اور غیرواضح پہلوؤں کی وضاحت ہوسکے۔

پس اگر جماعتیں افراد یا کسی جماعت کے دین کو منصوبہ بند طریقے سے تبدیل کرنے کی کوشش کریں تو اس سلسلے میں حکومت کو کیا کردار ادا کرنا چاہیے؟ کیا اسے ایک غیر جانبدارانہ تماشہ دیکھنے والے کا کردار ادا کرنا ہے یا لوگوں کے دین کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے لہذا اس اصول

1- Donna J. Sullivan "Advancing the Freedom of Religion or Belief through the UN Declaration on the Elimination of Religions Intolerance and Discrimination" American Journal of International Law. No. 82, 1988 p.487

کے مطابق لوگوں کے مذہبی حقوق میں نامناسب بیرونی مداخلت کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے عوام کا دفاع کرنا چاہیے؟ اس سے قبل کوکینا کیس معاملے میں مارتنز نامی جج کے ذاتی نظریہ کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے جس میں اس نے یہ کہا تھا کہ مذہبی آزادی کا اصلی اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ حکومت کو مذہب کی حفاظت یا تبدیلی میں کوئی حق یا اختیار حاصل نہ ہونا چاہیے۔ اس بات کا حکومت سے کوئی واسطہ نہیں ہے کہ کسی شخص نے اپنے ضمیر کے فیصلے پر اپنا مذہب تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا ہے یا دوسروں کے بہکاوے میں آ کر اس نے تبدیلی مذہب کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ انسان کی عظمت اور آزادی کے احترام کا یہ تقاضہ ہے کہ ہم ہر آدمی کے بارے میں یہ تسلیم کرلیں کہ اس میں اپنے قسمت کے فیصلے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

۱۹۸۱ء میں مذہبی عدم تحمل کو محو قرار دینے والے اعلامیہ کی تدوین کے دوران ہونے والے مباحثات کے درمیان اسلامی ملکوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اسلامی جمہوریہ ایران نے ایک بار پھر اپنے اعتراض کا اظہار کرتے ہوئے یہ واضح کردیا تھا کہ مسلمانوں کو اس بات کی اجازت حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے مذہب کو تبدیل کریں اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے موت کی سزا بھگتنی ہوگی۔ البتہ اس بات کا اعتراف لازمی ہے کہ اپنے ضمیر کے فیصلے کے مطابق آزادانہ طور پر کسی دین کے انتخاب یا کسی خارجی عنصر کے اثر و رسوخ اور جبر و دباؤ کی وجہ سے کسی دین کے انتخاب کے درمیان نمایاں سرحد کا تعین ناممکن ہے لیکن ان اسباب و عوامل کا مطالعہ و تجزیہ ضرور کیا جاسکتا ہے جو تبدیلی دین کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تبلیغی جماعتوں کی نا مناسب اور غیر قانونی تبلیغی راہ و روش کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے اور ان پر لازمی پابندی عائد کرنے کے سلسلے میں قانونی قدم اٹھائے جاسکتے ہیں۔[1]

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ انسانی فکر وعقیدہ خارجی جبر و دباؤ سے پوری طرح محفوظ اور مادی جبر و اکراہ کے مقابلے میں اس کا ایمان فولادی صفت کا حامل ہوتا ہے لیکن بعض لوگ عقل، سمجھ کی محدودیت اور تجربہ کی کمی کی وجہ سے اس میدان میں نقصان اٹھاچکے ہیں اور اگر کوئی ماہر شکاری اس میدان میں اپنے دام فریب کے ذریعہ شکار کرنا چاہے تو وہ آسانی سے لوگوں کو اپنا شکار بنالے گا آج کل کچھ جماعتیں ہپناٹزم، تمرکز احساس یعنی میڈیٹیشن، جادوگری اور شعبدہ بازی کے

1- See Arcot Krishnaswami op. cit, also see Int, L, Bull, Missionary Ros. No. 20, 1996 p. 10

ذریعہ سادہ لوح افراد کو اپنے مکر و فریب کا شکار بنا رہی ہیں۔

عالمی قوانین میں اجبار کا مفہوم: جدید عالمی قوانین میں اور معاہدات کے قوانین اور موضوعہ قوانین کے میدان میں ۱۹۶۹ء میں منعقد معاہدۂ ویانہ میں معاہدات پر اجبار کے اثر و رسوخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جو معاہدہ کسی ملک کے نمائندہ پر دھمکی کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں ان کا کوئی اعتبار و اعتماد نہیں ہوتا ہے البتہ ۱۹۶۹ء کے معاہدہ کے کاتبوں نے متفقہ طور پر یہ تسلیم کیا ہے کہ مسلط کردہ معاہدات کی بے اعتباری کی وجہ صرف رضا کی کمی نہیں ہے بلکہ اس اجباری عمل کا غیر قانونی ہونا اس معاہدہ کے اعتبار کو ختم کر دیتا ہے کیونکہ معاہدہ کی تخلیق میں لاقانونیت صاف ظاہر ہے۔[۱] عالمی قوانین کمیشن کے اراکین اور ویانہ کانگریس میں شریک بعض ملکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ زور و اجبار سے استفادہ کی دوسری شکل مثلاً ملکوں کے لئے اقتصادی بحران کی ایجاد کو معاہدہ میں مادی طاقت کے دیگر اسباب و عوامل کے ساتھ بیان و درج کیا جانا چاہیے۔ آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ کانفرنس کی آخری سند میں ایک بیانیہ کا اضافہ ہونا چاہیے۔ جس میں طاقت کی کسی بھی شکل مثلاً فوجی، سیاسی اور اقتصادی طاقت کے استعمال کی مذمت کی جانی چاہیے۔[۲]

داخلی قوانین میں اکراہ کا مفہوم خارجی اور مادی اجبار اور اضطرار کو داخلی، نفسیاتی اور اقتصادی اجبار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اب ہم لوگوں کو یہ طے کر لینا چاہیے کہ عالمی قوانین اور انسانی حقوق معاہدہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اکراہ اور اضطرار کے مفہوم کے درمیان کوئی فرق ہے یا نہیں؟ ذیلی کمیشن نے اپنے اصول و آئین کے ڈرافٹ کی تدوین میں واضح تر عبارت کا استعمال کیا تھا اور ڈرافٹ کے متن میں غیر مادی اور مادی اکراہ کی وضاحت کر دی تھی جس کی رو سے کسی کو اخلاقی یا مادی اکراہ کا نشانہ نہ بنانا چاہیے جس کی وجہ سے اس کی آزادی یا دین و عقیدہ کی تبدیلی کو نقصان سے دوچار ہونا پڑے۔ انسانی حقوق سے وابستہ اسناد کے اغراض و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نیز مذہبی آزادی کے قوانین کی تکمیل کی خاطر اجبار کی ایسی تفسیر بیان کرنی چاہیے جس میں جسمانی اور مادی اجبار کے علاوہ نفسیاتی اجبار بھی شامل ہو۔ اس طرح اس ممنوعیت اور پابندی میں ایسے اعمال کی شمولیت بھی ہونی چاہیے جس میں فائدہ کا حصول یا حکومتی خدمات کی فراہمی کو کسی مذہبی عقیدہ کی قبولیت یا تردید سے وابستہ و مشروط کر دیا جائے مثلاً فرانس کے مدرسوں اور اسکولوں میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کی ممنوعیت کو اس اکراہ و

۱- حقوق بین الملل معاہدات، ہدایت اللہ فلسفی، تہران، ۱۳۷۹ ۲- ایضاً

اجبار کی بہترین مثال قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ سرکاری خدمات سے استفادہ کو اسلامی حجاب سے دوری و علیحدگی سے وابستہ کردیا گیا ہے۔ جب کہ اسلامی شریعت کے مطابق حجاب ایک لازمی حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح عیسائی تبلیغی جماعت کی ان سرگرمیوں کو ناجائز اور غیر قانونی تبلیغی راہ و روش قرار دیا گیا ہے جس میں رشوت کی ادائگی، مالی تحریص، سبز کارڈ کی فراہمی، عہدہ ملازمت، علاج، اقامتی اجازت، تعلیمی وظیفہ اور پناہندگی کی فراہمی کا وعدہ وغیرہ شامل ہیں۔

بہرحال ڈیلی کمیشن کا مجوزہ متن تو منظور نہیں ہوا اور اعلامیہ میں فقط اجبار کی ممنوعیت کی طرف اشارہ کیا گیا اور نفسیاتی و مادی پہلو کو متن سے حذف کردیا گیا۔ مغربی ممالک کے نمائندوں نے خصوصی طور پر اجبار کے وسیع مفہوم پر زور دیا جب کہ اسلامی ممالک کے نمائندوں کی بدنیتی کو بالکل بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا ہے۔ پس انسانی حقوق سے وابستہ اسناد میں فقط اسلامی انسانی حقوق اعلامیہ کی دفعہ ۱۰ میں دین یا عقیدہ کی تبدیلی کے سلسلے میں جبر و اکراہ کے علاوہ دیگر اسباب و عوامل کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے واضح رہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ یہ انسان کے خلاف ہر طرح کے جبر و اکراہ کا مخالف ہے۔ اسلام کی نظر میں انسان کی غریبی یا جہالت و نادانی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دین سے دوسرے دین کی تبدیلی یا دین و عقیدہ سے علیحدگی اور الحاد سے وابستگی ہرگز جائز نہیں ہے۔

بحرانی حالات جیسے ظہور انقلاب، جنگ، قحط، زلزلہ اور سیلاب وغیرہ کے دوران جس سے کسی فرد واحد یا افراد پر مشتمل کسی ایک جماعت کی قسمت وابستہ نہیں ہوا کرتی بلکہ کسی شہر یا ملک میں بحرانی حالات کے پیدا ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ متاثرہ علاقہ کے لوگوں پر ایسے حالات مسلط ہوجاتے ہیں کہ بڑا سے بڑا آزاد آدمی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسے حالات میں موقع پرست جماعتیں حرص و طمع کی وجہ سے لوگوں کے دین کی سوداگری میں مصروف ہوجایا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر وایٹ کا کہنا ہے کہ روس میں دس سال کی وسیع تبلیغات اور لوگوں کے درمیان تبدیلی دین کی دعوت اور مختلف النوع مذہبی تبلیغات کی وجہ سے بہت سی سہولتیں فراہم ہوگئیں ہیں اور ان خیرخواہانہ سہولتوں کی وجہ سے سنگر اور کافر کیمپوں میں دین کی تبدیلیت کا ماحول پیدا ہوگیا ہے لیکن دوسری طرف اس مسئلہ میں مختلف قسم کی پریشانیاں بھی پیدا ہوگئیں ہیں مثلاً مذہب کی تبدیلی کے لئے رشوت کی ادائیگی اور اس فکر کی ایجاد و ترویج کہ مذہب کی تبدیلی بڑی آسانی سے ممکن ہے۔ دین کی تبدیلی کے سلسلے میں اس پروپگنڈہ کی وجہ سے روسی عوام کے درمیان نفرت سی پیدا ہوگئی ہے اور وہ لوگ یہ محسوس

کرنے لگے ہیں کہ سرد جنگ میں کامیابی کے بعد مغرب نے دوسرے مذہبی انداز میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کردیا ہے۔[1] ان اقدامات کے ذریعہ سامراجی دور کی تبلیغی سرگرمیوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جس کا حقیقی اور اصلی روپ انیسویں صدی کے دوران مشرق وسطی میں برطانوی اور فرانسیسی فوجیوں کی موجودگی میں عیسائیت کی تبلیغ کی شکل میں ظاہر ہوگیا۔ فوجی موجودگی کے سایہ میں بحران زدہ عوام کے درمیان عیسائی تبلیغی سرگرمیوں نے نہایت دشوار حالات پیدا کردیئے۔

جنگی قیدیوں کی مذہبی آزادی: ۱۲ اگست ۱۹۴۹ء کو جنگی قیدیوں کے ساتھ اخلاقی سلوک و برتاؤ کے سلسلے میں جینوا کنونشن میں جو قرارداد منظور کی گئی تھی اس کی مختلف دفعات میں قیدیوں کے لئے ان لوگوں کی مذہبی آزادی کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس قرارداد کی دفعہ ۳۴ کے مطابق جنگی قیدیوں کو اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی اور مذہبی اجتماعات میں شرکت کی عملی آزادی حاصل ہوگی۔ ان کے مذہبی مراسم اور اجتماعات کے لئے خصوصی جگہ کا اہتمام کیا جائے گا لیکن انہیں متعلقہ حکومت کے احکام و قوانین کی پیروی بھی کرنی ہوگی۔ اس دفعہ کی روشنی میں جنگی قیدیوں کو ان کے مذہبی پروگرام میں عملی شرکت کی سہولت حاصل ہوگی اور متعلقہ حکومت کے فوجی افسران قیدیوں کو اپنے مذہبی مراسم میں شرکت سے منع نہیں کریں گے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ جنگی قیدیوں کو نہ کسی مخصوص مذہبی پروگرام میں شریک ہونے کے لئے مجبور کریں گے۔ جبر و اکراہ اور مادی زور و زبردستی کے ذریعہ جنگی قیدیوں کو تبدیلیٔ دین کے لئے آمادہ کرنا ممنوع ہے۔

درحقیقت جینوا کنونشن نے جنگی قیدیوں کی نگہداشت کرنے والی حکومت پر دو خصوصی فرائض عائد کئے ہیں۔ منظور شدہ قرارداد کی دفعہ ۳۴ میں سب سے پہلے ایک کام کو انجام دینے سے روکا گیا ہے۔ اس ضمن میں قیدی بنانے والی حکومت جنگی قیدیوں کے مذہبی پروگرام کے انعقاد اور اس میں ان لوگوں کی شرکت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرے گی اور اس کو یہ حق بھی حاصل نہ ہوگا کہ وہ جنگی قیدیوں کو کسی مخصوص مذہبی پروگرام میں شرکت اور طاقت و جبر کے ذریعہ انہیں اپنے مذہب کو تبدیل کرنے کے لئے مجبور کرے۔ اگرچہ اس قرارداد میں جنگی قیدیوں کے خلاف غیر مادی جبر کی بات تو نہیں کی گئی ہے پھر بھی یہ بات بخوبی واضح ہے کہ قرارداد کی اس عبارت ''جنگی قیدیوں کو اپنے مذہبی پروگراموں میں عملی شرکت کی آزادی حاصل ہوگی'' سے پتہ چلتا ہے کہ جسمانی یا نفسیاتی جبر و زبردستی

1- Jane lampman op cit.

کا استعمال مکمل آزادی کی ضد ہے پس جنگی قیدیوں کو کسی طرح کے اعصابی تناؤ میں مبتلا کرنا، ان کے ذہن پر کسی چیز کو زبردستی مسلط کرنا قانونی اور بہداشتی سہولتوں کو مشروط کرنا اور کسی مخصوص مذہب کے مراسم میں شرکت کے لئے جنگی قیدیوں کو مدعو کرنا اور ان کی رضامندی حاصل کرنا ممنوع ہے۔ دوسرے خصوصی فریضہ کا تعلق کام کے انجام دینے کی ماہیت سے ہے اور متعلقہ حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ان امور کو انجام دینے کے لئے لازمی وسائل و امکانات فراہم کرے جس کا ذکر قرارداد کی دفعہ ۳۵ میں کیا گیا ہے جو مذہبی علماء دشمن کی فوج کے ہاتھ آ جائیں انہیں جنگی قیدیوں کی مدد کے لئے ان کی رضامندی یا زور و زبردستی کے ساتھ قیدیوں کی اقامت گاہ میں روکا جائے۔ ان علماء کو جنگی قیدیوں کے درمیان اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت کی مکمل آزادی حاصل ہوگی تاکہ وہ قیدیوں کے وجدان کے مطابق مذہبی مراسم کا اہتمام کریں ایک زبان، ایک ملک و حکومت اور ایک مذہب کی پیروی کرنے والوں کو جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں ایک ہی جگہ رکھا جائے گا۔

سرزمین پر قبضہ: روس میں عیسائی تنظیموں کے تجربہ کے سلسلے میں ڈاکٹر واٹ کہتا ہے کہ عیسائی تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں کے ناپسندیدہ و نا مطلوب نتائج اور منفی پہلو کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ ان سرگرمیوں کی مختلف شکلوں سے معنوی رشوت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مغربی جماعتوں نے دین کے سلسلے میں جو باتیں پیش کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مذہب کی تبدیلی بہت آسان کام ہے۔ مغرب کا یہ طرز فکر آرتھوڈکس عیسائیوں اور مسلمانوں کی روایت سے بالکل مختلف ہے۔ اسی وجہ سے روس نے حقوق اور آزادیوں کے سلسلے میں ایک قانون پاس کرتے ہوئے ان میں سے زیادہ تر آزادیوں کو حکومت سے وابستہ جماعتوں کے مفاد میں محدود کر دیا[1]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی تبلیغی جماعتوں کے سلسلے میں روسیوں کا یہ نظریہ موجودہ زمانہ میں عراق کے سلسلے میں بالکل حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ سردست عراق اس مغربی اتحادی فوج کے قبضہ میں آ گیا ہے جس کی کمان و قیادت امریکہ کے ہاتھوں میں ہے اور اس وقت عیسائی تبلیغی سرگرمیاں امریکی فوج کی حمایت و سرپرستی کے سایہ میں عراقی علاقوں میں ہمہ تن سرگرم عمل ہیں تاکہ ملک کے حالیہ بحرانی حالات اور لوگوں کی ضرورت اور بے سرو سامانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عراقی عوام کو دین کی تبدیلی کے لئے آسانی سے آمادہ کر لیں اور ایک منصوبہ بند پروگرام کے تحت عراقی مسلمانوں کے دین کو تبدیل کر دیا جائے۔ تبلیغ دین کی آزادی کا حق

1- Jane lampman of cit.

اور فرد واحد کے ضمیر کی آزادی کے حق کے درمیان حملہ آورانہ تبلیغ نے دوسروں کی مداخلت کے سلسلے میں رکاوٹ پیدا کردی ہے۔ گذشتہ چند برسوں کے دوران انجیلی کی گرجا گھروں نے شمالی افریقہ، مشرق وسطی اور ایشیائی علاقوں کو عیسائیت کی کھڑکی قرار دیتے ہوئے ان علاقوں میں عیسائی تبلیغی سرگرمیوں کو اولیت دینے کا اعلان کیا ہے۔[1]

اسلامی ملکوں نے بھی عیسائی تبلیغی سرگرمیوں کے سلسلے میں مختلف موقف اختیار کر رکھا ہے۔ مثلاً پاکستان عیسائی مبلغین کو ویزا فراہم کرتے ہوئے ان کی تبلیغی سرگرمیوں کے جاری رکھنے کی حمایت کرتا ہے لیکن سعودی عرب میں عیسائی مبلغین کو تبلیغی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ عیسائی پہلی صدی کی ابتداء ہی سے مشرق وسطی میں موجود تھے اور ماضی میں مسلمانوں کے ساتھ صلح آمیز زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ جب کبھی عرب علاقوں میں آباد عیسائیوں نے مال و دولت اور دیگر وسائل و امکانات کے ذریعہ اور نامناسب راہ و روش سے کام لیتے ہوئے لوگوں کے دین کی تبدیلی کی کوشش کی انہیں پریشانیوں کا منھ دیکھنا پڑا۔ ڈاکٹر حسین نصر کا خیال ہے کہ ''سچے عیسائی مبلغین سے مسلمانوں کی کوئی عداوت نہیں ہے لیکن مسلمان اس بات سے غیر معمولی طور پر ناراض ہوتے ہیں کہ امریکہ مال و دولت کی فراہمی اور مادی امتیازات کے ذریعہ لوگوں کو عیسائی بنانے میں سرگرم ہے۔ غریب اور مفلوک الحال لوگوں کے بیمار بچوں کے علاج اور ان کے جانوروں کے لئے ٹیکا اس شرط کے ساتھ فراہم کرنا کہ وہ کلیسا کے پروگرام میں شرکت کریں۔ مہربانی کے مظاہرے سے مذہبی تبلیغات کو ہر ممکن فروغ دینے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ عیسائی مبلغین کی مکاری اور دغابازی کی بہت سی مثالیں موجود ہیں''۔[2]

مادر جونز نامی رسالہ میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ نے عیسائی مبلغین کے خفیہ پروگرام کو پوری طرح بے نقاب کردیا تھا۔ واضح رہے کہ جدید مبلغین کی تربیت کے لئے تعلیمی پروگرام مرتب کئے گئے تھے تاکہ لازمی ٹریننگ کے بعد انہیں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے دنیا کے مختلف ملکوں میں بھیجا جا سکے جہاں عیسائی تبلیغی سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی۔ اس تربیتی پروگرام میں یہ بات بھی شامل تھی کہ مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف راغب کرنے کے لئے ان سے کیسے رابطہ قائم کیا جائے۔ اخلاقی اغراض و مقاصد کے لئے دورغ گوئی فریب کاری اور دغابازی سے کام لینا ان لوگوں کے لئے کوئی

1- Jane lampman op cit. 2- ibid

بڑی بات نہیں تھی"۔[1]

۱۹۴۹ء میں منظور شدہ جنیوا کنونشن میں جنگ کے دوران غیر فوجی عوام کی امداد و حمایت کے سلسلے میں کہا گیا ہے:

دفعہ ۵۸ قابض و غاصب فوج مذہبی رہنماؤں کو اس بات کی اجازت و سہولت فراہم کرے گی کہ وہ اپنے مذہبی اور معنوی خدمات کا اہتمام کریں۔ اس کے علاوہ قابض فوج والے مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے لازمی کتاب اور دیگر وسائل کو مقبوضہ سرزمین کے باشندوں کے درمیان تقسیم کرنے کی سہولت بھی فراہم کریں گے۔

دفعہ ۹۳ مقبوضہ علاقوں میں موجود لوگوں کو اپنے مذہبی فرائض کو ادا کرنے نیز دینی پروگراموں میں شرکت کرنے کے لئے عملی آزادی حاصل ہوگی لیکن انہیں مقبوضہ علاقوں میں قابض حکمرانوں کی طرف سے جاری احکام کی پیروی کرنی ہوگی۔ دوسری طرف مقبوضہ سرزمین میں موجود مذہبی علماء کو یہ سہولت حاصل ہوگی کہ وہ اپنے مذہبی معاشروں کے درمیان لازمی خدمات انجام دیں۔ بالخصوص جنگی قیدیوں کی نگہداشت کرنے والی حکومت کے فرائض کے بارے میں جو باتیں بیان کی گئیں وہ اولیت کے ساتھ اور تاکیدی طور پر قابض فوجوں کے بارے میں پیش کی گئی ہیں۔ لہذا نہ صرف یہ کہ قابض فوجوں کو مذہبی تبلیغات کے کاموں میں پیش قدمی نہ کرنی چاہیے بلکہ اسے انسانی دوستانہ سرگرمیوں کی باقاعدہ نظارت کرنی چاہیے تاکہ یہ تمام رفاہی امور غیر جانبدارانہ طور پر انجام پاسکیں۔

نتیجہ گیری

۱- گذشتہ دو دہائیوں کے دوران مغربی ماہرین سیاست تحریک اصلاح دین و دینی و حکومتی تنظیموں کے درمیان جدائی جیسے تجربات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمان حاکموں اور دانشوروں کو ہمدردانہ طور پر یہی نصیحت کیا کرتے تھے کہ دین و حکومت کے درمیان جدائی و علیحدگی کی بنیاد پر حکومتی ڈھانچے کی تعمیر و تشکیل درحقیقت فقط مغربی تہذیب و تمدن کا خاصہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک گرانقدر انسانی نعمت ہے اور دنیا کی تمام اقوام کو مغربی تہذیب کی دیگر نعمتوں کی طرح اس نعمت سے وابستہ رہنا چاہیے اور دین کی سعادت و نجات کی جستجو اسی راہ پر چلتے ہوئے کرنی چاہیے۔

ایسے حالات میں امریکہ میں لوگوں نے اس تہذیب و تمدن کی ایک ترقی یافتہ ترین جماعت تیار

1- Jane lampman op cit.

کرلی جس نے سیکولرازم کی تردید کرتے ہوئے ایک لاکھ ڈالر کے انعام کا اعلان اس شخص کے لئے کیا جو امریکہ کے آئین میں ان حقائق کی نشاندہی کردے جن کے بموجب دین اور حکومت کے درمیان جدائی اور علیحدگی کو ثابت کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ ارباب حکومت نے اس بات کی بھی بھرپور کوشش کی کہ حکومت کے دس اہم فرامین بڑے بڑے شہروں اور اہم سرکاری اداروں میں نصب کردیے جائیں۔ صدر جمہوریہ کے چناؤ میں اس جماعت نے طاقت کے مراکز پر اپنا قبضہ جمالیا جن کو عیسائی صیہونی کے نام سے یاد کیا گیا۔ ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور فوج حضرت مسیح کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے تباہ کن اسلحوں کے ذریعہ رعب و دبدبہ کے سایہ میں عیسائی بشارت و خوشخبری کو ساری دنیا میں پھیلادیں۔ صدر جمہوریہ امریکہ نے عراق پر اپنے حملے کے دوران اور اس کی جنگ طلبی کے مقابلے میں رائے عامہ کی مخالفت کرتے ہوئے یہ دعوی کیا تھا کہ وہ اس مقابلے میں خداوند عالم سے حکم حاصل کرتا ہے پس سامراجی دور میں یورپ والوں نے جو کام نامکمل چھوڑ دیا تھا اب انہیں امریکہ کے ذریعہ اپنی فوجی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے اس ملک کے ناقابل قبول افکار و عقائد کا مقابلہ کرنا ہے۔

۲۔ مغربی دنیا میں دین و حکومت کے درمیان جدائی اور سیکولرازم کا تجربہ ایشیائی اور افریقی ملکوں کے لئے ایک عبرت آموز تجربہ رہا ہے۔ سیکولرازم یورپ میں موجود مخصوص سیاسی و سماجی حالت میں رو نما ہوا۔ چونکہ وہ اس سرزمین کا مقامی پودا تھا اسی وجہ سے اس نے اس علاقے میں غیر معمولی فروغ و نشو و نما بھی حاصل کی لیکن اس پودے کو غیر مقامی اور بیگانہ سرزمین میں لگانا اور زور و زبردستی اور طاقت و لالچ کے ذریعہ اس کو فروغ دینا ایک لاحاصل کوشش کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اس سعی لاحاصل کے ذریعہ سیکولر معاشرہ کی تخلیق ممکن نہیں ہے[۱]۔ جب کہ یہ سیکولرازم مغربی دنیا میں مذہبی آزادی کی خوشخبری کی حامل رہی ہے اور دین و حکومت کے درمیان جدائی و علیحدگی کا بنیادی مقصد یہ رہا ہے کہ حکومت لوگوں کے مذہبی امور میں کم سے کم مداخلت کرے۔ سردست ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مغربی مفکرین نے اپنی ثقافتی قدروں کے حالیہ تجزیہ کے دوران ان دونوں اداروں کے درمیان علیحدگی و جدائی کو افسانہ قرار دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس سلسلے میں شروع ہی سے صحیح

۱۔ دنیای اسلام میں انسانی حقوق کے مسائل: محمد حسین مظفری، پگاہ حوزہ، شمارہ ۴۱، ۱۳۸۰، ص ۵۰

وضاحت نہیں کی گئی۔[1]

۳- عراق میں جلد بازی میں کئے گئے اقدامات مثلاً وہائٹ ہاؤس میں مذہبی امور کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کو سرزمین عراق میں غیر حکومتی اداروں کی تشکیل و تنظیم کا انچارج تعینات کیا جانا اور منصوبہ بند پروگرام کے مطابق عیسائی تبلیغی سرگرمیوں میں غیر معمولی اضافہ کو دیکھتے ہوئے عیسائی مفکرین اور دانشوروں کے درمیان بھی بے چینی کا پیدا ہونا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ جلد بازی کا وہی منفی اثر مرتب ہو جو ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو رونما ہونے والے حادثہ کے فوراً بعد بُش کے اس بیان کا ہوا تھا جس میں انہوں نے اس حملے کو صلیبی جنگ سے تعبیر کیا تھا اور جس کی وجہ سے اصل منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا بالکل اسی طرح تبلیغی سرگرمیوں کے لئے بھی مسائل پیدا ہوسکتے ہیں جیسے امریکہ کی امدادی اور بشر دوستانہ تنظیموں کی یلغار کی وجہ سے مغربی عیسائی اور روسی عیسائیوں کے درمیان تعلقات خراب ہوگئے تھے۔ اسی وجہ سے وودبیری کا خیال ہے کہ سردست امریکیوں اور عیسائیوں میں شدید بے اعتمادی پائی جاتی ہے۔ لہذا اس سلسلے میں جو بھی قدم اٹھایا جائے اس میں عراقی عیسائیوں کا تعاون لازمی ہے اور تبلیغی مشن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عربی عیسائی تنظیموں کو سربراہی کرنی چاہیے۔[2] وایٹ کہتا ہے کہ عراق مغربی عیسائی تبلیغی تنظیموں کی پریشانیوں کا دوسرا منظر پیش کرتا ہے کیونکہ ان لوگوں کو اپنے مذہبی عقائد کے لئے نیا بازار مل گیا ہے حالانکہ یہاں کے مقامی لوگ ان عقائد کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں اور ان لوگوں کے مال کا کوئی خریدار نہیں ہے۔[3]

۴- مغربی مفکرین کی دوسری جماعت دوسری ذہنی کشمکش کا شکار تھی۔ ان لوگوں کو صاف صاف یہ دکھائی دے رہا تھا کہ مغربی سرزمین سے اٹھنے والی آزادی اور انسانی حقوق کی حمایت کی ہر آواز ان کے حالیہ اقدامات کی وجہ سے ماند پڑتی چلی جارہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مغربی نعروں میں پہلی جیسی تڑک بھڑک باقی نہیں رہ گئی ہے اور ان کے لئے نئے نئے مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ اسی طرح سیکولر نظام اور مذہب کے سلسلے میں حکومت کی غیر جانبداری کا بنیادی تقاضہ ہے کہ دینی تبلیغات کے معاملے میں فوج کی مداخلت پوری طرح ممنوع ہے۔ پس عیسائی امدادی اداروں یا تنظیموں کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ فوجی تسلط و غلبہ کے دوران سرزمین عراق کے مظلوم و ستم رسیدہ عوام کی ضرورتوں اور پریشانیوں کا ناجائز استعمال نہ کریں اور ان بحرانی حالات کے دوران اس

۱- مزید اطلاعات کے لئے ملاحظہ ہو مارشل یونیورسٹی میں Edwin kagin کی Separation of Church and State کے موضوع پر ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو کی گئی تقریر
2- Jane lampman op cit.
3- ibid

ملک میں کسی مخصوص دین کی منصوبہ بند حمایت و ترویج و اشاعت کے لئے کوئی اقدام نہ کریں۔

۵- Chiristian Science Monitor نامی اخبار نے ڈاکٹر حسین نصر سے منسوب ایک مقالہ میں لکھا ہے اگرچہ مذہبی حقوق و آزادی جیسے امور کے سلسلے میں انسانی حقوق کے عالمی منشور کی تدوین عمل میں آ چکی ہے لیکن اس منشور میں دینی تبلیغات کے مناسب اور نامناسب طریقوں کی وضاحت نہیں کی گئی ہے''۔[1] اگر ڈاکٹر حسین نصر نے یہ بات کہی ہے تو ان کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ اس عالمی منشور میں مذہبی حقوق و آزادی سے متعلق جملہ امور و مسائل مثلاً تبدیلی دین کے سلسلے میں اختیار کی جانے والی اغواگرانہ و ظالمانہ راہ و روش کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے لیکن یہ جاننا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عالمی منشور میں انسانی حقوق سے متعلق جملہ بین الاقوامی معاہدوں اور قراردادوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے بلکہ دیگر اسناد و مدارک میں ان معاہدوں کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ پس قانونی اعتبار سے وائٹ کا یہ خیال درست اور حق بجانب ہے کہ ان تبلیغی تنظیموں کو ایسا لامحدود اور غیر مشروط حق و اختیار حاصل نہیں ہے کہ اپنی من مانی کریں لہذا فوجی قوانین میں موجود اختیارات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ان تبلیغی تنظیموں کی سرگرمیوں پر زیادہ سے زیادہ پابندیاں لگائی جاسکتی ہیں۔[2]

۶- جب ۱۹۴۸ء کے عالمی منشور کی دفعہ ۱۸۰ میں ''حق تبدیلی دین یا عقیدہ'' کی عبارت کو درج کرنے کی تجویز پیش کی گئی تو بعض اسلامی ممالک کے نمائندوں نے اپنے مناسب اعتراض کا اظہار کیا۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اگر دوسرے اغراض و مقاصد کارفرما نہ ہوں تو اس اضافی عبارت کی شمولیت کے بغیر بھی دین و عقیدہ کی آزادی کا حق پوری طرح واضح ہے۔ اس بدگمانی کو اس وقت غیر معمولی تائید و حمایت حاصل ہوگئی جب مجوزہ دفعہ میں دینی امتیاز و عدم تحمل کو محو کرنے کے بارے میں ہونے والے بحث و مباحثہ کے دوران خصوصی طور پر نفسیاتی جبر و تشدد کے استعمال والی تجویز پاس نہیں ہو پائی اور اسے عالمی منشور کے متن سے پوری طرح حذف کر دیا گیا۔ اس کی وجہ سے ذیلی کمیشن کا مجوزہ متن بھی پاس نہیں ہوسکا بلکہ فقط ظلم و جبر کی ممنوعیت کی طرف اشارہ کیا گیا اور ''نفسیاتی یا مادی'' الفاظ کو بھی اس دفعہ کے متن سے خارج کر دیا گیا۔

پس انسانی حقوق کی اسناد میں مذکور اغراض و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے اور مذہبی حقوق و آزادی کو مکمل ضمانت فراہم کرنے کے لئے اجبار و دباؤ کی ایسی وضاحت کی جانی چاہیے کہ اس میں جسمانی

1- Jane lampman op cit. 2- ibid

اور مادی اجبار و دباؤ کے علاوہ نفسیاتی دباؤ کی شمولیت ہو جائے۔ اس ممنوعیت میں ان اعمال و افعال کا شامل ہونا بھی لازمی ہے جس میں کسی مخصوص مذہبی عقیدہ کی تردید یا قبولیت کو مادی فائدہ و سرکاری ملازمت کی فراہمی یا عدم فراہمی کا وسیلہ قرار دیا گیا ہو۔

۷۔ اس وضاحت اور مذہبی حقوق و آزادی کے سلسلے میں ہونے والے معاہدوں کے متن کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ اعلان کیا جاسکتا ہے کہ اس سلسلے میں قابض و مسلط فوجوں پر دو اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ پہلی اہم ذمہ داری یہ ہے کہ عراقی عوام کے لئے ایسے حالات فراہم کئے جائیں کہ وہ کسی مزاحمت یا پریشانی کے بغیر مذہبی مکانات اور امکانات تک رسائی حاصل کرسکیں۔ پس قابض و غاصب حکومتوں کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ عوام کی مذہبی سرگرمیوں کے سلسلے میں کوئی پابندی لگاسکیں۔ دوسری طرف اس ملک کے بحرانی حالات اور سماجی کشمکش پر مشتمل صورتحال کو نگاہ میں رکھتے ہوئے قابض افواج کی ذمہ داری ہے کہ وہ امدادی اداروں کی انسان دوستانہ سرگرمیوں پر بھی کڑی نگاہ رکھیں اور یہ نظارت پوری طرح غیر جانبدارانہ صفات کی حامل ہونی چاہیے۔ اگر کسی گاؤں والے کی گائے کو ٹیکہ لگانے یا اس کے بیمار بچے کو دوا دینے کے لئے یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ وہ کلیسا میں منعقد کسی مخصوص پروگرام میں ضرور شریک ہو تو یہ کسی کی مجبوری و مفلوک الحالی سے ناجائز فائدہ حاصل کرنا ہوگا اور یہ کام انسانی حقوق سے وابستہ بین الاقوامی معاہدوں کی اعلانیہ خلاف ورزی اور انتہائی مذموم حرکت ہے۔ اسی طرح اگر کسی آدمی کو سرکاری ملازمت یا مراعات فراہم کرنے کے لئے یہ امدادی تنظیمیں یہ شرط لگاتی ہیں کہ وہ کوئی مخصوص دین یا مذہبی عقیدہ قبول کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس آدمی کی دین کو خریدنے کے لئے رشوت فراہم کی جارہی ہے۔ ایسے اقدامات کے ذریعہ نہ صرف انسانی حقوق سے وابستہ بین الاقوامی قرارداد اور معاہدوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے بلکہ یہ عمل آسمانی ادیان و مذاہب کی تعلیمات کے برعکس بھی ہے۔

۸۔ بعض غیر مستند اطلاعات کے بموجب بعض عیسائی تبلیغاتی تنظیمیں مغربی ممالک میں اپنی منصوبہ بند دینی سرگرمیوں کے ذریعہ پناہ گزیں افراد و جماعتوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں لگی رہتی ہیں۔ ان کا مقصد جذب و تطبیق یعنی Assimilation Process کے ذریعہ لوگوں کو گرویدہ بنانا ہوتا ہے یہ تنظیمیں پناہ گزیں کیمپوں کے اعلیٰ افسران کی حمایت و ہم آہنگی کے ذریعہ لوگوں کے نفسیاتی حالات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش میں سرگرم عمل رہا کرتی ہیں اور حالات و صورت حال

سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سادہ لوح افراد کی Brain washing کے لئے طرح طرح کی دواؤں کا استعمال کرتی ہیں تاکہ لوگوں کے اعصاب میں تناؤ پیدا کرسکیں چنانچہ پناہندگی کی درخواست کی منظوری سے قبل لازمی نفسیاتی دباؤ کی وجہ سے یہ لوگ مطلوبہ دین کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں۔

پیرس میں برسوں جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے والے اروگوئیائی باشندہ مارچلو ویگنار کا خیال ہے کہ لوگوں کو اذیت میں مبتلا کرنا ان اقدامات کا اٹوٹ حصہ ہے جس کو عمداً اعتقادات و ارمانات کو محو کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن نفسیاتی اذیت و دباؤ کا مقصد زیادہ اہم اور پیچیدہ ہوا کرتا ہے اور اس ہتھکنڈے کو زیادہ تر مذہبی عقائد کی نابودی یا نئے مذہبی عقائد کی قبولیت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس کو انگریزی اصطلاح میں Brain washing سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس ہتھکنڈہ کے شکار شخص کے ذاتی مذہبی اعتقادات کو نابود کرتے ہوئے نئے دین و مذہب کو اس کے ذہن میں بٹھادیا جاتا ہے۔[۱] لیکن دباؤ اور اذیت کے ایک ہی نسخے کو ہر مقبوضہ سرزمین کے لوگوں پر استعمال کرنا مفید و کارگر ثابت نہ ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ اسلامی ممالک میں تبلیغی سرگرمیوں میں لگی ہوئی عیسائی تنظیمیں اپنی سادہ خیالی کی وجہ سے یہ تصور کرتی ہیں کہ افریقی ممالک کے دور افتادہ علاقوں میں رہنے والے بدوی عوام کی طرح مسلمان بھی آٹے کی ایک بوری یا کھانسی دور کرنے والے شربت کی ایک بوتل کے بدلے میں اپنا دین فروخت کردیں گے اور ہمیشہ کے لئے عیسائی عقیدہ کے پیرو ہوجائیں گے۔ درحقیقت دین و ایمان کی جڑیں دل کی گہرائی میں ہوا کرتی ہیں اور ان اوہام کے ذریعہ کسی قوم کی دینی شناخت کی تبدیلی ناممکن ہے"۔[۲] سابقہ سوویت ملکوں میں عیسائی تبلیغی اداروں کی حملہ آورانہ سرگرمیوں سے حاصل ہونے والے تجربات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ مذہب دشمن ماحول میں برسوں زندگی بسر کرنے والے آرتھوڈیکس مذہبی لوگوں کو کیتھولیک یا پروٹسٹینٹ مذہب کا گرویدہ تو بنایا جاسکتا ہے لیکن ۱۷ ویں اور اٹھارویں صدی میں فوجی قبضہ اور رعب و دہشت گردی کے سایہ میں ان ظالمانہ ہتھکنڈوں کے جواب میں غاصب وحملہ آور کے خلاف غیر معمولی نفرت کے علاوہ اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

۱- مریم رسولیان، مجلۂ آفتاب، شمارہ ۱۲، بہمن ۱۳۸۰، ص ۳۶ ۲- سمیر العراق، روزنامہ الوطن قطر
Http-www-alwatan.com.sa-daily-2003-04-10-index.htm.

نہج البلاغہ: اقدارِ بشریت و امنِ عالم کا سرچشمہ

پروفیسر سید علی رضا نقوی

انسانی معاشرہ ازل سے ایک ایسے نظامِ حیات کی تلاش میں سرگرداں ہے جو اقدارِ بشریت کے فروغ اور پائدار اجتماعی زندگی کے فروغ کے لئے ضروری ہے۔ وہ ایسے نظام کی جستجو میں اس وقت بھی تھا جب معاشرہ چند نفوس کی آبادی تک محدود تھا اور زندگی چند ضرورتوں پر منحصر تھی اور اس کی ضرورت عصرِ حاضر کے پیچیدہ ماحول میں بھی ہے جو ترقی یافتہ انسان کو بھی ہے جو تسخیرِ کائنات کا حوصلہ رکھتا ہے اور اپنے رب سے سوال کی جرأت کرتا ہے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
(غالب)

لیکن عصرِ حاضر کا یہ ترقی یافتہ انسان تسخیرِ کائنات کا حوصلہ رکھنے اور "دشتِ امکاں" کو "ایک نقشِ پا" سمجھنے کے باوجود آج بھی بے بس نظر آتا ہے کہ ابھی تک وہ ایسے نظامِ حیات کی تلاش میں ناکام ہے۔ اس نے مادی ترقی کی دوڑ میں جدید علم و سائنس کے میدان میں ایک غیر معمولی طرزِ زندگی تو حاصل کر لی لیکن کوئی ایسا دستورِ حیات مرتب کرنے میں بے بس نظر آتا ہے جو ایسے معاشرہ کا ضامن بن سکے جس میں ایک غیر منقسم طرزِ زندگی اقدارِ بشریت کو فروغ دے سکے اور ان کا تحفظ کر سکے۔ اس کی تمام تر ظاہری ترقی اور صنعتی مصنوعات اس کو قلبی سکون نہ دے سکیں۔ حضرت علی کا کلام جو آج دنیا کے سامنے نہج البلاغہ کی شکل میں موجود ہے، بھٹکتی ہوئی انسانی فکر اور فلسفے کی سرگردانیوں میں گھری انسانیت کی آخری پناہ گاہ نظر آتا ہے جہاں اس کی اخلاقیات کا سکون ہے اور تعلیم، ہدایت و نجات کے جھنڈے تلے صراطِ مستقیم کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہی وہ کلام ہے جس پر اگر دنیا آج غور و خوض کرے، اس کو اپنا راہنما بنائے تو بڑی حد تک بھٹکتی انسانی فکر کے لئے ایک نئے معاشرہ کی تشکیل کی راہیں ہموار ہو سکیں اور اقدارِ بشریت کو عروج حاصل ہو جائے۔

انسان کا فطری نظامِ حیات

اس حقیقت کو مسلمہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ انسان جُزوِ کائنات ہے اور مادّہ (جسم) و روح کا مرکب ہے۔ جُزوِ کائنات ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ جو کچھ کائنات میں ہے وہ سب کچھ انسان میں بھی ہے بلکہ شریکِ کائنات ہونے سے مُراد یہ بھی ہے کہ اجزائے کائنات کے آپسی ربط و ضبط میں جو تناسب و توازن پایا جاتا ہے وہی نظم و ضبط اور توازُن انسان کے اجزاء عناصر میں بھی ملتا ہے۔ انسان کائنات کا جُز ہے تو کائنات کی ہر خصوصیت اُس میں سموئی ہوئی ہے۔ اس لیے تا ابد انسان اپنی عقل و فہم کے مُطابق جو بھی انکشافات کرتا رہے گا وہ کائنات کے عناصر سے ہٹ کر نہیں ہوں گے۔

انسان مادّہ و روح کا مرکّب ہے اس لیے دونوں کی حیات و توانائی کے لیے مادّی و روحانی وسائل چاہئے، جن کے بغیر اُن کا فعال بنا رہنا ممکن نہیں ہے۔ اگر انسان کے جسم اور اُس کے اعضاء و جوارح کا یہ تقاضہ ہے کہ اچھی غذا، صحت مند آب و ہوا، رہائش، آرام دہ ملبوسات دستیاب رہیں تو روح کی تازگی، بالیدگی و صحتمندی کا یہ تقاضہ ہے کہ انسان بلند کردار و اخلاق، منصفانہ فکر و عمل جائز و ناجائز کی تمیز، صبر و قناعت جیسے جوہروں سے بھی مزین رہے۔ ان دونوں کے متوازُن رہنے میں ہی حیاتِ انسانی کو بلند درجات ملتے ہیں۔ مزید، انسان کے روحانی جوہروں کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ مادّی تقاضوں کی پاسبانی کرتے ہیں۔ جب کبھی انسان اپنی نفسانی اور مادی ضرورتوں کی حدوں سے تجاوز کرتا ہے تو احساسِ گناہ، ضمیر کی ملامت، شرمندگی، پچھتاوا، صدمہ و افسوس جیسے احساسات اُس کی تنبیہہ کرتے رہتے ہیں۔ جب تک انسان کی نفسانی و مادی خواہشات روح کی نگہبانی کو قبول کرتی رہتی ہیں، جسم و روح کا توازُن برقرار رہتا ہے جو صحت مند انسانی معاشرہ کا ضامن بنتا ہے۔ ایسا ہی معاشرہ بشریت کے اعلیٰ اقدار کو فروغ دیتا ہے اور اُن کا تحفظ کرتا ہے لیکن جب انسان کی نفسانی و مادی خواہشات کی سرکشی روح پر حاوی ہوکر اُسکو اتنا آلودہ کردیتی ہے کہ انسان نہ اپنے ضمیر کی آواز سنے، نہ اُس کو شرمندگی و پچھتاوے کا احساس ہو، نہ اُس میں احساسِ گناہ باقی رہے، نہ کوئی جذبہ انصاف و رحم اُبھرے تو روح کی یہی مُردنی و بے حسی معاشرے کے عدم توازن اور اقدارِ بشریت کی پامالی کا سبب بن جاتی ہے۔ عصرِ حاضر کے انتشار و بدامنی کی بنیاد یہی غیر متوازن زندگی ہے۔

انسان کے مادّی وجود کی دو خصوصیات، جن کو ہم کمزوریاں کہہ سکتے ہیں، ایسی فطری، مستحکم اور بنیادی ہیں جن کو نہ دفن کیا جاسکتا ہے اور نہ دبایا جاسکتا ہے۔ اول، انسان لامتناہی خواہشات کا پلندہ ہے

جس کا سلسلہ پہلے سے آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ یہ خواہشات ایسی سرکش ہیں جن کے فسوں میں انسان ہر لمحہ گھرا رہتا ہے اور نتیجتاً طمع، حرص، حسد، نفرت، توہم پرستی، ہوس جیسے رُجحانات کا شکار بن جاتا ہے۔ دوم، انسان خودغرض بھی ہے جو اُس کو اپنی ذات کی تمام تر تسکین میں محصور رکھتی ہے اور نتیجتاً وہ ذخیرہ اندوزی، جمع خوری، منافع خوری، شقاوت، بے رحمی، بے حسی جیسے رُجحانات کی طرف مائل ہوجاتا ہے اور غیر منصفانہ نظامِ تقسیم میں ہی سکون کا احساس کرنے لگتا ہے۔ ان جذبوں کو تعلیم و تربیت و ترغیب کے ذریعہ شائستہ بنایا جاسکتا ہے، کسی حد تک کنٹرول بھی کیا جاسکتا ہے لیکن دبایا یا مٹایا نہیں جاسکتا۔ اسی مقام پر زندگی کے روحانی پہلوؤں کی اہمیت کا احساس اُبھرتا ہے جو ایسے منہ زور و سرکش جذبات میں توازن برقرار رکھنے میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ اگر ان جذبات کو روح کی نگہداشت و سرپرستی سے آزاد کردیا جائے، جیسا عصرِ حاضر کا معاشرہ کر رہا ہے، تو اقدارِ بشریت یقیناً پامال ہوجائیں گے اور معاشرہ امن و سکون سے محروم ہوتا چلا جائے گا۔ روح کی پاسبانی اُن میں نظم و ضبط، اعتدال و شائستگی قائم رکھتی ہے۔

دنیا کے نظام حیات

اب اس پس منظر میں اگر دُنیا کے مروجہ نظامِ معاشرت کا تجزیہ کیا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ انسانی کاوش نے اب تک دو نظامِ حیات مرتب کیے ہیں اور چونکہ دونوں انسانی کاوش کا نتیجہ ہیں اس لیے دونوں ہی انسان میں پائی جانے والی انہیں دو کمزوریوں پر ٹکے ہیں اور نتیجتاً پُرامن معاشرے کی تشکیل میں ناکامیاب ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظامِ حیات انسان کی لامتناہی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ ہوا دیتا نظر آتا ہے کیونکہ اُن کے مسلسل پھیلاؤ میں ہی نظام کا استحکام برقرار ہے۔ انسان کی خودغرضیوں کو بھی اس نظام میں خوب توانائی ملتی ہے۔ یہاں انسان کے جذبۂ آزادی کو بے لگام بنایا گیا تاکہ وہ حسبِ استعداد دولت و ثروت سمیٹتا رہے اور انسانوں کے جسمانی، ذہنی، نفسیاتی، طبیعی اور معاشرتی تفریق سے منہ موڑ کر، اُن کو پسِ پُشت ڈال کر، معاشرے کو عدم مساوات و استحصال کے کبھی نہ ٹوٹنے والے حِصار میں جکڑے رہنے کے لئے چھوڑ دے۔ ایسے نظام میں دولت مند و بااقتدار افراد کے اندر بے رحمی، شقاوت رعونت و بے حسی جیسے جذبات کا پنپنا فطری ہے کیونکہ یہی جذبات اُن کی خودغرضیوں کے محافظ بنتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اخلاقی پستیوں کی شکل میں سامنے ہے۔

ایسا معاشرہ مسابقت کی اندھا دُھند دوڑ میں جوجھ کر اپنے سے کمتر طبقہ کو حقیر و ذلیل اور پنے کو محترم سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں کو مدِ مقابل ہوتے دیکھ کر ان کو پیچھے دھکیلنے کا ہر جائز و ناجائز

حربہ استعمال کرنے سے نہیں چوکتا۔ ایسے معاشرہ کا انسان تو اپنے بزرگ والدین کی خدمت کو بھی تضیع اوقات سمجھنے لگتا ہے کیونکہ وہ اب اُس سسٹم کے کارآمد پُرزے نہیں رہے جن پر وقت و سرمایہ کھپایا جائے۔ انسان اپنی ذات کی خودغرضیوں میں اس قدر سمٹ جاتا ہے کہ اپنے بچوں کی سرپرستی و نگہداشت کو بھی وقت کی بربادی گردانتا ہے اور اس کے لیے ماہرین وخصوصی اداروں کی خدمات خرید کر فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہوجاتا ہے۔ ایسے ماحول کا پروردہ انسان ہمیشہ بہتر سے اعلیٰ کی فکر میں سرگرداں رہتا ہے اور جو ذہنی، جسمانی، نفسیاتی اور معاشرتی اعتبار سے ایسا کرنے میں ناکام رہتے ہیں وہ استحصال کا شکار بنتے ہیں۔ وہ پھر ایسی ذہنی، و اخلاقی پستی کا شکار ہوتے ہیں کہ لاچاری و غربت میں ساہوکار کے ذریعہ دیئے گئے قرض کو اعلیٰ انسانی خدمت گردانتے ہیں، ساہوکار کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ برے وقت کام آیا اور وقت مقررہ پر رقم واپس کردینے کے عوض بطور ستائش سود کے چند روپیوں کو معاف کردینے کو عظیم کارِ خیر سمجھنے لگتے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ معاشرے کے افراد بہ اعتبار اعضاء و جوارح، جذبات و احساسات، ذہنی استعداد اور طبیعت و مزاج مساوی نہیں ہوتے۔ اُن میں چاق و چوبند، ست و کاہل، مہم جو و محتاط، ضعیف و لاغر اور عقل مند و کند ذہن بھی ہوتے ہیں۔ نتیجتاً سبھی کی صلاحیتیں و استعداد برابر نہیں ہوتیں لیکن خواہشات وتمناؤں اور خودغرضی کا جذبہ ہر فرد میں موجود ہوتا ہے۔ اس تفریق کا لحاظ کیے بغیر بے لگام آزادی یقیناً مساوات کی پامالی کا سبب بنے گی۔

جان لیوا مقابلے، غیر عادلانہ رویہ، حق تلفی اور استحصال کو جھیلتے جھیلتے جب معاشرہ شدید انتشار و بدامنی کا شکار ہوا تو ایک شدید ردِعمل کے بطور اشتراکی نظامِ حیات پیدا کیا جس کی بنیادیں مساوات پر قائم کی گئیں۔ اشتراکی نظام، سرمایہ دارانہ نظام کا انتقامی عکس بن کر ابھرا، اُس کی ضد بنا اور ظاہر ہے جو نظام انتقام وضد پر قائم ہو وہ معاشرے کو انقلابی فکر کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔ اس نظام نے بے لگام آزادی کو معاشرے کے انتشار و بدامنی کی جڑ قرار دیا اور نتیجتاً نظامِ حیات کو، بطور انتقام، دوسری مخالف انتہا کی طرف لے گیا جہاں انسان کے فطری جذبہ آزادی کو ہی مفقود مقید کرلیا گیا اور ''انفرادی آزادی'' کو ''اجتماعی آزادی'' اور ''انفرادی ملکیت'' کو ''اجتماعی ملکیت'' میں بدل دیا گیا۔

اس نظامِ حیات میں انسان کا اپنا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ پیدا ہوتا ہے تو جماعت کے لیے، محنت کرتا ہے تو جماعت کے لئے، کاوشوں وجستجوؤں میں سرکھپاتا ہے تو جماعت کے لیے، جیتا ہے تو جماعت کے لیے اور مرتا ہے تو جماعت کے لیے۔ اس طرح گویا وہ پیدا ہوتا ہے تو حکومت کا غلام بن کر جینے

کے لئے اور اپنے دست و بازو کی طاقت کو اسٹیٹ کا صدقہ سمجھنے کے لیے۔ اس نظام نے ''حبِّ ذات'' اور ''حبِّ نفس'' جیسے فطری جذبات کو اپنے پیدا کردہ ''حُبِّ جماعت'' جیسے جذبہ میں ضم کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے مخصوص تعلیم و تربیت، قہر و غلبہ کا راستہ اپنایا۔ اس نظام نے یہ فکر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ انسان کا ذاتی وجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا، وہ جو کچھ بھی ہے، سماج کے جُز کے بطور اہمیت رکھتا ہے۔

یہ جذبہ کہ تم سماج کے لیے ہو یقیناً قابل قدر ہے لیکن یہ باور کرانا کہ تم کچھ بھی نہیں ہو، غیر فطری ہے۔ طاقت و جبر سے ہر بات منوائی جاسکتی ہے لیکن انسان کے جذبۂ آزادی اور ''حُبِّ نفس'' کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ ہاں تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس میں سلیقہ، وُسعت، جامعیت پیدا کی جاسکتی ہے لیکن فنا نہیں کیا جاسکتا۔ باوجود قہر و غلبہ، تشدد، تعلیم و تربیت کے اس معاشرہ کا پروردہ انسان تعجب کرتا رہا کہ میرے دست و بازو کی پیدا کی ہوئی اشیاء و خدمات پر اسٹیٹ کا تسلط کیوں ہے؟ اور اس کی محنت کی کمائی ہوئی دولت پر تصرّف کا اختیار اُسے کیوں نہیں ہے؟ اگر مساوات کی خاطر حکومت محنت و استعداد کے بموجب صلہ دینا طے کرلے تو انصاف کا تقاضہ یہ ہوگا کہ بہتر صلاحیتوں والے کا صلہ، کم صلاحیتوں والے کے مقابلہ زیادہ ہونا چاہئے کیونکہ مجموعی دولت میں اُن کا عطیہ مقابلتاً زیادہ ہے۔ اب اگر مساوات کی خاطر حکومت ضرورتوں کا تعین بھی خود کرنے لگے اور سب کو اُس کی طے کی ہوئی پیمائش کے مطابق برابر ملنے لگے تو یقیناً پیداوار میں زیادہ محنت کرنے والے افراد کی حق تلفی ہوگی۔ ان کا سوچنا ایک فطری بات ہوگی کہ وہ زیادہ پانے کے حقدار ہیں لیکن اُن کو جبراً اس حق سے محروم رکھا جارہا ہے چنانچہ تاریخ نے یہ ثابت کردیا کہ یہ مصنوعی و جبری مساوات معاشرہ کو منتشر ہونے سے نہیں بچاسکتی۔

دُنیا کا انسانی معاشرہ انہیں دو بڑے نظاموں پر مبنی ہے جس نے ایک طرزِ زندگی تو ضرور دی لیکن یہ دونوں نظام پُرامن معاشرے کی تشکیل اور اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ میں ناکامیاب رہے۔ نتیجتاً دونوں کو انتشار و بدامنی کا شکار ہونا پڑا۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ دونوں ہی نظام محض مادّی عناصر کے تانے، بانے سے حیاتِ انسانی کو سجانے سنوارنے پر مرکوز ہیں۔ مادّی عناصر سے ہٹ کر، انسان کے اخلاق، کردار، نیک و بداعمال، قناعت، صبر، حق گوئی، عدل و انصاف ہمدردی جو روح کی توانائی کے مظہر ہیں، اُن کو نہ کوئی اہمیت دی گئی اور نہ حیاتِ انسانی کے دستورِ عمل کا حصہ بناکر نظامِ کی کامیابیوں و ناکامیابیوں کے پرکھنے کی کسوٹی بنایا گیا۔

یوں تو عدل و انصاف، مساوات، فلاح و بہبود، امداد، رعایت کے بہت سے نظریات ان نظاموں میں مل جائیں گے لیکن غور کیجئے تو وہ آفاقی نظریات سے زیادہ محض ایک مخصوص زاویہ فکر کی تبلیغ کے

آلۂ کار کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ انسان آج باوجود مادّی ترقی و آسودگیوں کے عروج کے، ذہنی انتشار، فکری کشمکش اور بدامنی کا شکار ہے اور ایک آفاقی، صلح اور عدل و انصاف پر مبنی طرزِ معاشرت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ دنیاوی نظاموں کے فکروعمل نے واضح کردیا کہ وہ انسان کے فطری جذبات یعنی خواہشات، تمنائیں، خودغرضیاں اور آزادی کو نہ کوئی صحیح سمت دے سکے اور نہ اس کی نگہداشت کرسکے۔ اگر وہ ان فطری جذبات کو اپنے نظریوں کی تبلیغ کا آلۂ کار بنانے کے بجائے، راہِ نما بنالیتے اور انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں اُترنے کا ذریعہ بناتے تو بہت ممکن تھا کہ ایک پُرامن انسانی معاشرے کی تشکیل میں کامیاب ہوجاتے۔

نہج البلاغہ: دائمی دستورِ حیات اور اعلیٰ اقدارِ بشریت کا سرچشمہ

نہج البلاغہ کے خطبات، وعظ و نصیحتیں، خطوط، اقوالِ انسانی فطرت اور نفسیات کی گہرائیوں میں اُتر کر انسان کی انہیں دو کمزوریوں کا محاسبہ کر رہے ہیں۔ حقیقتوں سے آگاہی، انتباہی طرزِ تخاطب نصیحتیں، نفسیاتی حربے، ماضی کی تاریخ اور فکر وعمل کی تعلیم کے ذریعہ آگاہ کیا جارہا ہے کہ دنیا کے مائل بہ فنا عناصر، اُن کی کشش، دنیا کی بے ثباتی، بے رحمی و بے رُخی اور اُسکی تمام حشر سامانیوں سے قلیل مدت کی زندگی کو محفوظ رکھتے ہوئے کس طرح باوقار و پُرامن زندگی گزار سکتا ہے اور یہ تعلیم اس لیے دی جارہی ہے کہ انسان اگر ہوس و خواہشات کا پتلا ہے، مفاد پرست اور خودغرض ہے، اس کے پیش نظر غیر دائمی مادّی لذت و راحت ہے، وہ ذاتی مفاد و مصلحت کو معیار بناتا ہے اور اسی کے تحت جدوجہد کرتا ہے تو دوسری طرف وہ صاحبِ عقل وفہم بھی ہے۔ اُس کے پاس روح بھی ہے جو اُس کے جذبات کی پاسبانی کرتی ہے۔ اس لیے جذبات و خیالات کو عقل وفہم کی کسوٹی پر پرکھنے کی طرف موڑ دیا جائے اور اس کے لئے روحانی عناصر کو توانا بنائے رکھا جائے تو یہی مستحکم دستورِ حیات مرتب کرنے کی بنیاد ہوگی جو پُرامن معاشرہ کی تشکیل کرے گا اور جہاں اعلیٰ انسانی اقدار نہ صرف فروغ پائیں گے بلکہ ان کا تحفظ بھی ہوگا۔

اسلام نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور نہج البلاغہ میں متعدد مقامات پر، تمام تر تفصیلات کے ساتھ، واضح کیا ہے کہ انسان خودغرض، حوس پرست اور لامتناہی خواہشات کا پُتلا ہے۔ ان جذبات کو فطری تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لیے نہ اُن کو روکا جاسکتا ہے نہ دبایا جاسکتا ہے اور نہ مٹایا جاسکتا ہے لیکن اُن کو آزاد بھی نہیں چھوڑا جاسکتا کیونکہ اُن کی یہی آزادی معاشرے کے انتشار اور بدامنی کا سبب

ہوتی ہے۔ اس کا واحد حل یہی ہے کہ اُن کو روحانی افکار و اخلاقی اقدار کی مکمل سرکردگی و سرپرستی میں رکھنے کی تاکید کی جائے تاکہ اُن کی سرکشی پر انکش لگا رہے۔

انسانی معاشرہ ذہنی سوجھ، بوجھ، احساسات، طبیعت و طینت، جسمانی طاقت اور رجحانات کے اعتبار سے مختلف درجات میں بٹے ہونے کے باوجود، خواہشات، امیدوں تمناؤں اور خودغرضیوں کے لحاظ سے مساوی ہیں۔ اس لیے ان میں بکھراؤ ٹکراؤ اور تضاد کا پایا جانا فطری ہے جس کا پورا فائدہ دنیاوی نظاموں نے اُٹھایا اور انسانی معاشرے کو محض مادی عناصر کا اسیر بنا کر پرامن معاشرے کا خواب دیکھا۔ یقیناً یہ ناقص اور ادھوری کوشش ہے۔ نہج البلاغہ میں ان مادّی و ظاہری عناصر کی بے لگام گرویدگی کی تباہ کاریوں سے انسان کو متنبہ کیا جارہا ہے اور اُن کو باطنی قوتوں کے زیرِ نگر رکھنے کی تعلیم دی جارہی ہے تاکہ اُن کی سرکشی معاشرہ کی تباہی کا سبب نہ بننے پائے۔

نہج البلاغہ میں فانی دنیا کی حقیقتوں کا آئینہ دکھلا کر انسان کی عقل وفہم کو جگائے رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ وہ غور وفکر کے ذریعہ محتاط و متوازن رُخ اختیار کرے۔ نہج البلاغہ کے خطبات، نصیحتیں، وعظ وخطوط قدم قدم پر انسانی معاشرہ کے بکھراؤ، ٹکراؤ اور تضاد کی تفصیلات پیش کرتے ہیں۔ وہ اس کے بچاؤ اور تحفظ کا راستہ بھی بتلا رہے ہیں۔ یہاں عالم انسانیت کو ایک لڑی میں پروتے ہوئے ایسے بلند ترین نقطہ کی طرف لے جایا جارہا ہے جس کے پرے انسانی عقل وفہم بے معنی ہوجاتی ہے۔ یہ بلند ترین نقطہ عالم بشریت کی بکھری و متضاد فکر کو متحد کرنے کا واحد مؤثر ذریعہ بنتا ہے۔ اسی نقطۂ اتحاد کا نام "توحید" ہے۔

اگر ہر انسان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوجائے کہ اس کائنات کا خالق ایک ہے، سب اُس خالق کے بندے ہیں، ہماری زندگی اور موت اُسی کے ہاتھ میں ہے، وہ ہمارے ہر ارادے، ہر نیت اور ہر عمل سے آگاہ ہے اور ہم کو اسی کے بموجب سزا و جزا دیتا ہے تو انسانوں کے درمیان سرکشانہ آزادی کے جذبہ پر انکش لگ جائے گا۔ پھر انسانوں کے درمیان ہر طرح کی تفریق کا جذبہ مٹ جائے گا اور یہی ذہنی ہم آہنگی معاشرے میں عدل و انصاف و مساوات کی بنیاد بنے گی۔

دوسری طرف اگر دُنیا کی بے ثباتی، بے رُخی، بے رحمی کا یقین ہوجائے، جیسا خطبات میں تمام تر نفسیاتی حربوں کے ساتھ انسانی ذہن کو جھنجھوڑا گیا ہے، تو پھر انسان دُنیا کو ایک "امتحان گاہ" اور "گزرگاہ" سے زیادہ اہمیت نہیں دے گا۔ دنیا کو محض "امتحان گاہ" اور "گزرگاہ" سمجھنے کا یقین اس بات کا اعتراف ہوگا کہ دنیا کی زندگی عارضی ہے جس کی گرویدگی منافع بخش نہیں ہے۔ اس دنیا کی زندگی کے بعد ایک دائمی زندگی کی طرف جانا ہے جہاں فانی دنیا کے فانی عناصر ساتھ نہیں دے سکتے۔

ہاں اس فانی دنیا سے اس دائمی دنیا کے لئے جو زادِ راہ ہیں وہ اس کے اعمالِ صالحہ ہیں جو دونوں دنیاؤں میں لافانی زندگی کی ضمانت بنتے ہیں۔ یہی یقین کامل دنیا کے عیش و طرب میں ملوث رہنے سے اسے روکتا ہے۔ اس کو حد سے تجاوز نہ کرنے اور اُن کا غلام نہ بننے کی ترغیب دیتا ہے۔ پھر دولت و ثروت سمیٹنے سے زیادہ تقسیم کا رُجحان تقویت پاتا ہے جو فلاحِ عام کا ذریعہ، مساوات کا سرچشمہ اور عدل و انصاف کا منبع بنتا ہے۔ یہی قناعت، توکل اور تطہیرِ نفس بے لگام خواہشات، تمناؤں، خودغرضیوں کو راہِ راست پر قائم رکھنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔

حضرت علیؑ نے اپنے خطبات، نصیحتوں، خطوط و تحریروں میں اس بات پر مختلف نوعیتوں سے زور دیا ہے کہ انسان کی بلندی، وقار اور شرف خواہشات کے ساتھ بہہ جانے میں نہیں بلکہ اعلیٰ قدروں کے لیے سعی و کوشش اور بلند مقصد کے لیے جدوجہد میں مضمر ہے۔ یہی تطہیرِ نفس اختیارات پر قابو پانا سکھاتی ہے اور یہی اختیارات پر قابو پالینا اصل آزادی ہے۔ یہ وہ راہ ہے جہاں انسانی تہذیب و معاشرت کا آغاز بندگی، ایمان و یقین سے ہوتا ہے اور نتیجہ میں انسان کُلیہ پابندیوں سے آزاد ہوجاتا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا:

"اسلام سرِ تسلیم خم کرنا ہے اور سرِ تسلیم جھکانا یقین ہے اور یقین تصدیق ہے اور تصدیق اعترافِ فرض کی بجا آوری ہے اور فرض کی بجا آوری عمل ہے..... جو عمل میں کوتاہی کرتا ہے وہ رنج و اندوہ میں مبتلا ہوتا ہے....."۔

پھر ایک خطبہ میں آگاہ کیا:

"اے لوگو! مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ دو باتوں کا ڈر ہے۔ ایک خواہشوں کی پیروی اور دوسرے اُمیدوں کا پھیلاؤ۔ خواہشوں کی پیروی حق سے روک دیتی ہے اور امیدوں کا پھیلاؤ آخرت کو بھلا دیتا ہے۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے اُس سے اتنا زادِ راہ لو جس سے کل اپنے نفسوں کو بچا سکو"۔

انسان چاہے جتنا صاحبِ دولت و ثروت والا ہوجائے، چاہے جتنی طاقت و قوت سمیٹ لے، چاہے جتنا صاحبِ اقتدار بن جائے وہ اپنی ہر خواہش، ہر آرزو اور ہر تمنا پوری کرنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ اگر انسان صاحبِ عقل و فہم ہے تو اس حقیقت کو تسلیم کر لے گا۔ کسی شخص نے حضرت علیؑ سے پوچھا کہ آپ نے خُدا کو کیسے پہچانا تو فرمایا: "میں نے خدا کو پہچانا ارادوں کے ٹوٹ جانے سے، نیتوں کے بدل جانے سے اور ہمتوں کے پست ہوجانے سے پھر فرمایا اللہ کی عظمت کا احساس کرو تاکہ تمہاری نظروں میں کائنات حقیر و پست ہوجائے"۔ انسانی جدوجہد کا سفر، ابھی اس عظمت کے

احساس کی ابتدائی منزلوں سے گزر رہا ہے لیکن یقین ہے تسخیرِ کائنات خُدا کی عظمت کا احساس کرا کر اُس کو حقیر و پست ضرور کرے گی۔ جو لوگ دنیا کی بے ثباتی، بے رُخی اور اپنے آخری انجام سے بے خبر مادی، عیش و طرب میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اُسی کو مقصدِ حیات سمجھتے ہیں وہ ''ایسے سواروں کے مانند ہیں جو سو رہے ہیں اور سفر جاری ہے''۔

انسانوں کے ذہنوں سے غفلت کا پردہ یوں اُٹھایا جا رہا ہے:

''میں تمہیں دنیا سے ڈراتا ہوں اس لیے کہ یہ بظاہر شیریں و خوش گوار، تر و تازہ و شاداب ہے۔ نفسانی خواہشیں اُس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ وہ جلد میسر آ جانے والی نعمتوں کی وجہ سے لوگوں کو محبوب ہے اور اپنی تھوڑی سی آرائشوں سے مشتاق بنا لیتی ہے''۔

لیکن ''وہ جھوٹی امیدوں سے سجی ہوئی ہے اور دھوکے اور فریب سے بنی سنوری ہے۔ نہ اُس کی مسرتیں دیرپا ہیں اور نہ اُس کی ناگہانی مصیبتوں سے مطمئن رہا جا سکتا ہے۔ جو شخص اس دنیا کا عیش و آرام پاتا ہے تو اس کے بعد اُس کے آنسو بھی بہتے ہیں اور جو شخص دنیا کی مسرتوں کا رخ دیکھتا ہے تو وہ مصیبتوں میں دھکیل کر اُس کو اپنی بے رخی بھی دکھلاتی ہے اور جس شخص پر راحت کے ہلکے ہلکے چھینٹے ڈالتی ہے، اس پر مصیبت و بلا کی دھواں دھار بارش بھی کرتی ہے..... اس کے کسی زاد راہ میں، سوائے تقویٰ کے بھلائی نہیں۔ جو شخص کم لیتا ہے، راحت کے سامان بڑھا لیتا ہے اور جو دنیا کو زیادہ سمیٹتا ہے وہ اپنے لیے تباہ کُن چیزوں کا اضافہ کر لیتا ہے''۔

پھر مشاہدات و ماضی کی تاریخ کا آئینہ دکھلا کر یوں فرمایا:

''کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جنھوں نے دنیا پر بھروسہ کیا اور اُس نے انہیں مصیبتوں میں ڈال دیا اور کتنے ہی اُس پر اطمینان کیے بیٹھے تھے جنھیں اُس نے پچھاڑ دیا اور کتنے ہی رعب و طنطنہ والے تھے جنھیں حقیر و پست بنا دیا اور کتنے نخوت و غرور والے تھے جنھیں ذلیل کر کے چھوڑا۔ اُس کی بادشاہی دست بدست منتقل ہونے والی ہے۔ اس کی سلطنت چھن جانے والی۔ اُس کا زبردست زیردست بننے والا، مال دار بدبختوں کا ستایا ہوا ہے۔

کیا تم انہیں سابقہ لوگوں کے گھروں میں نہیں بستے جو لمبی عمروں والے اور بڑے بڑے لاؤ لشکر والے تھے، وہ دنیا کی کس کس طرح پرستش کرتے رہے اور اُسے آخرت پر کیسا، کیسا ترجیح دیتے رہے۔ پھر کسی ایسے زادِ و راحلہ کے جو انہیں راستہ طے کر کے منزل تک پہنچائے چل دیئے، کیا تمہیں کبھی یہ خبر پہنچی ہے کہ دنیا نے ان کے بدلے میں کسی فدیہ کی پیشکش کی ہو یا انھیں کوئی مدد پہنچائی ہو

یا اچھی طرح اُن کے ساتھ رہی ہو..... تم نے دیکھا کہ جو ذرا دنیا کی طرف جھکا اور اُسے اختیار کیا اور اُس سے لپٹا تو اس نے اپنے تیور بدل کر اُن سے کیسی اجنبیت اختیار کرلی اور یہاں تک وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہوکر چل دیئے اور اُس نے بھوک کے سوا کچھ زادِ راہ نہ دی اور ایک تنگ جگہ کے سوا کوئی ٹھہرنے کا سامان نہ کیا اور سوائے گھُپ اندھیرے کے کوئی روشنی نہ دی اور ندامت کے سوا کوئی نتیجہ نہ دیا''۔

پھر سوال کیا: ''تو کیا تم اسی دنیا کو ترجیح دیتے ہو یا اُس پر مطمئن ہوگئے ہو..... اُن لوگوں سے عبرت حاصل کرو جو کہا کرتے تھے کہ ''ہم سے زیادہ قوت و طاقت میں کون ہے''۔ انہیں لاد کر قبروں تک پہنچایا گیا۔ اس طرح نہیں کہ اُنہیں سوار سمجھا جائے، انہیں قبروں میں اتار دیا گیا مگر وہ مہمان نہیں کہلائے، پتھروں سے اُن کی قبریں چن دی گئیں اور خاک کے کفن اُن پر ڈال دیئے گئے اور گلی سڑی ہڈیوں کو اُن کا ہمسایہ بنادیا گیا..... وہ بردبار بنے خاموش و بے خبر پڑے ہیں۔ اُن کے بغض و عناختم ہوگئے اور کیسے مٹ گئے۔ نہ اُن سے کسی ضرر کا اندیشہ ہے، نہ کسی تکلیف کے دور کرنے کی توقع ہے۔ جس طرح ننگے پیر و ننگے بدن پیدا ہوئے تھے ویسے ہی زمین میں پیوندِ خاک ہوگئے.....''۔

دنیا میں رہ کر انسان کس طرح کے مختلف و متضاد جذبات کا شکار رہتا ہے اس کی تصویر کشی دیکھئے۔ ان انکشافات کے آگے انسان کی طمع اور اُس کے غرور و تکبر کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ انسان اگر اس کا احساس کرلے تو یقیناً میانہ روی و اعتدال پسندی کو ہی اپنا شعار بنالے گا:

''اگر اُسے امید کی جھلک نظر آتی ہے تو طمع ذلت میں مبتلا کردیتی ہے اور طمع اُبھرتی ہے تو حرص تباہ و برباد کردیتی ہے۔ اگر نا امیدی اُس پر چھا جاتی ہے تو حسرت و اندوہ اُس کے لیے جان لیوا بن جاتے ہیں اور اگر اس پر غضب طاری ہوتا ہے تو غم و غصہ شدت اختیار کرلیتا ہے اور اگر خوش و خوشنود نظر آتا ہے تو حفظِ ماتقدم بھول جاتا ہے اور اگر اچانک اس پر خوف طاری ہوتا ہے تو فکر و اندیشہ دوسرے قسم کے تصورات سے روک دیتا ہے۔ اگر امن و امان کا دور دورہ ہوتا ہے تو غفلت اس پر قبضہ کرلیتی ہے اور اگر مال و دولت حاصل کرلیتا ہے تو دولتمندی اسے سرکش بنادیتی ہے اور اگر فقر و فاقہ کی تکلیف میں مبتلا ہو تو مصیبت اسے جکڑ لیتی ہے اور اگر بھوک اس پر غلبہ کرتی ہے تو ناتوانی اٹھنے نہیں دیتی اور اگر شکم پُری بڑھ جاتی ہے تو اذیت کا باعث ہوتی ہے۔ ہر کوتاہی اس کے لیے نقصان رساں اور حد سے زیادہ تباہ کن ہوتی ہے''۔

دنیا کی حقیقتوں کا آئینہ دکھلا کر بنی نوع انسانی کے عقل و فہم کو اس طرح جلا بخشی جارہی ہے: ''عقل

سے بڑھ کر کوئی مال سودمند نہیں اور خود بینی سے بڑھ کر کوئی تنہائی وحشتناک نہیں اور تدبیر سے بڑھ کر کوئی عقل کی بات نہیں اور کوئی بزرگی تقویٰ کے مثل نہیں اور خوش خلقی سے بڑھ کر کوئی ساتھی نہیں اور ادب کے مانند کوئی میراث نہیں۔ توفیق سے بڑھ کر کوئی پیشرو اور اعمال سے بڑھ کر کوئی تجارت نہیں..... تفکر و پیش بینی سے بڑھ کر کوئی علم نہیں اور ادائے فرائض کے مانند کوئی عبادت اور حیا و صبر سے بڑھ کر کوئی ایمان نہیں..... علم سے بڑھ کر کوئی عزت اور مشورہ سے مضبوط کوئی پشت پناہ نہیں"۔

حضرت علیؑ کمیل ابن زیاد نخعی کو تعلیم دے رہے ہیں:

"اے کمیل یاد رکھو! علم مال سے بہتر ہے کیونکہ علم تمہاری نگہداشت کرتا ہے جبکہ مال کی حفاظت تمہیں کرنی پڑتی ہے۔ مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے جب کہ علم صرف کرنے سے بڑھتا ہے۔ مال و دولت کے نتائج و اثرات مال کے فنا ہوجانے پر فنا ہوجاتے ہیں، علم کی شناسائی ایک دین ہے کہ اس سے انسان اپنی زندگی میں دوسروں سے اپنی اطاعت منواتا ہے اور مرنے کے بعد نیک نامی حاصل کرتا ہے۔ یاد رکھو علم حاکم ہے اور مال محکوم۔ اے کمیل! مال اکٹھا کرنے والے زندہ ہونے کے باوجود مردہ ہوتے ہیں اور علم حاصل کرنے والے رہتی دنیا تک باقی رہتے ہیں"۔

اب دستورِ حیات و معاشرتی اقدار کی تلقین اس طرح کی جارہی ہے۔ اپنے فرزند امام حسنؑ کو یوں تعلیم دے رہے ہیں:

"اے فرزند! میں نے تمہیں دنیا اور اُس کی حالت اور اُس کی بے ثباتی و ناپائیداری سے خبردار کردیا ہے اور آخرت والوں کے لیے جو سروسامانِ عشرت مہیا ہے اس سے بھی آگاہ کردیا"۔

اے فرزند! اپنے اور دوسرے کے درمیان ہر معاملہ میں اپنی ذات کو میزان قرار دو، جو اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے پسند کرو اور جو اپنے لیے نہیں چاہتے اُسے دوسروں کے لیے بھی نہ چاہو۔ جس طرح یہ چاہتے ہو کہ تم پر زیادتی نہ ہو، یوں ہی دوسروں پر بھی زیادتی نہ کرو اور جس طرح یہ چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ حُسن سلوک ہو، یوں ہی دوسروں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ..... دوسروں کے لیے وہ بات نہ کہو جو اپنے لیے سننا گوارہ نہیں کرتے"۔

"یاد رکھو! خود پسندی صحیح طریقہ کار کے خلاف اور عقل کی تباہی کا سبب ہے۔ روزی کمانے میں دوڑ دھوپ کرو اور دوسرے کے خزانچی نہ بنو..... دیکھو تمہارے سامنے ایک دشوار گزار اور دور دراز راستہ ہے جس کے لیے بہترین زاد کی تلاش اور بقدرِ کفایت توشہ فراہمی، سبکباری ضروری ہے۔ لہٰذا اپنی طاقت سے زیادہ اپنی پیٹھ پر بوجھ نہ لادو۔ تمہارے سامنے ایک دشوار گزار گھاٹی ہے جس میں ہلکا

پھلکا آدمی گراں بار آدمی سے کہیں اچھی حالت میں ہوگا.....''۔

''جو زیادہ بولتا ہے وہ بے معنی باتیں کرنے لگتا ہے۔ سوچ وچار سے قدم اُٹھانے والا صحیح راستہ دیکھ لیتا ہے۔ نیکوں سے میل جول رکھو گے تو تم بھی نیک ہوجاؤ گے، بروں سے بچے رہوگے تو ان کے اثرات سے بھی محفوظ رہو گے۔ جہاں نرمی سے کام لینا نامناسب ہو وہاں سخت گیری ہی نرمی ہے۔ کبھی کبھی دوا بیماری اور بیماری دوا بن جاتی ہے..... کبھی کبھی بدخواہ بھلائی کی راہ سوجھا دیا کرتا ہے اور دوست فریب دے جاتا ہے..... تجربوں کو محفوظ رکھنا عقلمندی ہے۔ بہترین تجربہ وہ ہے جو نصیحت دے.....''۔

''جب تک زمانہ کی سواری تمہارے قابو میں رہے، نباہ کرتے رہو۔ زیادہ کی امید میں اپنے کو خطروں میں نہ ڈالو، خبردار کہیں دشمنی وعناد کی سواریاں تم سے منھ زوری نہ کرنے لگیں.....''۔

''اپنے کو اپنے بھائی کے لیے اس پر آمادہ کرو کہ جب وہ دوستی توڑے تو تم اُسے جوڑو، وہ منھ پھیرے تو تم آگے بڑھو اور لطف و مہربانی سے پیش آؤ ..... وہ دوری اختیار کرے تو تم اس کے نزدیک ہونے کی کوشش کرو۔ وہ سختی کرتا رہے اور تم نرمی کرو..... مگر خبردار یہ برتاؤ بے محل نہ ہو اور نا اہل سے یہ رویہ اختیار نہ کرو۔ اپنے کسی دوست سے تعلقات قطع کرنا چاہو تو اپنے دل میں اتنی گنجائش رکھو کہ اگر اس کا رویہ بدلے تو اس کے لیے جگہ ہو''۔

''اے فرزند! یقین رکھو رزق دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کی تم جستجو کرتے ہو اور ایک وہ جو تمہاری جستجو میں ہے۔ اگر تم اُس کی طرف نہ بھی جاؤ تو وہ تم تک آ کے رہے گا۔ ضرورت پڑنے پر گڑگڑانا اور مطلب نکل جانے پر کج خلقی سے پیش آنا انتہائی بری عادت ہے۔ دنیا سے بس اتنا ہی اپنا سمجھو جس سے اپنی عقبیٰ کی منزل سنوار سکو۔ ٹوٹ پڑنے والے غم اور اندوہ کو صبر کی پختگی اور حُسن یقین سے دور کرو۔ جو درمیانی راستہ چھوڑ دیتا ہے وہ بے راہ ہوجاتا ہے۔ جو اپنی حیثیت سے آگے نہیں بڑھتا، اُس کی منزلت برقرار رہتی ہے''۔

پھر اپنے فرزند کو چار باتوں کی نصیحت کرکے گویا منشور حیات کا نچوڑ یوں پیش کیا:

''چار باتیں یاد رکھو۔ اُن کے ہوتے ہوئے جو کچھ کرو گے وہ تمہیں ضرر نہ پہنچائے گا۔ سب سے بڑی ثروت عقل و دانش ہے اور سب سے بڑی ناداری حماقت و بدعقلی ہے اور سب سے بڑی وحشت غرور وخود بینی ہے اور سب سے بڑا جوہر ذاتی حُسن اخلاق ہے''۔

اس حُسنِ سلوک کی وضاحت یوں کی: ''لوگوں سے اس طرح ملو کہ اگر مرجاؤ تو تم پر روئیں اور زندہ رہو تو تمہارے مشتاق رہیں''۔ پھر فرمایا: ''جو شخص اپنے قبیلے کی اعانت سے ہاتھ روک لیتا ہے تو

اس کا تو ایک ہاتھ رکتا ہے لیکن وقت پڑنے پر بہت سے ہاتھ اُس کی مدد کو رُک جاتے ہیں۔ اس لیے ''دوسروں کے پسماندگی سے بھلائی کرو تا کہ تمہارے پسماندگان پر بھی شفقت پڑے''۔

پھر حسن سلوک کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا: ''انصاف سے دوستوں میں اضافہ ہوتا ہے، لطف و کرم سے قدر و منزلت بڑھتی ہے، جھک کے ملنے سے نعمت تمام ہوتی ہے۔ دوسروں کا بوجھ بٹانے سے سرداری حاصل ہوتی ہے اور خوش گفتاری سے کینہ دور اور دشمن مغلوب ہوتا ہے اور سر پھرے آدمی کے مقابلہ بردباری سے اُس کے مقابلہ اپنے طرفدار زیادہ ہوجاتے ہیں''۔

انسانی معاشرے کا امن وسکون اور اعلیٰ اقدار کی نشو ونما و ان کا فروغ محض اس پر منحصر نہیں ہوتا کہ عوام کے کردار و اخلاق کو سنوارا جائے بلکہ حاکم کے کردار و اخلاق کے معیار بھی اسی قدر اہم ہیں۔ نہج البلاغہ کے مختلف خطبات و مکتوب حاکم کے معیار کو طے کر رہے ہیں۔ مالک اشتر کو مصر و اطراف کی حکومت سپرد کرتے وقت ایک طویل عہد نامہ حکومت کا دستورِ اساسی ہے جس میں حکومت کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتے ہوئے حاکم کے فرائض کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ عہدنامہ کافی طویل ہے جس کے حوالے و تشریح سے، مضمون کی کوتاہ دامنی کا لحاظ رکھتے ہوئے گریز کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ دیگر خطبات میں بھی حکومت کے دستور واضح کیے گئے ہیں۔ مثلاً ''محمد ابنِ ابی بکر کو جب مصر کی حکومت سپرد کی تو ہدایت دی: ''لوگوں سے تواضع کے ساتھ ملنا، اُن سے نرمی کا برتاؤ کرنا، کشادہ روی سے پیش آنا اور سب کو ایک نظر سے دیکھنا تا کہ بڑے لوگ تم سے اپنی ناحق طرفداری کی امید نہ رکھیں اور چھوٹے لوگ عدل و انصاف سے نا امید نہ ہوں۔ کیونکہ اے اللہ کے بندو! اللہ تمہارے چھوٹے، بڑے، کھلے، ڈھکے اعمال کی تم سے باز پرس کرے گا اور اُس کے بعد اگر وہ عذاب کرے تو یہ تمہارے خود ظلم کا نتیجہ ہے اور اگر وہ معاف کردے تو وہ اس کے کرم کا تقاضہ ہے''۔

حکمراں کے رعیت پر اور رعیت کے حکمراں پر کیا فرائض ہیں، صفین کے موقعہ پر ایک خطبہ میں یوں واضح کیے: ''.....چنانچہ رعیت اُسی وقت خوش حال رہ سکتی ہے جب حاکم کے طور طریقے درست ہوں اور حاکم بھی اسی وقت صلاح و درستگی سے آراستہ ہوسکتا ہے جب رعیت اُس کی انجام دہی کیلیے آمادہ ہو۔ جب رعیت فرمانروا کے حقوق پورے کرے اور فرمانروا رعیت کے حقوق سے عہدہ برا ہو تو اُن میں حق باوقار، دین کی راہیں استوار اور عدل و انصاف کے نشانات برقرار ہوجائیں گے..... اور زمانہ سدھر جائے گا''۔

''اور جب رعیت حاکم پر مسلط ہوجائے یا حاکم رعیت پر ظلم ڈھانے لگے تو اس موقعہ پر ہر بات میں اختلاف ہوگا۔ ظلم کے نشانات ابھر آئیں گے۔ دین میں مفسد بڑھ جائیں گے..... خواہشوں پر عمل

درآمد ہوگا..... نفسانی بیماریاں بڑھ جائیں گی اور بڑے سے بڑے حق کو ٹھکرا دینے اور بڑے سے بڑے باطل پر عمل پیرا ہونے سے بھی کوئی نہ گھبرائے گا۔ ایسے موقعہ پر نیکوکار ذلیل اور بدکردار باعزت ہوجاتے ہیں"۔

نہج البلاغہ میں دستورِ حیات اور اقدار بشریت کو قانونِ قدرت سے بندھے افاقی قوانین، ٹھوس و مدلل عقائد، فطرت و عقل و دانش کے حصار میں رکھ کر واضح کیا گیا ہے۔ یہاں بنی نوع انسانی کے لیے ایسا معتدل، متوازن اور دائمی نظام حیات پیش کیا گیا ہے جو اسی معاشرے کے پُرامن، پروقار اور بلند معیار زندگی کا ضامن ہے۔ نہج البلاغہ میں حیات انسانی کے دو اہم پہلوؤں کو دستورِ حیات کی بنیاد بنایا گیا۔ اول واقعیت (فطرت) اور دوسرا اخلاقیات۔ واقعیت سے مراد ایسے مقاصد حاصل کرنا ہے جو انسانی فطرت و ضمیر کے عین مطابق ہوں۔ فطری خواہشات کو عقل کی پاسبانی میں دے کر اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ کر جو مقصد حاصل کیا جائے گا وہی مستحسن ہوگا۔ نہج البلاغہ میں فطری خواہشات کو نہ دبایا گیا نہ روکا گیا اور نہ اُن کی اہمیت کو نظر انداز کیا گیا بلکہ اُن کے بھڑکنے اور وسیع ہونے کو دنیا کے مائل بہ فنا مادّی وسائل، اُن کی تمام تر سرکشی، بے ثباتی اور بے رخی کا آئینہ دکھلا کر عقل و دانش کے ذریعہ نتائج سے آگاہ کیا ہے۔ اخلاقیات کی بنیاد عقل و دانش کی سرکردگی میں عمل پیرا ہونے پر ٹکی ہے۔ اسی سرکردگی سے منہ موڑنے کا انجام بے لگام آزادی، بے راہ روی اور نتیجہ میں بے امنی ہے۔ دنیا کے نظامِ حیات انسانی کے مادّی پیکر میں محصور ہے اور اس کو متوازن رکھنے والے روحانی پیکر کو نظر انداز کردیا۔ نتیجتاً انسان کے ضمیر و اخلاق جیسے جذبوں کو کوئی قدر و منزلت نہ ملی۔ قدرت نے ان جذبوں کو مادّی و نفسانی جذبوں کی سرکشی کی نگہداشت کے لیے پیدا کیا۔ اس لئے ایک صالح، متوازن نظامِ حیات تو اسی وقت تشکیل پاسکتا ہے جب دونوں کو متوازن رکھا جائے۔ یعنی جہاں زندگی نہ اتنی آزاد ہو کہ بے راہ روی کی ڈگر پر بے لگام بڑھنے لگے اور امن و سکون کو خطرہ پیدا ہوجائے اور نہ احکاموں کی زنجیروں میں ایسی جکڑی بندھی ہو کہ گھٹن کا احساس پیدا ہوجائے اور انسان اُس کو اُتار پھینکنے پر مجبور ہوجائے۔ نہج البلاغہ میں معاشرے کے اسی توازن کو ایک ماڈل کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جہاں "عصمتِ بشری" اور "عصمتِ ملکی" دونوں اقدار بشیرت کو فروغ دے کر پُرامن معاشرے کی تشکیل دے رہے ہیں۔ آج دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک اور بین الاقوامی ادارے جس طور اور جس سنجیدگی سے انسانی معاشرے کے اخلاقی پہلوؤں پر غور کررہے ہیں اُن کی اہمیت کو تسلیم کررہے ہیں وہ اُن تمام عبرتناک نتائج کا ردِّ عمل ہے جو مادہ پرستی میں ڈوبنے کی بدولت سامنے آئے ہیں۔ جیسے جیسے دنیا مادہ پرستی کے تباہ کُن فسوں سے باہر آئے گی نہج البلاغہ کے ہی سائے میں عافیت پائے گی۔

منابع و مآخذ

نہج البلاغہ: مترجم علامہ مفتی جعفر حسین صاحب، عباس بک ایجنسی لکھنؤ ۲۰۰۰ء

خطبہ نمبر ۲۸ صفحہ ۱۵۶_۱۵۷

خطبہ نمبر ۳۳ صفحہ ۱۸۵

خطبہ نمبر ۱۰۹ صفحہ ۳۱۶_۳۱۹

عہد نامہ ۵۳ مالک اشتر نخعی کے نام صفحہ ۷۷۰ ۔ ۷۳۳

خطبہ ۲۴۳ صفحہ ۵۹۱_۵۹۲

مکتوب ۲۱ صفحہ ۶۶۷

مکتوب ۲۲ صفحہ ۶۶۸

عہد نامہ ۶۷ صفحہ ۶۷۶

وصیت نامہ ۳۱ صفحہ ۶۹۰_۷۱۰

حکم و اعظ ۳،۶ صفحہ ۸۰۳

حکم و اعظ ۷،۸ ۸۰۵

حکم و اعظ ۹ ۸۰۶

حکم و اعظ ۲۰ ۸۰۹

حکم و اعظ ۱۰۸ ۸۳۲

حکم و اعظ ۱۱۳ ۸۳۸

حکم و اعظ ۱۳۷ ۸۵۰_۸۵۱

۱- سابق پروفیسر معاشیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۔ ۲۵

2- Nahju-Balagha A Peak of Eloquence - Translated By S.Ali Raza, Islamic Foundation Press Areekoda Kerala 1990

3- Kitabul Irshad - Shaikh Al Mufid, Translated by I.K.A. Harward, University of Edin Burgh, Ansariyan Publication, Qum, Iran

4- Philosophy of Islam- Behechti - Bahonar, Ansariyan Publication Iran 1990

۵- آج کا انسان اور اجتماعی مشکلات۔ علامہ سید محمد باقر الصدر طاب ثراہ مترجم علامہ سید ذیشان حیدر جوادی

۶- عقل و دل۔ شہید مرتضیٰ مطہری۔ توحید۔ جلد ۲، نومبر، دسمبر ۱۹۹۳ء

۷- دانش مسلمین (قسط ۲) محمد رضا حکیمی توحید، جلد ۲ نومبر، دسمبر ۱۹۹۳

۸- حقائق بجائے لازوال (عرفان و عمل)، قمر امام، کلاسک آرٹ پریس، چاندنی محل، دہلی ۲۰۰۳ء

پیغمبرؐ اسلام کا آخری خطبہ
اور
انسانی حقوق کا عالمی منشور

نفیس احمد

انسانی حقوق کے لئے جدوجہد خودنسل انسانی کی طرح قدیم ہے۔ عظیم قانون ساز اور سماجی مصلح جنھیں سماج میں قدر و وقار حاصل تھا، سماج کے افراد کا طاقتوروں کے ظلم و تشدد سے تحفظ کرتے رہے ہیں۔ عظیم مذاہب کے پیغمبر اور مذہبی پیشوا تشدد اور جبر کے خلاف آواز اٹھاتے رہے ہیں اور انسان کی قدر و قیمت اور اسکے وقار کی اہمیت پر زور دیتے رہے ہیں۔

ہندو مذہب نے بادشاہ کو اس کی ذمہ داریاں یاد دلائیں اور "ساری دنیا کو ایک کنبہ" بتایا ہے۔ چین میں Mencius نے اس بات پر اصرار کیا کہ انسان دنیا میں اہم ترین عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اموس سے مسیح تک مسیحی اور یہودی روایات میں اس بات پر زیادہ اصرار کیا جاتا رہا ہے کہ سماج انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کا پاس رکھے۔ یونان کے دورِ عظیم میں برابری، سب کا یکساں احترام اور اظہار خیال کی آزادی قانوناً عوام کے حقوق میں شامل تھے۔ لیکن یہ حقوق سماج کے ایک بڑے طبقہ کے غلاموں پر لاگو نہیں ہوتے تھے۔ روم نے اپنے شہریوں کے لئے یکساں حقوق کو جاری کیا۔ اس کے معروف رواقی فلسفیوں Cicero اور Senaca نے قانونی روایت سے ایک قدم آگے بڑھایا اور اعلان کیا کہ تمام انسان طبیعی طور پر آزاد ہیں۔

بنیادی آزادی اور حقوق انسانی کے جدید تصورات، جمہوری سماج کی تشکیل کے طویل دور میں متشکل ہوئے ہیں۔ ان کی جڑیں پیغمبر اسلامؐ کے دس ہجری کے آخری خطبے، ۱۲۱۵ کو میگنا کارٹا Megna Carta، ۱۶۷۹ کے Habeas Corpus Act (ملزمین پر باقاعدہ مقدمہ چلانے کے لیے عدالت میں پیش کرنے کا حکم) ۱۶۸۹ کے Bill of Rights (قانون حقوق) میں پیوست ہیں۔ ۱۷۷۶ میں امریکا کی آزادی کا منشور، ۱۷۸۹ میں فرانس کے حقوق انسانی کا اعلان، حقوق انسانی کے شاہراہ کے وہ سنگ میل ہیں جن میں فرد کو بادشاہوں کے من مانے احکام سے نجات اور آزاد

سماج میں آزاد زندگی گزارنے کا حق حاصل ہوا۔

اسلامی روایات کے بموجب ہر فرد بھائی چارہ سے رہنے، عدل و انصاف، زندگی کے تحفظ، سلامتی، آزادی و احترام کے حق کا دعویدار ہو سکتا ہے وجہ یہ ہے کہ انسان خدا کی اشرف المخلوقات تخلیق ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور پیغمبر اسلامؐ کے آخری خطبہ پر مبنی ہے۔ یہ خطبہ درج ذیل ہے:

۱- تمہید

تقریباً ۱۴۲۱ سال قبل پیغمبر اسلامؐ نے ۶۳ برس کی عمر میں، ان سماجی زندگی کی اقدار کو آخری شکل دی جن کی تعلیم خود مذہب اسلام نے دی تھی اور آپ اس کے داعی تھے۔ یہ کام انجام دینے کے لئے آپ نے عرب کے تمام حصّوں سے لوگوں کو حج بیت اللہ میں شرکت کی دعوت دی۔

ایک اندازہ کے مطابق ۱۱۴۰۰۰ افراد نے اس سال حج ادا کیا اور پیغمبر اسلامؐ کا آخری خطبہ سنا۔ آپ نے عام انسانوں کو مخاطب کیا صرف مسلمانوں کو نہیں۔ اس طرح یہ پہلا انسانی حقوق کا منشور ٹھہرا۔ اس میں صرف نظریاتی عقاید سے بحث نہیں کی گئی بلکہ اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کے طریقے بھی بیان کئے گئے۔ پیغمبر اسلامؐ کا یہ خطبہ آپ کے عظیم مشن کے اصل مقصد کا خلاصہ ہے جسے اب آخری شکل دی گئی۔ اور اس کے اہم نکات کو آپ کے پرخلوص پیروکاروں کے ذہن و دماغ پر مرتسم کر دیا گیا تاکہ وہ ہمیشہ اسلام کے بتائے ہوئے زندگی کی اقدار کے نظام کو مدنظر رکھیں۔

۲- برابری اور بھائی چارہ

سب آدم کی اولاد ہیں اور تم نے ایک آدمی اور ایک عورت سے جنم لیا ہے۔ کسی عرب کو غیر عرب اور کسی غیر عرب کو عرب پر فوقیت حاصل نہیں۔ کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر ترجیح حاصل نہیں۔ تم قبیلوں اور قوموں میں اس لیے تقسیم کیے گئے ہو کہ تمہیں پہچانا جا سکے۔ غلاموں کے سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ تمہارے خدمتگار تمہاری خدمت بجالاتے ہیں، جو کچھ تم کھاؤ انہیں بھی کھلاؤ، جو کچھ تم پہنو اسی قسم کا لباس انہیں بھی پہناؤ۔ تم سب آپس میں بھائی بھائی ہو۔

۳- عورتوں کے حقوق

تم عورتوں سے اچھا برتاؤ کرو۔ تم ان کے محافظ ہو، تمہیں خدا سے ڈرنا چاہیے۔ عورتیں تمہاری حفاظت میں ہیں اور تم نے انہیں خدا سے مانگا ہے۔ یہ عورتیں خدا کے بنائے ہوئے مقدس طریقے کی رو سے

تمہارے لیے جائز ہیں۔ تمہارے ان پر حقوق ہیں اور وہ بھی تم پر کچھ حقوق رکھتی ہیں۔ انہیں تمہارے حقوق کی حفاظت کرنی ہے۔ انہیں تمہارے املاک کا غلط استعمال نہیں کرنا چاہیے اور بدشرمی کا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے، تمہیں عورتوں سے ایسا برتاؤ کرنا چاہیے جیسے وہ تمہاری مددگار ہیں۔

۴- جرم یعنی قانون کی خلاف ورزی

خبردار! صرف جرم کا مرتکب ہی اس کا ذمہ دار ہے۔ اولاد کے جرم کا ذمہ دار اس کے والدین نہیں۔

۵- جبر و تشدد

دوسروں پر ظلم و زیادتی نہ کرو۔ ایک دوسرے کی گردن مت مارو۔ خبردار! دور جاہلیت کے تمام دستور اب میرے پیروں تلے ہیں۔ دور جہالت کے ''خون کے بدلے خون'' کا طریقہ اب منسوخ ہے۔

۶- وراثت و ملکیت کے حقوق

اے لوگو! صاحب قدرت اور قابلِ احترام خدا نے سب کو (وراثت سے) اس کا واجب حصہ مقرر کیا ہے۔ تمام قرضے لازمی طور پر ادا کیے جائیں، قرض پر لی گئی املاک واپس کی جائیں، تحفے تحائف کا لین دین ہو۔ امین لازمی طور پر صاحب املاک کے خسارے کا جبران کرے۔

۷- ضمیر و تہذیب کی آزادی

مذہبی امور کے معاملے میں طے شدہ حدود سے تجاوز کے سلسلے میں خبردار رہو، اس لیے کہ یہ مذہبی امور میں تجاوز کی وجہ ہے کہ تم سے پہلے کے لوگ برباد ہوئے۔ پیغمبر اسلامؐ وہاں جمع ہونے والے مسلمانوں کو خطاب فرما رہے تھے، اس لیے آپ نے فرمایا: درحقیقت میں نے تمہارے درمیان دو ایسی بھاری بھرکم چیزیں چھوڑی ہیں جو تمہیں ہمیشہ بے راہ روی سے محفوظ رکھیں گی۔ ایک اللہ کی کتاب (قرآن) اور دوسری میرے اہل بیت انہیں مضبوطی سے پکڑے رہو کہ یہ ہمیشہ تمہیں بے راہ رو ہونے سے بچائیں گی۔

۸- ان حقوق کی مزید تفصیل

جو یہاں موجود ہیں وہ انہیں جو یہاں موجود نہیں یہ امور بتادیں اس لیے کہ جو یہاں حاضر نہیں وہ یہاں موجود لوگوں سے زیادہ اس پیغام کا پاس رکھیں گے۔

پیغمبر اسلامؐ کا یہ خطبہ نہ صرف اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے قابل توجہ ہے بلکہ اس میں تمام عالم انسانیت کے لیے ایک اعلیٰ پیغام پوشیدہ ہے۔ دنیا اب تک اخلاق وحسن عمل کے ان سے بہتر اصول پیش نہیں کر سکی جو اس خطبے میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے ہر لفظ سے عالی ہمتی کی روح بولتی ہے اور اس کا مقصد حق وصداقت پر مبنی حکومت قائم کرنا اور انسانوں میں عملی طور پر عادلانہ رویّے کی تبلیغ کرنا ہے۔ یہ خطبہ نہ صرف مسلمانوں میں بھائی چارے کو بڑھاوا دیتا ہے بلکہ جغرافیائی، نسلی اور رنگ روپ کے اختلافات کے لحاظ کے بغیر تمام انسانوں کو اس کی دعوت دیتا ہے۔ یہ خطبہ ایک ایسے سماجی نظام کا خاکہ پیش کرتا ہے جو مکمل طور پر ظلم وستم اور ناانصافی سے آزاد ہو۔

پیغمبر اسلامؐ کے اس خطبے کی گونج انسانی حقوق کے عالمی منشور میں بھی سنائی دیتی ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور

۱۔ تمہید

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اپنے منشور کی دفعہ ۵۵، ۵۶، ۶۲، ۶۸، ۷۶ کے تحت انسانی حقوق کے عالمی منشور کا اعلان کیا۔ ۴۸ ملکوں نے اس کے حق میں رائے دی۔ سوویت یونین، اکرین، چیکو سلاواکیا، پولینڈ، یوگوسلاویا، جنوبی افریقا اور سعودی عربیہ نے اس کارروائی میں شرکت نہیں کی۔

اگرچہ اس اعلان کو قانون کی حیثیت حاصل نہیں پھر بھی اسے اقوام متحدہ کا قانون ہی سمجھا جاتا ہے اور اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی عدالت اس سے روشنی حاصل کرتی ہے اور جنرل اسمبلی بھی قانون لاگو کرنے میں اسی سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ اس اعلان میں تین دفعات ہیں۔ یہ حقوق انسانی کے سب سے پہلے منشور پر منحصر ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے حجاج بیت اللہ الحرام کو خطاب کرتے ہوئے جاری کیا تھا اور جس کے اہم حصوں کا خلاصہ اوپر پیش کیا گیا ہے، اقوام متحدہ کا تعلق ملکوں اور قوموں سے ہے جب کہ عالمی منشور افراد کے لئے ہے۔

۲۔ برابری اور بھائی چارہ

حقوق انسانی کے عالمی منشور کی دفعات ۱، ۲، ۳، ۴ اور ۷ میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ انسان آپس میں برابر ہیں اور ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ مزید برآں یہ بھی کہا گیا ہے کہ نسل، رنگ، جنس،

زبان، قومیت یا جائے پیدائش کی بناء پر کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ سب انسان برابر کے حقوق کے حامل ہوں گے۔ کوئی غلام نہیں ہوگا۔ غلاموں کی تجارت پر پابندی لگادی گئی ہے۔

۳- عورتوں کے حقوق

ہر بالغ عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ نسل وقومیت اور مذہب کے لحاظ کے بغیر شادی کر سکے۔ انہیں شادی کے بعد حتیٰ طلاق کے معاملے میں بھی برابر کے حقوق حاصل ہوں گے (دفعہ ۱۶)

۴- جرم/غیر قانونی الزام

اس منشور کی دفعہ گیارہ کے مطابق جو بھی کوئی تعزیری جرم کا مرتکب ہوگا، قانون کی رو سے جب تک اس کا جرم ثابت نہ ہو جائے، وہ بے قصور سمجھا جائے گا۔ یہ مقدمہ کھلی عدالت میں چلایا جائے گا اور ہر شخص کو اپنے دفاع کے لئے ہر قسم کا تحفظ حاصل ہوگا۔

۵- جبر وتشدد

مذکورہ منشور کی دفعہ پانچ میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ کسی کو بھی تشدد یا غیر انسانی روسے، ظلم اور برے برتاؤ یا سزا کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

۶- وراثت وملکیت کے حقوق

مذکورہ منشور کی دفعہ سترہ میں وضاحت کی گئی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ یا دوسروں کے ساتھ املاک رکھنے کا حقدار ہوگا۔ کسی کو یک طرفہ طور پر اس کی املاک سے محروم نہیں کیا جانا چاہیے۔

۷- ضمیر وتہذیب کی آزادی

منشور کی دفعہ ۱۸ میں یہ کہا گیا ہے کہ ہر کسی کو اپنے ضمیر کے مطابق کسی بھی مذہب اور تہذیب کا علمبردار ہونے کا حق ہے۔ ہر کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کے اخلاقی اور مادّی منافع کی حفاظت کی جائے۔

۸- مزید تفصیلات

سماج کی روز افزوں ترقی کے پیش نظر بعض دوسری تفصیلات بھی حقوق انسانی کے عالمی منشور میں شامل کردی گئی ہیں مثلاً بچوں کی تعلیم، یکساں کام کے لئے برابر اجرت، انجمنیں بنانے اور تجارتی تنظیمیں بنانے کی آزادی وغیرہ۔

امیرالمومنین کے سیاسی افکار نہج البلاغہ کی روشنی میں

رضا عباس علوی

نہج البلاغہ کا بیشتر حصہ امیرالمؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی حیات طیبہ کے اس دور سے متعلق ہے جس میں آپ بظاہر خلیفہ وقت کی حیثیت سے امت مسلمہ کے نظم ونسق کے ذمہ دار تھے اور اسلامی سیاست کو اس کے حقیقی مفہوم سے نزدیک تر کرنے کی سعی پیہم کر رہے تھے۔ آپ نے تمام خطبات اور مکتوبات میں عرفانی اور الٰہیاتی مباحث کے بعد سماجی اور سیاسی، مسائل پر سب سے زیادہ اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ آپ نے اپنے خطبات اور نہج البلاغہ میں اپنے ارشادات کے ذریعہ اسلامی سیاست کے نقوش اس قدر واضح کردیئے ہیں کسی شک وشبہہ یا ابہام کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

امیرالمؤنین کے سیاسی افکار نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر قوموں کو بھی حیرت میں ڈال دیتے ہیں صرف مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ دیگر قوموں میں انھیں بلند اسلامی اقدار یعنی عدل، مساوات اور اجتماعی آزادی کا عکس نظر آتا ہے جنھوں نے جزیرہ نمائے عرب میں عظیم ترین فکری اور ثقافتی انقلاب برپا کیا۔ امیرالمومنین حضرت علیؑ بذات خود اسلامی اقدار کی ایک جیتی جاگتی تصویر اور قرآنی تعلیمات کا ایک عملی مجسمہ تھے اسی لئے آپ کے تمام سماجی، اخلاقی اور سیاسی افکار قرآنی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اپنے پانچ سالہ مختصر دور حکومت کے دوران جو مخالفین کی شر انگیزیوں سے بھرا ہوا تھا، امیرالمومنین نے پوری شدت کے ساتھ عدل الٰہی کے سیاسی نقوش اجاگر کردیئے ہیں۔ حکومت کو کن صورتوں میں قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے؟ اسلامی سیاست کی روشنی میں حکام اور رہبروں کی خصوصیات کیا ہیں؟ حکومت اسلامی کے ارکان کس طرح کے ہونے چاہئیں؟ حکومت اور عوام کے درمیان کیسا ربط ہونا چاہئے؟ حکومت اور عوام کے باہمی حقوق کیا ہیں؟ اسلام کے سیاسی نظام میں عدل کی کیا اہمیت ہے؟ یہ وہ موضوعات ہیں جن پر امیرالمومنین نے اپنے خطبات میں بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے اور اسلامی سیاست کے حدود اربعہ کا تعین کیا ہے۔

کلام امیرالمومنینؑ کے ذریعہ ایک غیر متعصب قاری کو اسلامی طرز حکومت کا پورا اندازہ ہوجاتا ہے اور اس پروپیگنڈے کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ اسلام میں سیاست تابع دین ہے، دین تابع سیاست نہیں۔ امیرالمومنینؑ کے مقابلے میں صف آرا ہونے والی حکومت شام کے نزدیک سیاسی مفاد کے سامنے کسی انسانی اور خدائی قانون کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ایسی بے دین حکومت کی موجودگی سے امیرالمومنین کی اصول پسندی اور الٰہی سیاست کے نقوش اور زیادہ ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

سیاست کی تعریف اور حاکم کی ضرورت

قدیم و جدید ماہرین علم سیاست کے مطابق سیاست کے اصل معنیٰ معاشرے کا نظم ونسق ہے۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں معاشرے کا نظم ونسق اور اس کے اجتماعی نظام کی دیکھ بھال کا مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس سلسلے میں بہت وسیع پیمانے پر نہ صرف بحث کی گئی ہے بلکہ بڑی محنت و کاوش کے ساتھ ایک خصوصی دستور العمل بھی تیار کیا گیا ہے۔ دنیا میں قدیم زمانے سے آج تک معاشرے کے نظم ونسق کے لئے مختلف سیاسی نظام رائج رہے ہیں جس میں حاکم کی ایک کلیدی حیثیت رہی ہے۔ امیرالمومنین حضرت علیؑ نے بھی نہج البلاغہ میں متعدد مقامات پر معاشرے کے انتظامی امور کے لئے ایک حاکم کی ضرورت کا ذکر کیا ہے:

''حضرت علی علیہ السلام نے خوارج کا قول (حکم صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے) سنا تو فرمایا: یہ جملہ تو صحیح ہے مگر اس سے باطل مراد لیا گیا ہے۔ ہاں بے شک حکم اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے، لیکن یہ لوگ تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حکومت بھی صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔ جبکہ لوگوں کے لئے ایک حاکم بہرحال ضروری ہے۔ خواہ وہ اچھا ہو یا برا (اگر حاکم اچھا ہوگا تو) مومن اس کی حکومت میں آزادی سے اپنے فرائض پر عمل کرسکے گا۔ اور اگر (برا ہوگا تو) کافر اس کے عہد میں لذتوں سے بہرہ اندوز ہوگا اور اللہ اس نظام حکومت میں ہر چیز کو اس کی آخری حدوں تک پہنچا دے گا اسی حاکم کی وجہ سے مال جمع ہوتا ہے، دشمن سے جنگ کی جاتی ہے، راستے پر امن رہتے ہیں اور قوی سے کمزور کا حق دلایا جاتا ہے یہاں تک کہ نیک حاکم مرکے راحت پائے اور برے حاکم کے مرنے پر دوسروں کو راحت پہنچے''۔ (خطبہ ۴۰)

ان سطور سے واضح ہے کہ امیرالمومنینؑ حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں امت اور معاشرے کے انتظامی امور کو سنبھالنے کے لئے ایک حاکم کا ہونا ناگزیر ہے جس کی غیر موجودگی سے سماج میں بدامنی اور انتشار کا خطرہ لاحق ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے سے پہلی خلافتوں کو حق بجانب نہ سمجھتے ہوئے

بھی امیرالمومنینؑ نازک وقت میں امت مسلمہ کے مفاد کی خاطر خلیفۂ وقت کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ آپ نے ہر مشکل وقت میں خلفاء کو انتہائی مفید مشورے دیئے یہاں تک کہ خلیفہ ثانی نے ایک موقع پر کہا کہ اے اللہ مجھ پر کوئی مشکل ایسی نہ ڈالنا جس کے حل کے لئے ابوالحسن موجود نہ ہوں۔

امام علی علیہ السلام کے کلام کے مطابق حاکمیت مطلقہ تو صرف خالق کائنات کے لئے ہے، مگر قانون اور اس کے نفاذ، امر و نہی اور معاشرے کی کلی سیاست کی تشکیل کے لئے ایک سربراہی، سرپرستی اور رہبری کا ہونا ضروری ہے اور کوئی معاشرہ اس سے بے نیاز نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی بھی معاشرہ بغیر رہبر کے اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتا۔ امام حضرت علی علیہ السلام کے مطابق رہبری ایسی ہونی چاہئے جو معاشرے میں امن و امان قائم کرے، مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کی سرکوبی کرے، مختلف ٹیکسوں کے ذریعہ مال جمع کرے اور اسے رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کرے اسی کے ساتھ وہ معاشرے کے افراد میں اتنی شجاعت و توانائی پیدا کرے تاکہ دشمن ان کی جانب آنکھ نہ اٹھا سکیں۔ اس کے ساتھ آپؑ فرماتے ہیں کہ نیک حاکم وہ ہے جسے مرنے کے بعد ہی راحت میسر ہوتی ہے جب کہ برے حاکم کے مرنے پر عوام راحت کا احساس کرتے ہیں۔ امیرالمومنین کے مطابق نیک حاکم خداوند عالم کے نزدیک عظیم جزاء کا حقدار ہوتا ہے جبکہ برا حاکم بدترین عذاب کا۔ اسی بات کی جانب آپ نے ایک مقام پر اشارہ فرمایا ہے "آگاہ رہو کہ اللہ کے بندوں میں اس کے نزدیک سب سے افضل وہ حاکم عادل ہے جو خود ہدایت یافتہ ہو اور دوسروں کی ہدایت بھی کرے۔ بہترین اور معروف سنتوں کو زندہ اور مستحکم کرے اور بدعتوں کو دفن کرے۔ اور اللہ کے نزدیک لوگوں میں سب سے بدتر وہ ظالم حکمراں ہے جو بذات خود گمراہی میں پڑا رہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے، رسولؐ سے حاصل کی ہوئی سنتوں کو تباہ و برباد کرے اور متروک بدعتوں کو پھر سے زندہ کرے۔

میں نے رسولؐ اللہ سے سنا ہے کہ قیامت کے دن ظالم حاکم کو اس طرح لایا جائے گا کہ نہ اس کا کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی عذر خواہ۔ اسے سیدھے جہنم میں ڈھکیل دیا جائے گا اور وہ اس میں اس طرح چکر کھائے گا جس طرح چکی گھومتی ہے پھر اسے جہنم کی گہرائی میں ڈال دیا جائے گا۔ (خطبہ ۱۶۳)

اسلامی اور دنیاوی سیاستوں کا فرق

موجودہ دور میں لفظ "سیاست" اور "سیاست داں" اپنے اصل معنی کھو چکے ہیں اور سردست لفظ سیاست کو مکر و فریب، جعل سازی، خود پسندی اور ابن الوقتی کا مترادف سمجھا جانے لگا ہے مگر حقیقی بات

یہ ہے کہ ''سیاست'' کا یہ کریہہ مفہوم کوئی آج کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ دور قدیم ہی سے اہل حکومت و اہل سیاست نے جس طرح عوام الناس کے مفاد اور حقوق کو پامال کیا اور انھیں مسلسل خون سے نہلایا اس سے تاریخ کی کتابیں بھری ہیں۔ حکومتوں نے ہمیشہ سے عوام کو اپنے ظلم اور قتل و غارت گری کا نشانہ بنایا اور ان پر مشکلوں کے ایسے پہاڑ توڑے جنھیں لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ تاریخ نے یہ منظر دنیا کے ہر خطے میں دیکھا کہ ایک مرتبہ تختِ اقتدار تک پہنچنے کے بعد حاکموں نے رعایا کے تمام حقوق کو درکنار رکھتے ہوئے ہوسناکی، شہوت پرستی اور درندگی کا ایسا بازار گرم کیا جس کا خاتمہ ان کی زندگی کے ساتھ ہی ہوا۔ ایک جملے میں اگر کہا جائے تو دنیاوی سیاست ''کسی بھی ذریعہ سے اقتدار کا حصول اور اس سے لطف اندوز ہونے'' سے عبارت ہے۔ تاریخ کے بڑے بڑے ماہرین سیاست جیسے ''چانکیہ'' اور ''میکاولی'' نے بھی سیاست کا یہی نسخہ حاکم وقت کے لئے تجویز کیا ہے اور اگر کوئی اس پر عمل نہ کرے تو سیاست کے لئے نااہل، بیوقوف اور بدھو سمجھا جاتا ہے سیاست کے اسی پست معیار کے تحت بعض مورخین نے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کو ناکام اور امیر شام معاویہ ابن ابوسفیان کی حکومت کو کامیاب قرار دیا ہے!

امیرالمومنین، جن کی شخصیت کا خمیر الٰہی پیغامات اور پیغمبر اسلامؐ کی بلند و بالا اخلاقی تعلیمات سے تیار ہوا تھا، اس مکروفریب اور غداری پر مبنی سیاست کے روادار کیسے ہوسکتے تھے جبکہ یہ چیزیں خود آپؑ ہی کے قول کے مطابق انسان کو کفر کی سرحد تک کھینچ لے جاتی ہیں۔ امیرالمومنینؑ کا آئینِ سیاست الٰہی مکتب فکر، علم و عرفان، انسانی فضائل و کمالات پر استوار تھا۔ امیرالمومنین کی سیاسی روش بشری فضل و کمال کی ایسی راہ معین کرتی تھی، جو تاریخ سیاست میں عالم انسانیت کے لئے ایک معیار و نمونہ بن جائے۔ اپنی اسی روش پر چلتے ہوئے امام حضرت علی علیہ السلام بڑی سے بڑی قربانی کیلئے بھی ہمیشہ تیار رہے۔ آپ نے ہمیشہ اپنی حکومت کو سیاسی بازی گری اور شخصی مصلحت پسندی سے اوپر رکھا اور اپنے پست مخالفین کو سیاسی اور شخصی مصلحت انگیزی سے اوپر رکھا اور اپنے پست مخالفین کے مقابلے کے لئے بھی اپنے معیار سے نیچے اترنے پر ہرگز تیار نہ ہوئے۔ ایک مقام پر آپ نے ارشاد فرمایا:

''خدا کی قسم معاویہ مجھ سے زیادہ چالاک (زیرک) نہیں، لیکن وہ مکروفریب اور فسق و فجور سے کام لیتا ہے اور اگر مجھے مکروفریب سے نفرت نہ ہوتی تو میں لوگوں میں سب سے زیادہ چالاک ہوتا لیکن ہر طرح کا مکروفریب ایک فاجرانہ عمل ہے اور ہر فاجرانہ عمل قیامت میں ہر ایک فریب کار کے لئے ایک

علامت اور پرچم ہوگا جس سے وہ پہچانا جائے گا۔ خدا کی قسم مجھے عیاری اور فریب کے ذریعہ غفلت میں نہیں ڈالا جاسکتا اور نہ حالات کی سختیوں سے دبایا جاسکتا ہے"۔ (خطبہ ۲۰۰)

ایک دوسرے مقام پر آپ نے ارشاد فرمایا:

"تم لوگ مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ ملت پر ظلم وستم کرکے فتح وکامرانی کی راہ تلاش کروں؟ خدا کی قسم جب تک ایک ستارہ دوسرے ستارے کے پیچھے چل رہا ہے میں اس کام کے قریب بھی نہ جاؤں گا"۔ (خطبہ ۱۲۶)

ایک سوال کا جواب

جس وقت امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ پر مسلمانوں نے بیعت کی اور آپ نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اس کے فوراً ہی بعد آپ نے معاویہ ابن ابوسفیان کو شام کی گورنری سے معزول کردیا جبکہ آپ کے کچھ مشیروں نے یہ مشورہ دیا کہ آپ معاویہ کو معزول کرنے میں عجلت سے کام نہ لیں جس نے ملک شام میں بیس برسوں سے اپنے پیر جما رکھے ہیں بلکہ ابھی چند دن توقف کرکے اپنی حکومت اور طاقت کو مضبوط کریں اس کے بعد آپ بے شک معاویہ کو معزول کردیں۔ یہ بے شک آپ کے اصحاب کا ایک مخلصانہ مشورہ تھا۔ ہر عقلمند انسان یہاں پر یہی سوچے گا کہ سیاست اور مصلحت کا تقاضہ یہی ہے کہ امامؑ کچھ دنوں تک معاویہ سے تعرض نہ کریں مگر امر واقعہ یہ ہے کہ امام نے اپنے اصحاب کا یہ مشورہ قبول کرنے سے انکار کردیا جس کے نتیجے میں جنگ صفین رونما ہوئی۔ یہاں سے اس بحث کا آغاز ہوتا ہے کہ اگر امیرالمومنینؑ کچھ دن رک کر اپنی طاقت اور قوت میں مزید اضافہ کرنے کے بعد حاکم شام کو معزول کرتے تو کیا یہ امت کے مفاد میں نہ ہوتا؟ کیا باطل کو ہمیشہ کے لئے نیست ونابود کرنے کے لئے اسے کچھ دن اور برداشت نہیں کیا جاسکتا؟ یہ وہ سوال ہے جو دنیوی اہل سیاست اور مخلص دیندار دونوں طبقوں کی جانب سے پوچھا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ امیرالمومنینؑ کے عمل کو اس وقت تک نہیں سمجھا جاسکتا جب تک اسلامی سیاست میں آپ کی صحیح پوزیشن (Position) کو نہ سمجھا جائے۔ جسوقت آپ نے امیر شام کی معزولی کا حکم دیا اس وقت آپ صرف ایک حاکم وقت ہی نہیں خلیفۂ رسولؐ اور امام وقت بھی تھے۔ ایک الٰہی پیشوا اور خلیفۂ رسول ہونے کی حیثیت کے ساتھ آپؑ معاویہ کو جتنے دن یا یوں کہا جائے کہ جتنے منٹ کی مہلت دیتے تو وہ مہلت معاویہ کو حکومت کرنے کا شرعی جواز فراہم کرتی اور پچھلے تمام سیاہ کارناموں اور جرائم کے لئے

ایک خوبصورت پردہ ثابت ہوتی بعد میں آنے والے مورخ کا قلم یہی لکھتا کہ امیر شام معاویہ ابن ابو سفیان دوسری، تیسری اور چوتھی خلافت میں حکومت کرتے رہے اور بعد میں ان کی کچھ غلطیوں کی وجہ سے علیؑ نے انھیں عہدے سے معزول کردیا، یعنی یہ غلطیاں امیر شام کی پوری زندگی کے جرائم کے لئے ڈھال بن جاتیں اور ان کا بعد میں معزول ہونا گویا ایسا ہی ہوتا جیسے عام طور پر حکمراں گورنروں کو تبدیل کردیا کرتے ہیں۔

امام وقت ہونے کے ناطے امیرالمومنین حضرت علیؑ امیر شام کی حکومت کو شرعی جواز فراہم کرنے کے لئے قطعی طور پر تیار نہ تھے اسی کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ امیرالمومنینؑ کی دور رس نگاہیں اپنے دور حکومت کے پاس دس برسوں کو نہیں بلکہ قیامت تک کے حالات کو دیکھ رہی تھیں، اگر کل علیؑ سیاسی مصلحت اور اپنی حکومت کو دوام دینے کی خاطر معاویہ کو کچھ دنوں کی مہلت دے دیتے تو آنے والے وقت کے سیکڑوں یا ہزاروں ''معاویہ صفت حکمرانوں'' کے لئے ایک بہترین بہانہ ہاتھ آجاتا اور وہ بھی باطل کے خلاف اقدام کرنے سے پہلے امیرالمومنینؑ کے اس عمل کو دلیل کے طور پر پیش کرکے اپنا سیاسی مفاد حاصل کرتے۔ امیرالمومنینؑ نے اپنے اس عمل سے اخلاقی سیاست کے ایسے بلند ستون تعمیر کئے جو ہزاروں برس تک عادل حکمرانوں کے لئے منارۂ نور ثابت ہوتے رہیں گے۔ اپنے اس عمل سے امیرالمومنینؑ نے شریعت کی سیاست پر بالادستی بھی ثابت کی یعنی سیاست کے تقاضوں پر شریعت کے تقاضوں کو قربان نہیں کیا جاسکتا اور کوئی بھی حاکم اپنی شرعی حکومت کے دوام کے لئے بھی غیر شرعی راستے نہیں اختیار کرسکتا۔ حکومت کے حصول اور دوام دونوں منزلوں پر علیؑ اخلاقی اصول اور شریعت کی قیمت پر کوئی سمجھوتہ کرنے پر تیار نظر نہیں آتے۔ یہاں پر وہ واقعہ بھی یاد کرنا چاہئے جب نبیؐ کی وفات کے بعد ابوسفیان ابن حرب حضرت کے پاس آکر کہتا ہے کہ دیکھو لوگوں نے دھاندلی مچاکر خلافت ایک تیمی (ابوبکر) کے حوالے کردی اور بنی ہاشم کو ہمیشہ کے لئے اس سے محروم کردیا، آپ ہاتھ بڑھائیں میں آپ کی بیعت کرتا ہوں اور اگر کوئی مخالفت کے لئے اٹھا تو میں مدینہ کے گلی کوچوں کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں گا۔ اگر اس نازک موقع پر علیؑ کا ایک مثبت اشارہ مل جاتا تو مسلمانوں میں فتنہ و فساد کے شعلے بھڑکنے لگتے۔ یہاں پر امیرالمومنینؑ نے اپنے آپ کو پیغمبرؐ کا صحیح وارث اور حقیقی جانشین سمجھتے ہوئے بھی صرف امت مسلمہ کے اتحاد کو پیش نظر رکھا۔ فتنہ و فساد کو ہوا دینے کے بجائے ابوسفیان کو سختی سے جھڑک دیا اور اس موقع پر یہ کلمات ارشاد فرمائے:

''اے لوگو فتنہ و فساد کی موجوں کو نجات کی کشتیوں سے چیر کر اپنے کو نکال لے جاؤ۔ تفرقہ اور افتخار کی راہوں سے اپنا رخ موڑ لو، فخر و مباہات کے تاج اتار ڈالو۔ صحیح طریقۂ عمل اختیار کرو کامیاب ہے جو اٹھے تو پر و بال کے ساتھ اٹھے اور نہیں تو دوسروں کے لئے چھوڑ بیٹھے اور اس طرح خلق خدا کو بدامنی سے راحت میں رکھے''۔ (نہج البلاغہ)

ان دونوں مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت کا حصول یا دوام کبھی بھی امیرالمومنینؑ کے لئے الٰہی احکام اور اصول کی قربانی کا موجب نہیں بنا بلکہ آپ نے ایسے موقع پر اپنے تدبر اور حکمت عمل کے ذریعہ الٰہی سیاست اور سنت پیغمبرؐ کے نقوش کو زندہ کیا۔

حکومت اسلامی کے قیام کا مقصد

امیرالمومنینؑ حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ میں جگہ جگہ پر حکومت اسلامی کے مقاصد پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ زمانۂ قدیم سے ہی زیادہ تر حکومتوں کے قیام کا مقصد عوام کا استحصال رہا ہے۔ شراب و کباب میں ڈوبی ہوئی داستان سیاست کی تاریخ میں ایسی حکومتیں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں جس کے سایہ میں عوام اور رعایا کے حقوق کی حفاظت کو اپنا مقصد حکومت قرار دیا گیا ہو۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ امیرالمومنینؑ کا تقریباً پانچ سالہ مختصر سا دور حکومت، سیاست کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے جس میں حاکم کی تمام تر توجہ صرف رعایا اور اس کی بھلائی کی جانب مرکوز رہی۔ یہاں پر ہم حکومت اسلامی کے اغراض و مقاصد کے متعلق کلام امیرالمومنینؑ کے چند نمونے نقل کر رہے ہیں۔ ایک مقام پر امامؑ خداوند عالم کی بارگاہ میں تضرع و زاری کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''پالنے والے! یقیناً تو ہی بہتر جانتا ہے کہ اس اقدام سے ہمارا مقصد حکومت و سلطنت سے لطف اندوزی یا دنیوی مال و دولت کی جمع آوری نہیں ہے بلکہ میں نے حکومت کا بار اپنے کندھوں پر صرف اس لئے اٹھایا ہے کہ اس کے ذریعہ تیرے دین کے شعائر کو دوبارہ زندہ کروں اور تیرے شہروں میں صلح و اصلاح کا ماحول سازگار کروں، تاکہ تیرے مظلوم اور ستم دیدہ بندے امن و امان سے رہیں اور تیرے معطل پڑے ہوئے قوانین نافذ ہوسکیں۔ پروردگار میں پہلا شخص ہوں جس نے سب سے پہلے تیری جانب رخ کیا، تیرے پیغام کو گوشِ دل سے سنا اور اس پر لبیک کہا، نماز کے سلسلے میں پیغمبر اسلامؐ کے علاوہ کوئی مجھ سے مقدم نہیں ہے''۔ (نہج البلاغہ خطبہ)

چند فقروں پر مبنی اس کلام میں امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اسلامی حکومت کے

اغراض و مقاصد کے سبھی بنیادی عناصر کو سمیٹ لیا ہے، یہ چند جملے یقیناً امیرالمومنین کے سیاسی منشور کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے مطابق دینِ الٰہیہ کے نقوش کا احیاء احکام شریعت کے معاشرے میں نفاذ، فتنہ و فساد کا قلع قمع سماج کے مظلوم اور مستضعف افراد کی حمایت اور شہروں کا امن و امان اسلامی حکومت کے قیام کے بنیادی مقاصد قرار پاتے ہیں لیکن یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے کہ ایک کمزور حکومت کبھی بھی ان بلند مقاصد کو حاصل نہیں کرسکتی اس لئے آپ نے اپنی حکومت کے دوران کئی مرتبہ اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے اور امت کے قومی افراد سے معاشرے کے امن و امان کے لئے مفسدوں اور باطل پرستوں کے خلاف ہمہ وقت جنگ کے لئے تیار رہنے کی تاکید کی ہے۔

امیرالمومنینؑ کے مطابق ایک طاقتور اور جنگی لحاظ سے مضبوط حکومت ہی احکام الٰہی کا احیاء، فتنہ و فساد کا خاتمہ اور شہروں میں امن و امان قائم رکھ سکتی ہے۔ وہ عناصر جو حق سے بغاوت کرکے ان اغراض و مقاصد کو پس پشت ڈال دیں ان سے اس وقت تک جنگ کرنا لازم وضروری ہے جب تک وہ اللہ کی راہ پر پلٹ نہ آئیں اور قرآن کے حکم کے آگے گردنیں نہ جھکادیں تاکہ حق و عدل پھر سے قائم ہوسکے۔ اسی لئے آپ نے ایک مقام پر فرمایا:

''ان لوگوں کی طرف جنگ کے لئے چل پڑنے کو آمادہ ہوجاؤ جو حق سے بیگانہ ہوگئے ہیں اور اسے نہیں دیکھتے۔ ظلم و فساد میں مست ہوگئے ہیں اور اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ کتاب خدا سے دور اور صراط مستقیم سے منحرف ہوگئے ہیں''۔

امیرالمومنین کی سیاسی روش

امیرالمومنینؑ کا فلسفہ سیاست ایک جانب تو دنیاوی سیاست دانوں سے اس لئے الگ ہے کہ امیرالمومنین سیاست اور اقتدار کے لئے الٰہی اصولوں سے ذرہ برابر بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار نظر نہیں آتے دوسری جانب آپ کا طرز حکومت نام نہاد دینی رہنماؤں کے اس آئیڈیلسٹ نظریے سے بھی پوری طرح الگ نظر آتا ہے جو ظالموں کے خلاف اقدام کو بھی غلط جانتا ہے، امیرالمومنینؑ کے فلسفۂ حکومت کے مطابق اگر کسی فرد یا گروہ کا وجود معاشرے کے امن و امان اور نظم و نسق کے لئے خطرہ بن جائے اور اصلاح کی کوششیں بیکار ہوجائیں تو ایسے افراد یا گروہ کی ایسی سختی کے ساتھ سرکوبی کی جائے کہ یا تو وہ اپنی شرانگیزیوں سے باز آجائیں یا صفحۂ ہستی سے ایک حرف غلط کی طرح مٹ جائیں ممکن ہے کہ کوئی تخیل پسند روحانی اور اخلاقی معلم ایسا ہو جو ظالموں کے قتل کو بھی گناہ سمجھتا ہو اس کی بزدل

روح اس خون کے سیلاب سے کانپ اٹھتی ہو جو دفع شر میں بہتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسا آئیڈیلسٹ معلم اخلاق اور رہنما دنیا کی اصلاح نہیں کرسکتا۔ وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں جاکر تقویٰ اور ریاضت سے اپنی روح کو تو ضرور تسکین پہنچا سکتا ہے مگر دنیا سے ظلم کو نہیں مٹا سکتا۔ جس طرح طب کا اصل مقصد اصلاح بدن ہے خواہ دوا کڑوی ہو یا میٹھی اسی رہنما کا اصل مقصد اصلاح معاشرہ ہے خواہ نرمی سے ہو یا سختی سے۔ ایک سچا مصلح صرف زبان سے معاشرے کی اصلاح کرنے کی قسم نہیں کھا سکتا۔ اپنا کام پورا کرنے کے لئے کبھی قلم اور کبھی تلوار کا استعمال اس کے لئے ناگزیر ہوجاتا ہے۔ امیرالمومنینؑ نے اسی لئے متعدد مقامات پر اصلاح معاشرہ کے لئے اپنے اس مضبوط ارادے کا اظہار فرمایا ہے:

''خدا کی قسم میں اس بچّو کی طرح نہ ہوں گا جو لگاتار کھٹکھٹائے جانے سے سوتا ہوا بن جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا طلب گار (شکاری) اس تک پہنچ جاتا ہے اور گھات لگا کر بیٹھنے والا اس پر اچانک قابو پالیتا ہے بلکہ میں تو حق کی طرف بڑھنے والوں اور گوش برآواز اطاعت شعاروں کو لے کر ان خطا اور شک میں پڑنے والوں پر اپنی تلوار چلاتا رہوں گا یہاں تک کہ میری موت کا دن آجائے۔ خدا کی قسم! جب سے اللہ نے اپنے رسولؐ کو دنیا سے اٹھایا برابر دوسروں کو مجھ پر مقدم کیا گیا اور مجھے میرے حق سے محروم رکھا گیا''۔ (خطبہ نمبر ۶)

''.....میں نے اس قوم سے لڑنے کے لئے رات بھی اور دن بھی، اعلانیہ بھی اور پوشیدہ بھی تمہیں پکارا اور للکارا، اور تم سے کہا کہ قبل اس سے کہ وہ جنگ کے لئے بڑھیں تم ان پر دھاوا بول دو۔ خدا کی قسم جن افراد قوم پر ان کے گھروں کے حدود کے اندر ہی حملہ ہوجاتا ہے وہ ذلیل وخوار ہوتے ہیں لیکن تم نے جہاد کو دوسروں پر ٹال دیا اور ایک دوسرے کی مدد سے پہلو بچانے لگے یہاں تک کہ تم پر غارت گریاں ہوئیں اور تمہارے شہروں پر زبردستی قبضہ کرلیا گیا..... تمہیں ہلاک وتاراج کیا جارہا ہے مگر تمہارے قدم حملے کے لئے نہیں اٹھتے۔ وہ تم سے لڑ بھڑ رہے ہیں اور تم جنگ سے جی چراتے ہو۔ اللہ کی نافرمانیاں ہورہی ہیں اور تم راضی ہورہے ہو.....'' (خطبہ نمبر ۲۷)

''.....اور اب بھی میرا اقدام ویسے ہی مقصد کے لئے ہے۔ تو سہی جو میں باطل کو چیر کر حق کو اس کے پہلو سے نکال لوں۔ میری قریش سے وجہ نزاع ہی اور کیا ہے۔ خدا کی قسم! میں نے تو ان سے جنگ کی، جبکہ وہ کافر تھے اور اب بھی جنگ کروں گا جبکہ وہ باطل کے ورغلانے میں آچکے ہیں اور

جس شان سے میں کل ان کے مقابلے میں ثابت قدم رہ چکا ہوں، ویسا ہی آج بھی رہوں گا''۔ (خطبہ نمبر ۳۳)

کلام امیرالمومنینؑ سے ماخوذ مذکورہ بالا سطور سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ امیرالمومنینؑ اپنے عہد اقتدار کے دوران اہلِ باطل اور فتنہ پردازوں کو کسی قسم کی مہلت یا ڈھیل دینے کے لئے تیار نہیں تھے بلکہ ان کے خلاف سخت ترین اقدامات کے لئے پوری طرح آمادہ تھے۔ آپ کی سیاست اور طرز حکومت احکام الٰہیہ کی طرح واضح اور روشن تھی جس میں کسی طرح کے ابہام اور تذبذب کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ آپ اس بات سے پوری طرح واقف تھے کہ چند ابن الوقت افراد اور بکے ہوئے محدثین اور مورخین آپ کی اس صاف ستھری سیاست کو ناشناسی پر محمول کرتے ہیں مگر آپ ان اعتراضات سے پوری طرح بے نیاز نظر آتے ہیں۔ ایک مقام پر آپ نے خود اپنے فلسفۂ سیاست پر نہایت وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے:

''مگر ہمارا زمانہ ایسا ہے جس میں اکثر لوگوں نے عذر وفریب کو عقل و فراست سمجھ لیا ہے، اور جاہلوں نے ان کی (چالوں) کو حسن تدبیر سے منسوب کر دیا ہے۔ اللہ انھیں غارت کرے انھیں کیا ہوگیا ہے؟! وہ شخص جو زمانے کی اونچ نیچ دیکھ چکا ہے اور اس کے ہیر پھیر سے آگاہ ہے وہ کبھی کوئی تدبیر اپنے لئے دیکھتا ہے، مگر اللہ کے اوامر و نواہی اس کا راستہ روک کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ تو وہ اس حیلہ و تدبیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اس پر قابو پانے کے باوجود چھوڑ دیتا ہے اور جسے کوئی دینی احساس سدِ راہ نہیں ہے وہ اس موقع سے فائدہ اٹھالے جاتا ہے''۔ (خطبہ نمبر ۴۱)

اس مختصر سے کلام میں حضرت علی علیہ السلام نے اپنی سیاست کی اساس کا اظہار کرنے کے علاوہ ان لوگوں کو بھی جواب دیا ہے جو امیر شام کے مقابلے میں آپ کی سیاست کو ناکام ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ دنیا کو یہ بتادینا چاہتے ہیں کہ تمام سیاسی ہتھکنڈوں، حیلہ و تدبیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اس پر قابو پانے کے باوجود صرف اللہ کے اوامر و نواہی کے سدراہ ہوجانے کی وجہ سے آپ نے انھیں چھوڑ رکھا ہے۔ امیرالمومنین اس حقیقت کو بھی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہر حیلہ اور تدبیر کو عقل و فراست نہیں سمجھا جاسکتا یہ درحقیقت شبہہ عقل ہے اور اس کا اصل نام شیطنت ہے۔

امیرالمومنینؑ کے متعدد خطوط اور خطبات سے پوری طرح واضح ہے کہ آپ امیر شام معاویہ کے تمام سیاسی چکر مکر، اور حیلہ وفریب سے پوری طرح واقف تھے لیکن کبھی بھی آپ ان شعبدے بازیوں کے

مقابلے کے لئے اپنے بلند معیار سے نیچے اترنے اور حدود الٰہی کو پامال کرنے پر راضی نہیں ہوئے۔

یہاں ایک اور اہم بات قابل ذکر ہے کہ باوجود اس کے کہ آپ دنیا کو آخرت کے مقابلے میں بہت پست اور بے اہمیت تصور کرتے تھے، پھر بھی آپ نے کبھی امور حکومت میں کس طرح کی ڈھلائی یا بے توجہی سے کام نہیں لیا اور کبھی بھی اپنی عبادتوں کو حکومت کے کام کاج میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ آپ کے لئے اسلامی معاشرے کا امن و امان اور نظم و نسق اس قدر اہم اور ضروری تھا کہ اس کے لئے آپ نے حرم پیغمبرؐ یعنی مدینہ منورہ کو چھوڑ کر کوفہ کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا تا کہ وہاں سے امیر شام کی ریشہ دوانیوں کا بہتر طریقے سے مقابلہ کریں۔ اگر اس ذمہ داری کے علاوہ ساری دنیا کی دولت بھی علیؑ کو دے دی جاتی پھر بھی شاید آپ قبر پیغمبرؐ کو چھوڑنے پر ہرگز راضی نہ ہوتے۔ آپ کے نزدیک دنیا اور حکومت کی اپنی کوئی ذاتی ارزش اور قیمت نہیں ہے مگر زمین پر عدل اور حق کا قیام چونکہ ایک الٰہی فریضہ ہے لہٰذا یہ فریضہ خود اس امر حکومت کو اہم اور عظیم بنا دیتا ہے۔ آپ نے اس حقیقت کو ایک مقام پر اظہار فرمایا ہے:

''عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ میں مقام ذی قار میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ اپنا جوتا ٹانک رہے ہیں (مجھے دیکھ کر فرمایا اے ابن عباس اس جوتے کی کیا قیمت ہوگی؟) میں نے کہا کہ اب تو اس کی کچھ بھی قیمت نہ ہوگی، تو آپ نے فرمایا کہ اگر میرے پیش نظر حق کا قیام اور باطل کا مٹانا نہ ہو تو تم لوگوں پر حکومت کرنے سے یہ جوتا مجھے کہیں زیادہ عزیز ہے''۔ (خطبہ نمبر ۳۳)

حکومت کس کا حق ہے؟

صدر اسلام ہی سے یہ مسئلہ بہت اہمیت کا حامل رہا ہے کہ اسلامی حکومت و سیاست میں حاکمیت کا حق کس کو دیا گیا ہے؟ اور یہ حاکمیت کس طرح قائم و ثابت ہوتی ہے؟ چونکہ اسلام ایک ایسا نظریہ اور مکتب فکر ہے جس کے ہر عقیدے اور عمل کی بنیاد توحید پر رکھی گئی ہے اس لئے اسلام میں حاکم مطلق صرف اور صرف ذات باری تعالیٰ ہے۔ قرآن کریم کی متعدد آیتوں سے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے چونکہ وہی اس کائنات اور اس کے ذرے ذرے کا خالق و مالک ہے لہٰذا اس کائنات کی حاکمیت مطلقہ بھی صرف اسی کو زیبا ہے مگر چونکہ اس نے انسان کو زمین کا وارث اور زمین پر اپنا خلیفہ قرار دیا ہے اس لئے اس نے انبیاء، اولیاء اور اپنے برگزیدہ بندوں کو اپنی طرف سے حاکمیت کا حق عطا کیا ہے اور ان کی اطاعت اور پیروی عوام پر واجب قرار دی ہے:

اَطِیْعُوْا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوْالرَّسُوْ لَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ'' اللہ کی اطاعت کرو اس کے رسول کی اطاعت کرو اور صاحبانِ امر کی''۔

خداوند عالم کے بعد لوگوں پر حکومت کرنے کا سب سے زیادہ حق انبیاء کرام کا ہے جنھیں خود قادر مطلق نے اپنے بندوں کے درمیان حق و عدل کے قیام کا ذمہ دار بنایا ہے۔

حکومت کے متعلق مکتب امامیہ کا نظریہ

اس سے پہلے کہ ہم حاکیت کے سلسلے میں امیرالمومنینؑ کے افکار کو زیر بحث لائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ مکتب امامیہ کے عقیدۂ حاکیت کو پیش کردیں۔ فرقۂ امامیہ کے مطابق رسولؐ نے اپنے وصال سے پہلے ہی حضرت علی علیہ السلام کو واضح طور پر اپنا خلیفہ اور جانشین قرار دیا تھا جب کہ نظریۂ اہل سنت کے مطابق نبیؐ نے اپنے پیچھے کوئی جانشین نہ چھوڑ کر یہ فیصلہ جمہور مسلمین کے حوالے کردیا تھا کہ تم جیسے چاہنا میرے بعد میرا خلیفہ چن لینا۔ اولاً تو یہ بات کسی عام مصلح کے لئے بھی نہیں سوچی جاسکتی کہ وہ جانشینی کا مسئلہ قوم کے اوپر چھوڑ دے جب کہ وہ قوم ابھی ابھی جاہلیت کے اندھیروں سے نکلی ہو چہ جائیکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جیسی ذمہ دار شخصیت جس نے اکیلے دم پر ایک پست ترین قوم کو جہالت کے دلدل سے کھینچا ہو وہ کیونکر اتنے اہم اور نازک مسئلہ کو مسلمانوں کے درمیان نزاع کے لئے چھوڑ جائے گا۔ دوئم یہ کہ قرآن میں ہمیں انبیاء کی سنت بھی یہی نظر آتی ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے جانشین کا اعلان کردیا۔ جیسے موسیٰ کے جانشین ہارون، یعقوب کے جانشین یوسف، داؤد کے جانشین سلیمان وغیرہ اور سوم یہ کہ جمہور مسلمین کے درمیان اپنا حق ثابت کرنے کے لئے خلیفۂ اول نے جو دلیل دی یعنی رسولؐ سے قرابت کی دلیل، وہی دلیل خود حضرت علیؑ کے حق وصایت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے اس لئے کہ اگر حضرت ابوبکر رسولؐ کے قبیلے اور گروہ مہاجرین میں ہونے کی وجہ سے خلافت کے سزاوار تھے تو حضرت علیؑ ان دونوں اعتبار سے بدرجۂ اولیٰ خلافت کے حقدار تھے۔ اس بات کو ایک مقام پر نہج البلاغہ میں بھی نقل کیا گیا ہے:

'' پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد جب سقیفہ بنی ساعدہ کی خبریں امیرالمومنین تک پہنچیں تو...... حضرت نے پوچھا قریش نے کیا کیا؟ لوگوں نے کہا کہ انھوں نے شجرۂ رسولؐ سے ہونے کی وجہ سے اپنے استحقاق پر استدلال کیا۔ تو حضرتؑ نے فرمایا کہ انھوں نے شجرہ ایک ہونے سے تو استدلال کیا، لیکن اس کے

پھلوں کو ضائع و برباد کردیا''۔ (خطبہ ۶۵)

عقیدۂ امامیہ کے مطابق نہ صرف حضرت علیؑ بلکہ ان کی ذریت میں گیارہ اور ہدایت یافتہ امام نص پیغمبرؐ کے مطابق پیغمبرؐ کی خلافت کے حقدار ہیں جس سلسلے کے آخری امام، امام مہدی پردۂ غیب میں ہیں اور جب وہ ظاہر ہوں گے تو ایک آفاقی اسلامی حکومت زمین پر قائم ہوگی اور زمین کا کوئی خطہ اس حکومت کے قلمرو سے باہر نہ ہوگا اور وہ حضرت بحکم خدا اس حکومت کی سربراہی فرمائیں گے۔ رہ گیا ان نصوص اور روایات کا بیان جو ان حضرات کے سلسلے میں پیغمبرؐ سے وارد ہوئی ہیں تو وہ تعداد میں اتنی زیادہ ہیں جن کا مکمل تذکرہ ایک مقالے میں تو کیا ایک مفصل کتاب میں بھی نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی غدیر خم پر نبیؐ نے علیؑ کے لئے جو اعلان فرمایا "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ"

''یعنی جس کا میں مولا ہوں یہ علی بھی اس کے مولا ہیں''۔ تقریباً حدیث کی سبھی کتابوں میں اس کا بیان ملتا ہے، اسی طرح نبیؐ کی حدیث:

''میرے بعد میرے بارہ جانشین ہوں گے اور وہ سب کے سب قریش سے ہونگے''۔ یہ روایت بھی بشمول صحیح بخاری و صحیح مسلم، اہل سنت اور اہل تشیع کی تمام کتب احادیث میں پائی جاتی ہے۔ امیرالمومنینؑ نے خود نہج البلاغہ میں کئی مقامات پر اس نظریے کا اظہار کیا ہے۔

''اس امت میں کسی کو آل محمدؐ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا جن لوگوں پر انکے احسانات ہمیشہ جاری رہے ہوں وہ ان کے برابر نہیں ہوسکتے۔ وہ دین کی بنیاد اور یقین کے ستون ہیں۔ آگے بڑھ جانے والے کو ان کی طرف پلٹ کر آنا ہے اور پیچھے رہ جانے والے کو ان سے آکر ملنا ہے۔ حق ولایت کی خصوصیات انہی کے لئے ہیں اور انہی کے بارے میں پیغمبر کی وصیت اور انہی کیلئے نبیؐ کی وراثت ہے۔ اب یہ وقت وہ ہے کہ حق اپنے اہل کی طرف پلٹ آیا اور اپنی صحیح جگہ پر منتقل ہوگیا''۔ (خطبہ نمبر ۲)

اس خطبے میں امیرالمومنینؑ نے صاف الفاظ میں ظاہر کر دیا ہے کہ صرف آل محمد یعنی آئمہ معصومین ہی پیغمبر کی وصایت اور وراثت کے اصل حقدار ہیں اور یہ ولایت اور رہبری کا درجہ چند خصوصیات کا حامل ہے جو انھیں حضرات میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی مقامات پر امیرالمومنین نے خلافت کو اپنا حق کہا ہے:

''مجھ سے ایک کہنے والے نے کہا کہ اے ابن ابی طالب آپ تو اس خلافت پر للچائے ہوئے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ خدا کی قسم تم اس پر کہیں زیادہ حریص اور (اہلیت کے لحاظ سے) دور ہو۔ اور

میں اس کا اہل اور پیغمبرؐ سے نزدیک تر ہوں۔ میں نے تو اپنا حق طلب کیا ہے اور تم میرے اور میرے حق کے درمیان حائل ہوجاتے ہو''۔ (خطبہ نمبر ۱۷۰) اس خطبے میں امام آگے فرماتے ہیں:

''خدایا! میں قریش اور ان کے مددگاروں کے خلاف تجھ سے مدد چاہتا ہوں کیونکہ انھوں نے قطع رحمی کی اور میرے مرتبے کی بلندی کو پست سمجھا اور اس (خلافت) پر جو کہ میرے لئے مخصوص تھی ٹکرانے کے لئے ایکا کرلیا ہے۔ پھر کہتے یہ ہیں کہ حق تو یہی ہے کہ آپ اسے لیں اور یہ بھی حق ہے کہ آپ اس سے دستبردار ہوجائیں''۔

نہج البلاغہ کے ان اقتباسات کو دیکھنے کے بعد اس بات میں کسی طرح کے شک یا ابہام کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ امیرالمومنینؑ خلافت رسولؐ کو اپنا مخصوص حق سمجھتے تھے اور یہ بھی کہ نبیؐ نے صرف ان ہی کی خلافت کے لئے وصیت فرمائی تھی۔

مگر ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جاسکتا کہ کسی اور کو حکومت کرنے کا یا مسلمانوں کے امور کو سنبھالنے کا حق ہی نہیں ہے۔ ان باتوں سے صرف یہ نتیجہ قطعی طور پر نکالا جاسکتا ہے کہ جنھیں خود پیغمبر اکرمؐ نے منصوص و معین کیا ہو اس کے سامنے اجتہاد، شوریٰ، بیعت یا دوسرے کسی بھی طریقے کی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ ہاں اگر پیغمبرؐ یا اس کے وصی کی جانب سے کوئی صراحت نہ ہو اور اس کے بعد عوام الناس یا معاشرے کے ارباب حل وعقد امت مسلمہ میں سے کسی کو اپنا حاکم منتخب کرلیتے ہیں تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ایسی حکومت کی حیثیت قانونی اور شرعی ہوگی۔

حکومت کے سلسلے میں ہمارا یہ عقیدہ ہرگز نہیں ہے کہ آئمہ معصومین کے سوا کوئی حاکم ہو ہی نہیں سکتا، ہاں ہمارا یہ عقیدہ ضرور ہے کہ ان کے موجود رہتے ہوئے کسی اور کو حکومت کرنے کا حق نہیں ہے۔ غیبت امامؑ کے دوران مسلمانوں کے امور ظہور کے انتظار تک معطل نہیں رہ سکتے اور ان کے انتظام کے لئے کسی حاکم اور ناظم کا ہونا بہرحال ضروری ہے۔

حاکم کی صفات

اسلامی معاشرے کے نظم ونسق کا ذمہ دار ہونا یقینی طور پر ایک عظیم ذمہ داری ہے جسے ہر راہ چلتا انسان نہیں نبھاسکتا۔ امیرالمومنینؑ نے بھی نہج البلاغہ میں جگہ جگہ اس امر کو ایک بڑی ذمہ داری اور بارگراں سے تعبیر کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان صفات کا بھی ذکر کیا ہے جن کا ایک حاکم میں پایا جانا لازمی اور ضروری ہے یہاں پر ہم اسی سلسلے میں نہج البلاغہ سے چند اقتباسات نقل کریں گے:

''یاد رکھو کہ اللہ کے نزدیک سب بندوں سے بہتر وہ انصاف پرور حاکم ہے جو خود بھی ہدایت پائے اور دوسروں کو بھی ہدایت کرے اور جانی پہچانی ہوئی سنت کو مستحکم کرے اور انجانی بدعتوں کو فنا کرے۔ سنتوں کے نشانات جگمگا رہے ہیں اور بدعتوں کی علامتیں بھی واضح ہیں اللہ کے نزدیک سب لوگوں سے بدتر وہ ظالم حکمراں ہے جو گمراہی میں پڑا رہے اور دوسرے بھی اس کی وجہ سے گمراہی میں پڑے رہیں اور (رسول سے) حاصل کی ہوئی سنتوں کو تباہ اور قابل ترک بدعتوں کو زندہ کرے۔ (خطبہ ۱۶۴)

''اے لوگو! تم لوگوں میں اس خلافت کا اہل وہ ہے جو اس کے (نظم و نسق کے برقرار رکھنے) کی سب سے زیادہ قوت و صلاحیت رکھتا ہو اور اس کے بارے میں اللہ کے احکام کو سب سے زیادہ اہم جانتا ہو۔ اس صورت میں اگر کوئی فتنہ پرداز فتنہ کھڑا کرے تو پہلے تو اس سے توبہ و بازگشت کے لئے کہا جائے گا اور اگر وہ انکار کرے تو اس سے جنگ و جدال کی جائے گی'' (خطبہ ۱۷۱)

ان دو اقتباسات سے حاکم کے سلسلے میں امیرالمومنینؑ کا نقطۂ نظر پوری طرح ظاہر ہوجاتا ہے۔ آپ کے نزدیک ایک حاکم اور فرمانروا کے لئے دو سب سے بڑی صفات عدل اور احکام الٰہیہ کا علم ہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ خود بھی ہدایت یافتہ ہو اور عوام کو بھی ہدایت کی راہ پر لگائے۔ امیرالمومنینؑ کے اس نظریئے کی تائید قرآن مجید کی بہت سی آیات سے بھی ہوتی ہے مثال کے طور پر "قَالَ لَایَنَالُ عَهْدِ الظّٰالِمِیْنَ" میرا عہدہ ظالمین کو ہرگز نہیں ملے گا یا "اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهُ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ" بے شک اللہ نے اس (طالوت) کو تم پر فضیلت دی ہے اور (حاکم) منتخب کیا ہے اور اس کو علم اور جسمانی قوت زیادہ عطا کی ہے''۔ (بقرۃ ر ۲۴۷)

جہاں ایک طرف آپؑ نے حاکم کے صفات پر روشنی ڈالی ہے وہیں چند مقامات پر کچھ لوگوں کو سرے سے خلافت اور حکومت کے لئے نااہل بھی قرار دیا ہے:

''اے معاویہ! بھلا تم لوگ کب رعیّت پر حکمرانی کی صلاحیت رکھتے تھے، اور کب امت کے امور کے والی و سرپرست تھے؟ بغیر کسی پیش قدمی اور بغیر کسی بلند عزت و منزلت کے ہم دیرینہ بدبختیوں کے گھر کو لینے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ میں اس چیز پر تمہیں متنبہ کئے دیتا ہوں کہ تم ہمیشہ آرزوؤں کے فریب پر فریب کھاتے ہو اور تمہارا ظاہر باطن سے جدا رہتا ہے''۔ (مکتوب ۱۰)

ان سطروں سے صاف ہے کہ بغیر شخصی فضائل و کمال اور جذبۂ خدمتِ اسلام کے کوئی انسان خلافت و امارت کا حقدار نہیں بن سکتا۔ جس کا ظاہر و باطن الگ اور جو آرزوؤں کے دام فریب میں

گرفتار ہو وہ کس طرح مسلمانوں کے امور کا ذمہ دار بنایا جاسکتا ہے؟۔ امیرالمومنینؑ نے اپنے عمال کو بھی یہی تاکید کی کہ جب بھی کسی کو عہدہ دیں تو پوری طرح جانچ پڑتال کریں تاکہ کوئی نااہل کسی بڑے یا ذمہ دار منصب تک نہ پہنچ جائے چنانچہ ایک مقام پر آپ حضرت مالک اشتر کو تحریر فرماتے ہیں:

''پھر اپنے عہدے داروں کے بارے میں نظر رکھنا ان کو خوب آزمائش کے بعد منصب دینا کبھی بھی صرف رعایت اور جانبداری کی بنا پر انھیں منصب عطا نہ کرنا۔ اس لئے کہ یہ باتیں ناانصافی اور بے ایمانی کا سرچشمہ ہیں اور ایسے لوگوں کو منتخب کرنا جو آزمودہ و غیرت مند ہوں۔ ایسے خاندانوں میں سے جو اچھے ہوں۔ اور جن کی خدمات اسلام کے سلسلے میں پہلے سے ہوں کیونکہ ایسے لوگ بلند اخلاق اور بے داغ عزت والے ہوتے ہیں۔ حرص وطمع کی طرف کم جھکتے ہیں اور عواقب ونتائج پر زیادہ نظر رکھتے ہیں''۔ (مکتوب ۵۳)

علم وعدل ہی اسلام کے سیاسی نظام کی اصل

امیرالمومنینؑ کے افکار، پیغمبر اسلامؐ کی احادیث اور قرآن کے نظریات کی معمولی واقفیت رکھنے والا انسان بھی بڑی آسانی سے یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کی تعمیر جن دو بنیادوں پر کی گئی ہے وہ علم اور عدل ہیں جن کے بغیر کسی بھی انسان کو امت کی امارت اور حکومت کا حق حاصل نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید کی ایک ہی آیت اس نظریہ کی تائید کے لئے کافی ہے وہ سورۂ حدید کی چوبیسویں آیت ہے:

''بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم رہیں''۔

اس آیۂ مبارکہ میں اللہ نے اپنے رسولوں کو دنیا میں بھیجنے کی غرض وغایت یہ بیان کی ہے کہ لوگوں میں عدل وانصاف قائم ہوجائے اور اس عدل وانصاف کے قیام ہی کے لئے انبیاء کرام کو علم کتاب عطا کیا گیا۔ رہ گئی بات روشن دلیلوں کی تو مفسرین کا ایک زبان یہی کہنا ہے کہ ''بینات'' سے مراد انبیاء کے معجزات ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک عام حاکم کے لئے معجزات پیش کرنا ناممکن ہے مگر اس کے بعد کے جو شرائط ہیں وہ ہر حاکم کے دائرہ امکان ہی میں نہیں، بلکہ عہدۂ امارت کے لئے واجب و لازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہی بات پیغمبر اسلامؐ کی ایک مشہور حدیث سے ظاہر ہوتی ہے کہ: "الملکُ یبقیٰ مع الکفر ولا یبقیٰ مع الظلم" یعنی حکومت کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتی ہے مگر ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتی''۔

یعنی حکومت و امارت کیلئے ظلم کرنا سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ کفر بھی ایک طرح کا ظلم ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ سب سے بڑا ظلم ہے مگر چونکہ یہ ظلم بندوں پر نہیں بلکہ ذات خدا پر ہے اور اللہ اپنے دشمنوں کو اکثر طویل مہلت دے دیتا ہے اور اسی دنیا میں ان پر رزق اور عرصۂ حیات تنگ نہیں کرتا اس لئے ایک بے دین اور کافر حکومت تو دنیا میں باقی رہ سکتی ہے مگر بندوں پر ظلم کرنے والی حکومت کے لئے ایک دن کی بھی گارنٹی نہیں لی جاسکتی۔

حاکم کی ذمہ داریاں

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں حاکم کی ذمہ داریوں کے سلسلے سے اتنا کچھ ارشاد فرمایا ہے جن کی نقل و شرح کرنے کے لئے ضخیم کتابیں درکار ہیں۔ ایک چھوٹے سے مقالے میں ان تمام کلام کا احاطہ کرنا جو آپ نے حکومتوں کی ذمہ داریوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے یقیناً ناممکن ہے پھر بھی اپنے مضمون کو پورا کرنے کے لئے ہم یہاں چند کلمات اور مثالوں پر ہی اکتفاء کریں گے۔ حاکم کی ذمہ داریوں کے تعلق سے آپ کا وہ مکتوب جسے آپ نے مالک اشتر نخعی کے لئے تحریر فرمایا تھا علم سیاست کے شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اس دستاویز میں آپ نے حکومت، حاکم اور رعایا سے جڑے ہوئے تمام پہلوؤں پر پوری روشنی ڈالی ہے اور ایک مثالی اسلامی حکومت کا خاکہ کھینچ دیا ہے۔ ہم اس باب میں بنیادی طور پر اسی عہدنامے پر تکیہ کریں گے۔

اس عہدنامے کے شروعاتی کلمات ہی میں آپ نے حاکم وقت کی بنیادی ذمہ داریوں کی جانب واضح اشارہ کردیا ہے آپ فرماتے ہیں: ''یہ ہے وہ فرمان جس پر کاربند رہنے کا حکم دیا ہے خدا کے بندے علی امیرالمومنین نے مالک ابن حارث اشتر کو جب مصر کا انھیں والی بنایا تاکہ وہ خراج جمع کریں، دشمنوں سے جنگ کریں، رعایا کی فلاح و بہبود اور شہروں کی تعمیر و آبادی کا انتظام کریں''۔ (مکتوب ۵۳)

آپ کے اس پہلے جملے سے ایک حاکم اسلامی کی چار بنیادی ذمہ داریوں کا تعین ہوتا ہے یعنی

(۱) خراج کی جمع آوری (اقتصادی پہلو)

(۲) دشمنوں سے جنگ (دفاعی پہلو)

(۳) رعایا کی فلاح و بہبود (فلاحی اور سماجی پہلو)

(۴) تعمیر و آبادی کا انتظام (انتظامی پہلو)

دیکھا جائے تو پہلے جملے ہی میں امیرالمومنین نے حاکموں کی ذمہ داریوں کے حدود اربعہ کا تعین

فرمادیا ہے۔ بنیادی طور پر یہی وہ ذمہ داریاں ہیں جن کے لئے حکومتوں کا قیام عمل میں آتا ہے مگر امیرالمومنینؑ نے ان ذمہ داریوں کے علاوہ حاکموں کے لئے چند اخلاقی ذمہ داریاں بھی معین کی ہیں جن کا تذکرہ ہم سب سے پہلے کریں گے۔

اخلاقی ذمہ داریاں

امیرالمومنینؑ نے خود اپنے اور اپنے مقررکردہ عمال کے لئے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ کہیں حاکم ہونے کا خیال دل و دماغ پر چھا نہ جائے اور جس کے نتیجے میں خدمت خلق کا جذبہ مضمحل پڑ جائے، لہٰذا ایک مقام پر آپ مالک اشتر کو تحریر فرماتے ہیں:

''کبھی یہ نہ کہنا کہ میں حاکم بنایا گیا ہوں، لہٰذا میرے حکم کے آگے سرتسلیم خم ہونا چاہئے، کیونکہ یہ دل میں فساد پیدا کرنے، دین کو کمزور بنانے اور بربادیوں کو قریب لانے کا سبب ہے اور کبھی حکومت کی وجہ سے تم میں تمکنت یا غرور پیدا ہو تو اپنے سے بالاتر اپنے خالق کی عظمت کو دیکھو اور خیال کرو کہ وہ تم پر وہ قدرت رکھتا ہے جو خود تم اپنے آپ پر نہیں رکھتے، یہ چیز تمہاری رعونت و سرکشی کو دبادے گی اور تمہاری طغیانی کو روک دے گی، اور تمہاری کھوئی عقل کو پلٹا دے گی''۔ (عہدنامہ ۵۳)

اسی طرح نہج البلاغہ میں ایک واقعہ ملتا ہے کہ جب عبداللہ ابن زیاد حارثی نے اپنے بھائی عاصم کے رہبانیت کی امیرالمومنینؑ سے شکایت کی اور آپ نے عاصم کو رہبانیت کی زندگی ترک کرنے کی تنبیہہ کی تو اس نے کہا:

''یا امیرالمومنینؑ آپ کا پہناوا بھی تو موٹا جھوٹا اور کھانا روکھا سوکھا ہوتا ہے تو حضرت نے فرمایا کہ تم پر حیف ہے، میں تمہارے مانند نہیں ہوں، خدا نے ائمہ حق پر فرض کیا ہے کہ وہ اپنے کو مفلس و نادار لوگوں کی سطح پر رکھیں تا کہ مفلوک الحال اپنے فقر کی وجہ سے پیچ و تاب نہ کھائے''۔ (خطبہ ۲۰۵)

امیرالمومنینؑ کے مطابق حکمراں طبقے کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے معیارِ زندگی کو انتہائی سادہ رکھیں تا کہ رعیت میں سے غریب و نادار طبقہ اپنے حاکم کے معیار زندگی کو دیکھ کر کچھ سکون محسوس کرے مگر امر واقعہ یہی ہے کہ شاید امیرالمومنینؑ اپنے بنائے ہوئے راستے کے اکیلے راہی تھے اس لئے کہ ان کے علاوہ ہمیں تاریخ میں ایسا کوئی حکمراں نظر نہیں آتا جو حاکم ہوکر بھی پیوند لگے ہوئے کپڑے اور جو کی سوکھی روٹیاں استعمال کرے۔ دوسروں کا کیا ذکر ہے آج نام نہاد اسلامی کہے جانے والے ممالک کے سربراہان، جاہ جلال، اور شان و شوکت میں دوسرے ممالک کے حکمرانوں سے کہیں

زیادہ آگے نظر آتے ہیں۔ ایسا اس لئے ہوا کیونکہ اسلام جو کہ بنیادی طور پر حق کے قیام اور سماجی انصاف کی ایک پرزور تحریک تھی، اسے شہنشاہیت اور ملوکیت میں تبدیل کردیا گیا اسلام نے ایسے بے تخت و تاج کے حکمراں کا تصور پیش کیا تھا جو کمزور اور مستضعفین کے مونس و مددگار ہوں اور زمانے کے متکبرین سے ان کا حق دلوائیں، اور جن کی زندگی میں اصراف فضول خرچی اور شاہانہ ٹھاٹ باٹ کا شائبہ تک نہ ہو مگر انقلاب زمانہ سے پیغمبر اسلامؐ کی وہی تحریک ملوکیت کے ہاتھوں میں آنے کے بعد کمزوروں اور مظلوموں کے گلے کا طوق بن گئی۔ بنی امیہ، بنی عباس، اور آج کے حکمراں سب اس راستے پر گامزن ہیں اور تاریخ سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ اسلامی تحریک کو جتنا نقصان شہنشاہیت اور ملوکیت سے پہنچا اتنا یہودیت، مسیحیت یا کفروالحاد سے ہرگز نہیں پہنچا۔

اقتصادی ذمہ داریاں

اسلامی شریعت کی رو سے حاکم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ رقم شرعیہ جیسے زکوۃ، خمس مختلف النوع ٹیکس، صدقات وغیرہ جمع کرے اور اسے امت کی فلاح و بہبود کے راستے میں خرچ کرے، نہ تو وہ ٹیکس وصول کرنے میں اتنا سخت اور تند خو ہو کہ رعیت اس کے بوجھ سے بلبلانے لگے اور نہ ہی اس مال کو خرچ کرنے میں اتنا بخیل کہ عوام کو کسی فائدے کی امید ہی باقی نہ رہے۔ مالک اشتر کو لکھے اپنے عہد نامے میں ایک مقام پر امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:

''مالگزاری کے معاملے میں مالگزاری ادا کرنے والوں کا مفاد پیش نظر رکھنا، کیونکہ باج اور باجگزاروں کی بدولت ہی دوسروں کے حالات درست کئے جاسکتے ہیں۔ سب اسی خراج اور خراج دینے والوں کے سہارے پر چلتے ہیں۔ اور خراج کی جمع آوری سے زیادہ زمین کی آبادی کا خیال رکھنا کیونکہ خراج بھی تو زمین کی آبادی ہی سے حاصل ہوسکتا ہے اور جو تعمیروآبادی کے بغیر خراج چاہتا ہے وہ ملک کی بربادی اور بندگانِ خدا کی تباہی کا سامان کرتا ہے اور اس کی حکومت تھوڑے دنوں سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔ اب اگر وہ خراج کی گرانباری یا کسی آفت ناگہانی یا نہری و بارانی علاقوں میں ذرائع آبپاشی کے ختم ہونے یا زمین کے سیلاب میں گھر جانے یا سیرابی کے نہ ہونے کے باعث اس کے تباہ ہونے کی شکایت کریں تو خراج میں اتنی کمی کردو جس سے تمہیں ان کے حالات کے سدھرنے کی توقع ہو، اور ان کے بوجھ کو ہلکا کرنے سے تمہیں گرانی نہ محسوس ہو''۔ (عہدنامہ ۵۳)

ایک دوسرے مقام پر آپ لکھتے ہیں:

''.....کیونکہ اگر ملک آباد ہے تو جیسا بوجھ اس پر لادو گے وہ اٹھالے گا،اور زمین کی تباہی تو اس سے آتی ہے کہ کاشتکاروں کے ہاتھ تنگ ہو جائیں اور ان کی تنگدستی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ حکام مال و دولت سمیٹنے پر تل جاتے ہیں اور انھیں اپنے اقتدار کے ختم ہونے کا کھٹکا لگا رہتا ہے''۔ (عہد نامہ ۵۳)

یہاں امیرالمومنینؑ یہ واضح کردینا چاہتے ہیں کہ حکومتوں کی تباہی کے آثار یہی ہیں حکام مال سمیٹنے میں لگ جائیں اور کاشتکاروں کے ہاتھ تنگ ہوجائیں، اس کی بہترین مثال آج کل ہمارے ملک میں دیکھنے کو مل رہی ہے کہ ایک طرف تو یہ ڈھونڈورا پیٹا جارہا ہے کہ ملک ترقی کی راہوں پر گامزن ہے، دوسری طرف ملک کے کئی حصوں سے کاشتکاروں کی خودکشی کرنے کی خبریں تقریباً روز ہی سنائی دے رہی ہیں۔ کسی بھی ملک میں جب تک کاشتکار اور مزدور بدحال رہے گا، اس ملک کی حکومت کو کامیاب ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مارکیٹ پر نظر رکھنا اور ضروری اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول رکھنا بھی آپ حاکم کے اہم فرائض میں شمار کرتے تھے چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''ہاں اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو کہ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو انتہائی تنگ نظر اور بڑے کنجوس ہوتے ہیں جو نفع اندوزی کے لئے مال روک رکھتے ہیں اور اونچے نرخ معین کر لیتے ہیں۔ یہ چیز عوام کے لئے نقصان دہ اور حکام کی بدنامی کا باعث ہوتی ہے، لہٰذا ذخیرہ اندوزی سے منع کرنا، کیونکہ رسول اللہؐ نے اس سے ممانعت فرمائی ہے اور خرید وفروخت صحیح ترازوؤں اور مناسب نرخوں کے ساتھ بسہولت ہونا چاہئے کہ نہ بیچنے والے کو نقصان ہو اور نہ خریدنے والے کو خسارہ ہو اس کے بعد بھی کوئی ذخیرہ اندوزی کا مرتکب ہو تو اسے مناسب حد تک سزا دینا''۔ (عہد نامہ ۵۳)

اسی طرح آپ نے رعایا کے اس طبقے کا بھی خاص خیال رکھنے کی تاکید کی ہے جسے تاجر اور اہل صنعت کہا جاتا ہے۔ سماج کا یہی طبقہ اس کی اقتصادی صحت کی ضمانت ہوتا ہے اور اسی طبقے سے حاصل ہونے والے ٹیکس کے ذریعہ ہی کاروبارِ حکومت چلتا ہے اسی لئے امیرالمومنینؑ نے ایک مقام پر اس طبقے کے بارے میں اس طرح ارشاد فرمایا ہے:

''پھر تمہیں تاجروں اور صناعوں کے خیال اور ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کی ہدایت کی جاتی ہے اور تمہیں دوسروں کو ان کے متعلق ہدایت کرنا ہے خواہ وہ ایک جگہ رہ کر بیوپار کرنے والے ہوں یا پھیری لگا کر بیچنے والے ہوں یا جسمانی مشقت (مزدوری یا دستکاری) سے کمانے والے ہوں کیونکہ یہی لوگ منافع کا سرچشمہ اور ضروریات کے مہیا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں''۔ (عہد نامہ ۵۳)

دفاعی ذمہ داریاں

حاکم کی اہم ترین ذمہ داریوں میں سے سے ایک دفاعی ذمہ داری بھی ہے۔ اگر کسی قوم یا ملک کی دفاعی قوت مضبوط ہے تو اس کی جانب کوئی نگاہ ڈالنے کی ہمت نہیں کرتا، فوج کی مضبوطی سے رعایا کے دل ٹھہرے رہتے ہیں اور انھیں کسی بات کا کھٹکا نہیں رہتا۔ امیرالمومنینؑ کے نزدیک بھی دفاعی ذمہ داری حاکم کی اہم ذمہ داریوں میں سے ایک ہے نہج البلاغہ میں متعدد مقامات پر آپ نے فوج، اس کی اہمیت اور اس کے نظم ونسق پر گراں بہا کلمات ارشاد فرمائے ہیں اور اپنے عمال سے تاکید کی ہے کہ اپنی دفاعی قوت کو مضبوط رکھیں ایک مقام پر مالک اشتر سے ارشاد فرماتے ہیں:

''فوجی دستے بحکم خدا رعیت کی حفاظت کا قلعہ، فرمانرواؤں کی زینت، دین و مذہب کی قوت اور امن کی راہ ہیں۔ رعیت کا نظم ونسق انہی سے قائم رہ سکتا ہے اور فوج کی زندگی کا سہارا وہ خراج ہے جو اللہ نے اس کے لئے معین کیا ہے''۔ (عہد نامہ ۵۳)

امیرالمومنین کے مطابق ایک مضبوط فوج ملک کے امن کی ضمانت ہے کیونکہ فوجی لحاظ سے کمزور ملک کبھی بھی دشمن کے لئے ایک تر نوالہ ثابت ہوسکتا ہے، آپ نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لئے خاص کر وصیتیں فرمائیں ہیں اس لئے کہ قرآن نے بھی مجاہدین اسلام کا درجہ اپنے گھر میں بیٹھ جانے والوں سے بلند رکھا ہے۔ امیرالمومنینؑ چونکہ خود اسلام کے سب سے بڑے سپاہی اور علمبردار لشکر تھے لہٰذا آپ سے بہتر فوج اور فوجیوں کے نفسیات کون سمجھ سکتا ہے ایک مقام پر مجاہدین کے لئے ارشاد فرماتے ہیں:

''اور فوجی سرداروں میں تمہارے یہاں وہ بلند منزلت سمجھا جائے جو فوجیوں کی اعانت میں برابر کا حصہ لیتا ہو۔ اور اپنے روپے پیسے سے اتنا سلوک کرتا ہو جس سے انکا اور ان کے پیچھے رہ جانے والے بال بچوں کا بخوبی گزارا ہوسکتا ہو تاکہ وہ ساری فکروں سے بے فکر ہوکر پوری یکسوئی کے ساتھ دشمن سے جہاد کریں۔ اس لئے کہ فوجی سرداروں کے ساتھ تمہارا مہربانی سے پیش آنا ان کے دلوں کو تمہاری طرف موڑے گا''۔ (عہدنامہ ۵۳)

انتظامی اور فلاحی ذمہ داری

ایک حاکم کے لئے سب سے بڑی ذمہ داری یہی ہے کہ اس کے دور حکومت میں رعایا مطمئن اور آسودہ ہو، اگر چہ تاریخ میں ہم نے یہی دیکھا کہ حکمراں تو اپنے عشرت کدوں میں دادِعیش لیتے رہے

اور عوام خون کے آنسو روتے رہے۔ تاریخ میں شاید ہی کوئی حکمراں ایسا گزرا ہو جو اپنے عوام کے فقروفاقہ کو مٹانے کے لئے دن کے علاوہ راتوں کو بھی ہمہ تن منہمک رہے۔ امیرالمومنینؑ کی حکومت تاریخ کی ایک ایسی ہی حکومت تھی جس میں آپ رات کے وقت روٹیوں کی گٹھری لے کر فقراء اور مساکین کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے تھے۔ آپ نے اپنے دور حکومت میں سماج کے نچلے طبقے پر خاص توجہ دی اس لئے کہ یہی وہ طبقہ ہے جس کا ہر دور میں استحصال ہوتا رہا ہے۔ اس لئے کہ بلند اور متوسط طبقہ کسی نہ کسی طرح اپنا کام بہرحال نکال ہی لیتا ہے۔ آپ نے اپنے عمال کو جو ہدایات جاری کی ہیں ان میں ایک طرف تو بطور کلی رعایا کا خیال رکھنے کو کہا گیا ہے اور دوسری طرف سماج کے کمزور طبقوں پر خصوصی توجہ دینے کا حکم بھی دیا گیا ہے مثال کے طور پر:

''حکمرانوں کے لئے سب سے بڑی آنکھوں کی ٹھنڈک اس میں ہے کہ شہروں میں عدل و انصاف برقرار رہے اور رعایا کی محبت ظاہر ہوتی رہے اور ان کی محبت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جبکہ ان کے دلوں میں میل نہ ہو اور ان کی خیرخواہی اسی صورت میں ثابت ہوتی ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کے گرد حفاظت کے لئے گھیرا ڈالے رہیں۔ ان کا اقتدار سر پر بوجھ نہ سمجھیں اور نہ ان کی حکومت کے خاتمہ کے لئے گھڑیاں گنیں''۔

''پھر خصوصیت کے ساتھ اللہ کا خوف کرنا پسماندہ اور افتادہ طبقہ کے بارے میں جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ وہ مسکینوں، محتاجوں، فقیروں اور معذوروں کا طبقہ ہے ان میں تو کچھ لوگ ہاتھ پھیلا کر مانگنے والے ہوتے ہیں اور کچھ کی صورت سوال ہوتی ہے اللہ کی خاطر ان بے کسوں کے بارے میں اس کے اس حق کی حفاظت کرنا جس کا اس نے تمہیں ذمہ دار بنایا ہے ان کے لئے ایک حصہ بیت المال سے معین کر دینا اور ایک حصہ ہر شہر کے اس غلہ میں سے دینا جو اسلامی غنیمت کی زمینوں سے حاصل ہوا ہو..... لہٰذا اپنی توجہ ان سے نہ ہٹانا اور نہ تکبر کے ساتھ ان کی طرف سے اپنا رخ پھیرنا اور خصوصیت کے ساتھ خبر رکھو ایسے لوگوں کی جو تم تک پہنچ نہیں سکتے جنھیں آنکھیں دیکھنے سے کراہت کرتی ہوں گی اور لوگ انھیں حقارت سے ٹھکراتے ہوں گے، تم ان کے لئے اپنے کسی بھروسے کے آدمی کو جو خوف خدا رکھنے والا اور متواضع ہو مقرر کر دینا کہ وہ ان کے حالات تم تک پہنچاتا رہے''۔ (عہدنامہ ۵۳)

''اور تم اپنے اوقات کا ایک حصہ حاجتمندوں کے لئے معین کر دینا جس میں سب کام چھوڑ کر ان ہی کے لئے مخصوص ہو جانا اور ان کے لئے ایک عام دربار کرنا اور اس میں اپنے پیدا کرنے والے اللہ

کے لئے تواضع و انکساری سے کام لینا اور فوجیوں، نگہبانوں اور پولیس والوں کو ہٹا دینا تا کہ کہنے والے بے دھڑک کہہ سکیں"۔ (عہدنامہ ۵۳)

کلام امیر المومنینؑ میں سے ان چند اقتباسات پر نظر کرنے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ رعیت اور عوام ہی علیؑ کی حکومت کا محور تھے آپ نے اپنی حکومت کا بیشتر وقت غریب اور نادار طبقے کی نگہداشت اور دیکھ بھال میں صرف کیا یہاں تک کہ ایک مرتبہ مسجد کوفہ سے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ لوگو! کیا تم میں سے کوئی ایسا بھی ہے جس کا معیار زندگی مجھ سے بھی زیادہ پست ہو، جو مجھ سے بھی زیادہ معمولی غذا اور معمولی پیراہن کا استعمال کرتا ہو؟ امیر المومنین کے اس دعوے کے جواب میں مسجد کوفہ میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا جو اس بات کی دلیل تھا کہ علیؑ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے۔

روحانی اور مذہبی ذمہ داریاں

امت مسلمہ کے حاکم کی روحانی اور مذہبی ذمہ داریوں کو آخر میں درج کرنے سے یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ ان کی اہمیت کم ہے بلکہ ان کا تذکرہ آخر میں اس لئے کیا جارہا ہے کہ ساری ذامہ داریوں کو سمیٹ کر ایک جگہ درج کیا جاسکے کیونکہ اسلام میں حاکم کی ہر ذمہ داری درحقیقت روحانی اور مذہبی ہے اور اس کے کسی عمل کو دین سے ہٹ کر نہیں دیکھا جاسکتا۔ ابتدائی طور پر اسلام نے ایسی ہی حکومت کا تصور پیش کیا تھا جس کا سربراہ روحانی پیشوا بھی ہو اور حاکم وقت بھی، پیغمبرؐ کی آنکھ بند ہونے کے بعد کچھ لوگوں نے امیر المومنین کے حق کو پامال کر کے حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی تب بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور خلیفہ کو مذہبی رہنما اور حاکم وقت دونوں حیثیتیں حاصل تھیں، یہاں تک کہ خلافت حضرت علیؑ علیہ السلام تک پہنچی تو آپ کی حیثیت بھی مسلمانوں کے نزدیک خلیفۂ رسولؐ اور حاکم وقت کی تھی۔ حاکم وقت کے فرائض میں یہ شامل تھا کہ وہ تمام دینی معاملات میں اس کی قیادت کرے۔ یہ تو بعد میں مسلمان بادشاہوں کی سیاہ کاری اور عیش پرستی کا نتیجہ تھا کہ حکومت اور دین کو الگ کرنا پڑا ورنہ امت بھی اپنے حاکم کے تمام برے اور قبیح اعمال کو حجت مان کر تسلیم کر لیتی اور یہ کارنامہ فرزند امیر المومنینؑ نواسۂ رسولؐ امام حسینؑ علیہ السلام نے انجام دیا۔ جب آپ نے دیکھا کہ یزید خلیفۂ رسول کی حیثیت سے مسند خلافت پر بیٹھ کر اسلام، رسول اسلام اور شریعت کا مذاق بنا رہا ہے تو آپ نے کربلا کے میدان میں اپنی شہادت پیش کر کے ملوکیت کے چہرے کو بے نقاب کر دیا اور اپنے خون سے قیامت تک کے لئے ایسی لکیر کھینچ دی جس سے بادشاہت اور روحانی سربراہی ہمیشہ

کے لئے الگ ہوگئی۔ کربلا کے واقعہ کے بعد کسی حاکم کے عمل کو امت نے اپنے لئے حجت نہیں سمجھا۔

امیرالمومنینؑ نے اپنے دور خلافت میں اپنے اور اپنے عمال کے لئے مذہبی ذمہ داریوں کو اولین قرار دیا اور ان کا تذکرہ ہمیشہ سب سے پہلے کیا، چنانچہ مالک اشتر کو لکھے اپنے مکتوب میں سب سے پہلے آپ فرماتے ہیں:

''انہیں (مالک اشترکو) حکم ہے کہ اللہ کا خوف کریں، اس کی اطاعت کو مقدم سمجھیں اور جن فرائض وسنن کا اس نے اپنی کتاب میں حکم دیا ہے، ان کا اتباع کریں کہ ان ہی کی پیروی سے سعادت اور ان ہی کے ٹھکرانے اور برباد کرنے سے بدبختی دامنگیر ہوتی ہے اور یہ کہ اپنے دل اپنے ہاتھ اور اپنی زبان سے اللہ کی نصرت میں لگے رہیں..... اس کے علاوہ انھیں حکم ہے کہ وہ نفسانی خواہشوں کے وقت اپنے نفس کو کچلیں اور اس کی منہ زوریوں کے وقت اسے روکیں، کیونکہ نفس برائیوں ہی کی طرف لے جانے والا ہے۔ مگر یہ کہ خدا کا لطف وکرم شامل حال ہو''۔ (عہدنامہ ۵۳)

امیرالمومنین کے نزدیک اسلامی حکومت کا ایک بڑا فریضہ یہ ہے کہ امت کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ ان کے اندر تقویٰ و پرہیزگاری اور خوف الٰہی پیدا ہو، اپنے بارے میں خود امیرالمومنینؑ ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

''اے لوگو! خدا کی قسم میں اس وقت تک تمہیں کس نیک عمل کی تشویق و ترغیب نہیں دلاتا جب تک میں پہلے اس پر عمل نہ کرلوں اور کسی گناہ سے نہیں روکتا مگر یہ کہ میں پہلے اس سے خود کو محفوظ رکھوں''۔ (خطبہ ۱۷۵)

مسلمانوں کے لئے افسوس کا مقام یہی ہے کہ اپنے اصل حقدار اور وارث سے ہٹ کر جب یہی خلافت غیروں کو ملی تو ان روحانی ذمہ داریوں کا جس طرح مذاق اڑایا گیا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ معاویہ ابن ابوسفیان نے سیاسی وجوہ کی بنا پر جمعہ کی نماز بدھ کو پڑھائی، ولید نے کوفہ کی مسجد میں مصلّے پر شراب کی قے کی اور صبح کی نماز دو کے بجائے چار رکعت پڑھا کر نمازیوں سے پوچھا کہو تو اور پڑھادوں''۔ یزید نے بھرے دربار میں اسلام اور رسول اسلام کا مذاق اڑایا بلکہ اپنے ایک مصرعے میں کہا کہ'' نہ کوئی خبر آئی نہ کوئی وحی نازل ہوئی یہ تو حکومت کے لئے (معاذ اللہ) ایک کھیل تھا'' اسی طرح تاریخ میں قرآن کریم کو انھیں بادشاہوں کے ذریعہ کبھی نیزوں پر چڑھا دیا گیا، کبھی آگ میں جلایا گیا اور کبھی تیروں کا نشانہ بنایا گیا جس کی پوری تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود

ہے اور ایک مختصر سے مقالے میں ان سب کے حوالے دینا ممکن نہیں۔ یہاں صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ ملوکیت نے اسلامی سیاست کو اتنا مسخ کیا کہ آج دوسری قوموں کے لئے تمیز کرنا مشکل ہوگیا کہ آیا اسلام کا صحیح طرز حکومت کیا ہے۔ پیغمبرؐ اسلام کی رحلت کو آدھی صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ اسلامی سیاست کا رخ پوری طرح بدل ڈالا گیا۔ حلال حرام میں اور حرام حلال میں تبدیل ہوگیا۔ حضرت محمدؐ اور حضرت علیؑ کے معمولی اور کچے حجروں کی جگہ شام اور بغداد کے سرسبز و شاداب الف لیلوی قصور و محلات نے لے لی۔ قیصروں، خسروؤں اور عرب و عجم کے بادشاہوں نے خود کو خلیفہ کہلانا شروع کردیا اور اپنی جابرانہ و ظالمانہ سیرت و سیاست کے ذریعہ ہر میدان میں فرعونوں، قیصروں اور بادشاہوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

عوام محوری

آج تک جتنی بھی حکومتیں دنیا میں قائم ہوئی ہیں ان میں سے اکثریت کا شعار یہی رہا ہے کہ کسی طرح اہل حکومت اور اس کے گرد جمع ہونے والے ایک خاص حلقے کو آسودگی اور عیش و نوش فراہم کیا جائے۔ جن حکومتوں کا نام تاریخ میں سنہرے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے وہاں بھی عوام کی آواز کو سننے اور اس پر لبیک کہنے والا کوئی نظر نہیں آتا، ہندوستان کی مغل حکومت جس کے دور کو ہندوستان کا سنہرا دور کہا جاتا ہے وہاں بھی ایک طرف تاج محل اور بلند دروازہ جیسی عمارتیں تعمیر ہورہی تھیں تو دوسری جانب عوام قحط سالی کی مار سے زندہ درگور ہورہی تھی مگر ظاہر ہے کہ تاریخ کے صفحات ان شہنشاہوں کے ذوق اور فن تعمیر کی تعریفوں سے بھرے ہیں اور ان بے کس و لاچار عوام کے قصے تاریخ کے اندھیروں میں ان کی آہ و فغاں کی طرح گم ہوگئے۔ مگر ہم نے امیرالمومنین کی شکل میں ایک ایسا حکمراں بھی دیکھا جس نے اپنے دور حکومت میں بھر پیٹ غذا صرف اس لئے نہیں کھائی کہ کہیں حجاز و یمن کے دور دراز علاقوں میں کوئی مسلمان بھوکا نہ ہو۔ یہی بات آپ کی حکومت کو دوسروں سے الگ کرتی ہے کہ آپ کی حکومت کا پورا زور صرف اور صرف عوام الناس کی بھلائی پر تھا چاہے اس کے لئے خواص کو ناراض ہی کرنا پڑے، آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ دور کی جمہوری (Democratic) حکومتیں جن کی حکومتوں کا دارومدار عوام کے ووٹ پر ہے وہ بھی خواص کو ناراض کرنے کا خطرہ اٹھانے پر تیار نہیں ہیں۔ مالک اشتر کو لکھے اپنے عہد نامے میں امیرالمومنینؑ نے کتنے گراں قدر جملے تحریر فرمائے ہیں:

''تمہیں سب طریقوں سے زیادہ وہ طریقہ پسند ہونا چاہیے جو حق کے اعتبار سے بہترین، انصاف کے لحاظ سے سب کو شامل اور رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کی مرضی کے مطابق ہو، کیونکہ عوام کی ناراضگی خواص کی رضامندی کو بے اثر بنادیتی ہے اور خواص کی ناراضگی عوام کی رضامندی کے ہوتے ہوئے نظر انداز کی جاسکتی ہے۔ اور یہ یاد رکھو کہ رعیت میں خاص سے زیادہ کوئی ایسا نہیں کہ جو خوش حالی کے وقت حاکم پر بوجھ بننے والا، مصیبت کے وقت امداد سے کترا جانے والا، انصاف پر ناک بھوں چڑھانے والا، طلب و سوال کے موقع پر پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جانے والا بخشش پر کم شکرگزار ہونے والا اور زمانے کی ابتلاؤں پر بے صبری دکھانے والا ہو اور دین کا مضبوط سہارا، مسلمانوں کی قوت اور دشمنوں کے مقابلے میں سامان دفاع یہی امت کے عوام ہوتے ہیں، لہٰذا تمہاری پوری کی پوری توجہ اور تمہارا پورا رخ ان ہی کی جانب ہونا چاہئے''۔ (عہدنامہ ۵۳)

امیرالمومنینؑ نے اپنے پورے دور خلافت میں اپنے عمال کو عوام الناس سے براہ راست رابطہ رکھنے کی ہدایت فرمائی تاکہ حکمراں اپنی رعیت کی حقیقی حالت سے پوری طرح واقف رہے ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی رعایا کی حالت کے لئے اپنے وزراء اور افسران کی رپورٹ کا محتاج ہوجائے کیونکہ ایسا حکمراں کبھی بھی رعایا کی صحیح حالت سے واقفیت حاصل نہیں کرسکے گا۔ جب آپ نے قثم ابن عباس کو مکہ کا والی بنایا تو یہ مکتوب روانہ کیا:

''لوگوں کے لئے حج کے قیام کا سروسامان کرو اور اللہ کے یادگار دنوں کی یاد دلاؤ اور لوگوں کے لئے صبح و شام اپنی نشست قرار دو مسئلہ پوچھنے والے کو مسئلہ بتاؤ جاہل کو تعلیم دو اور عالم سے تبادلۂ خیالات کرو اور دیکھو لوگوں تک پیغام پہنچانے کے لئے تمہاری زبان کے سوا کوئی سفیر نہ ہونا چاہئے اور تمہارے چہرے کے سوا کوئی تمہارا دربان نہ ہونا چاہئے اور کسی ضرورتمند کو اپنی ملاقات سے محروم نہ کرنا''۔ (مکتوب ۶۷)

حاکم عادل کیلئے رعایہ کے حقوق و فرائض

امیرالمومنینؑ نے نہج البلاغہ میں اسلامی حکومت میں رہنے والی رعایا کے حقوق و فرائض پر بھی گرانقدر روشنی ڈالی ہے یقیناً اسلامی طرز حکومت میں رعایا کے بہت زیادہ حقوق و فرائض ہیں جنہیں سمجھے بغیر اسلامی طرز حکومت و سیاست کا صحیح خاکہ ذہن میں نہیں آسکتا۔ اس سلسلے کی سب سے بنیادی بات جو آپ نے ارشاد فرمائی ہے وہ یہ کہ ''اللہ کی معصیت کے ساتھ مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے'' (کلمات

تعمار ۱۶۵) یعنی حاکم وقت کی اطاعت صرف اسی صورت میں ہے جب تک وہ اطاعت الٰہی کے دائرے سے تجاوز نہ کرے اور اگر کوئی حاکم حکم خدا کے خلاف کرنے کا حکم دے تو نہ صرف اس کی اطاعت کرنا حرام ہوگا بلکہ ایسے حاکم کا حکومت کرنے کا شرعی حق بھی ختم ہو جائے گا۔

مگر ایک حاکم عادل کے لئے امیرالمومنینؑ کے مطابق رعیت کا فرض اولین یہی ہے کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔آپ نے یہی بات اہل مصر کے نام ایک خط میں تحریر کی ہے جب آپ نے مالک اشتر نخعی کو مصر کا حاکم بنایا:

''ان کی بات (مالک اشتر کی) کو سنو اور انکے ہر اس حکم کو جو حق کے مطابق ہو مانو کیونکہ وہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں جس کی نہ دھار کند ہوتی ہے اور نہ جس کا وار خالی جاتا ہے۔ اگر وہ تمہیں دشمنوں کی طرف بڑھنے کے لئے کہیں تو بڑھو اور ٹھہرنے کے لئے کہیں تو ٹھہرے رہو کیونکہ وہ میرے حکم کے بغیر نہ آگے بڑھیں گے نہ پیچھے ہٹیں گے''۔(مکتوب ۳۸)

دنیا کا کوئی بھی نظام بغیر نظم کے نہیں چل سکتا اسی لئے امیرالمومنینؑ نظم حکومت کو برقرار رکھنے کی خاطر حاکم کی اطاعت کو رعایا کے لئے لازم قرار دیتے ہیں مگر اس قید کے ساتھ کہ وہ حکم کے مطابق حق ہو۔ امیرالمومنین اس قید کو لگا کر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ امت کا حاکم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رعایا اس کی جانب سے صادر ہونے والے ہر حکم کو فیصلۂ قضاء وقول سمجھتے ہوئے اس پر راضی ہو جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ درباری علماء اور حکام کے آپسی گٹھ جوڑ نے عوام کو ہمیشہ یہ تاثر دیا کہ ظالم و جابر سلاطین کے لئے بھی بغاوت کی آواز بلند کرنا غلط اور غیر شرعی ہے۔ ان کے مطابق عوام کا فریضہ تو بس یہی ہے کہ حکومت کے سامنے ہر حال میں اپنے سر تسلیم کو خم کئے رہے تاکہ ظلم و ستم کی تاریک رات طویل سے طویل تر ہوتی چلی جائے اور حکومت کے خلاف کسی جانب سے کوئی تحریک پیدا نہ ہونے پائے۔ امیرالمومنین اپنے افکار کی روشنی میں اس نظریہ کی سختی سے مذمت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں چنانچہ آپ نے ایک مقام پر لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''دیکھو! اپنے ان سرداروں اور بڑوں، کا اتباع کرنے سے ڈرو جو ذاتی جاہ وحشمت پر اکڑتے اور اپنے نسب کی بلندیوں پر غرہ کرتے ہوں اور بدنما چیزوں کو اللہ کے سر ڈال دیتے ہوں اور اس کی قضاء و قدر سے ٹکر لینے اور اس کی نعمتوں پر غلبہ پانے کے لئے اس کے احسانات سے یکسر انکار کر دیتے ہوں۔ یہی لوگ تو عصبیت کی عمارت کی گہری بنیاد، فتنہ وفساد کے ستون اور جاہلیت کے نسبی

تفاخر کی تلواریں ہیں۔ (ان) جھوٹے مدعیان اسلام کی پیروی نہ کرو کہ جن کا گندلا پانی تم اپنے صاف پانی میں سمو کر پیتے ہو اور اپنی درستگی کے ساتھ ان کی خرابیوں کو خلط ملط کر لیتے ہو اور اپنے حق میں ان کے باطل کے لئے بھی راہ پیدا کر لیتے ہو وفسق و فجور کی بنیادیں ہیں اور نافرمانیوں کے ساتھ چسپیدہ ہیں"۔ (خطبہ ۱۹)

ان کلمات کی روشنی میں امیرالمومنینؑ کا نظریہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ باطل حکمرانوں کی اطاعت کرنا اسلامی شعار نہیں ہے کیونکہ ایسے حکمراں اپنے ساتھ ساتھ رعیت کو بھی گمراہی اور برائیوں کے دلدل میں گھسیٹ لے جاتے ہیں لہٰذا امیرالمومنینؑ ایسے حکمرانوں اور سرداروں کی اطاعت کرنے سے منع کرتے نظر آتے ہیں۔ درحقیقت اسلامی معاشرے میں حکمراں اور رعایا کے ایک دوسرے پر حقوق تبھی تک ہیں جب تک دونوں حدود الٰہی کا احترام کریں۔ اگر ایک ان حقوق کی انجام دہی میں کوتاہی کرے تو دوسرے پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ہاں اس حکومت کا احترام اور اس کی قدر ضروری ہے جو رعایا سے کئے ہوئے اپنے وعدوں کو پورا کرنے میں کوشاں رہے، یوں بھی وفادار رعایا بھی حکومت کے لئے قابل احترام ہے۔ امیرالمومنینؑ نے ایک مقام پر اپنے اور رعایا کے حقوق اس طرح بیان کئے ہیں:

"اے لوگو ایک تو میرا تم پر حق ہے اور ایک تمہارا مجھ پر حق ہے۔ تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ میں تمہاری خیر خواہی پیش نظر رکھوں اور بیت المال سے تمہیں پورا پورا حصہ دوں اور تمہیں تعلیم دوں تاکہ تم جاہل نہ رہو اور اس طرح تمہیں تہذیب سکھاؤں جس پر تم عمل کرو اور میرا تم پر یہ حق ہے کہ تم بیعت کی ذمہ داریوں کو پورا کرو، اور سامنے اور پسِ پشت خیر خواہی کرو، میں بلاؤں تو میری صدا پر لبیک کہو اور میں کوئی حکم دوں تو اس کی تعمیل کرو"۔ (خطبہ ۳۴)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: "آگاہ رہو! کہ تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ اسرار جنگ کے علاوہ کوئی چیز تم سے پوشیدہ نہ رکھوں، شرعی حکم کے علاوہ کسی اور امر میں تمہارے مشورے سے پہلو تہی نہ کروں، تمہارے کسی بھی حق کو پورا کرنے میں تاخیر وکوتاہی نہ کروں اور اسے انجام تک پہنچائے بغیر دم نہ لوں نیز میری نگاہ میں تم سب کا حق برابر ہو۔ پس اگر میں نے ان تمام چیزوں کو جامۂ عمل پہنا دیا تو تم پر خداوند عالم کی نعمت کا شکر واجب اور میری اطاعت لازم ہے۔ (میری) دعوت پر اپنے قدم پیچھے نہ ہٹاؤ اور نیک کاموں میں کوتاہی نہ کرو۔ اور حق تک رسائی کے لئے سختیوں اور دشواریوں سے ٹکرا جاؤ"۔

یہاں یہ بات دھیان دینے کے لائق ہے کہ امیرالمؤمنینؑ نے اپنی یعنی حکمراں کی اطاعت کو اپنے فرائض کی ادائیگی سے مشروط کیا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ اسلام میں حاکم کی اطاعت رعایا پر تبھی واجب ہوتی ہے جب وہ اپنے فرائض پورے کرے اگر وہ اپنے جملہ فراض میں سے کسی سے پہلو تہی کرتا ہے تو وہ رعایا کی اطاعت کا حقدار نہیں ہوسکتا۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق

عام طور پر دیگر مذاہب کے ماننے والوں میں یہی تصور پایا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق نہ صرف یہ کہ محفوظ نہیں ہیں بلکہ سرے سے ہیں ہی نہیں۔ اس نظریئے کے لئے کچھ تو حقیقت ناشناسی اور کچھ مسلمان بادشاہوں کی غیر اسلامی روش ذمہ دار ہے۔ جو کچھ ظلم و زیادتیاں مسلمان حکمرانوں نے غیر مسلموں پر کیں اس کو لوگوں نے اسلام سمجھا حالانکہ اسلام وہ دین ہے جس میں دوسرے مذاہب کے لئے بہت گنجائش اور رواداری ہے قرآن مجید میں ایک مقام پر ارشاد ہے کہ دوسروں کے خداؤں کو برا نہ کہو، کہیں وہ پلٹ کر اللہ کو برا نہ کہیں۔ جس دین میں چوپایوں اور نباتات تک کے حقوق کا خیال رکھا گیا ہو وہ غیر مسلموں کے حقوق کو کیونکر پامال کرسکتا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''لوگو! خدا کے بندوں اور اس کے شہروں کے معاملے میں تقویٰ اختیار کرو کیونکہ تم سے حتیٰ زمین کے خطوں اور جانوروں کے سلسلے میں بھی سوال کیا جائے گا''۔

نہج البلاغہ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امیرالمومنینؑ اسلامی حکومت کی سرحدوں کے اندر غیر مسلموں کے حقوق ایک مسلمان کے حقوق کی ہی طرح محترم سمجھتے تھے اور رعیت سے مسلمان اور غیر مسلمان کی بنیاد پر کسی قسم کا بھید بھاؤ گوارا نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے آپ نے اپنے ایک عامل کو لکھا:

''رعایا کے لئے اپنے قلب کے اندر رحم و کرم اور لطف و محبت کا جذبہ پیدا کرو اور ان کے حق میں پھاڑ کھانے والا درندہ نہ بن جاؤ کہ ان کے منہ سے نوالے چھینو کیونکہ اس میں دو طرح کے لوگ ہیں، ایک تمہارے دینی بھائی ہیں اور دوسرے خلقت میں تمہارے جیسے انسان یعنی انسانی بھائی ہیں''۔

یہاں امیرالمومنینؑ صرف اسلام کی نہیں بلکہ انسانیت کی بات کر رہے ہیں یعنی اسلامی مملکت میں رہنے والے مسلمان اور غیر مسلم سب برابر کے حقوق رکھتے ہیں اور کسی بھی حاکم کے لئے جائز نہیں کہ

وہ غیر مسلم ہونے کے ناطے ان سے کسی بھی طرح کا غلط سلوک کرے۔ حاکم کا دائرہ عدل اتنا تنگ نہیں ہونا چاہئے کہ اس میں سوائے مسلمانوں کے کسی اور کے لئے گنجائش ہی نہ ہو۔ امیرالمومنینؑ کے طرز حکومت سے تو ہمیں یہی تعلیم ملتی ہے۔ جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ معاویہ کے سپاہیوں نے ایک اسلامی شہر پر حملہ کرکے وہاں تباہ کاری پھیلائی تو آپ نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا:

''مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ان میں کا ایک شخص ایک مسلمان اور ایک ذمی عورت پر حملہ آور ہوا اور ان کے جسم سے پازیب، کڑا، گلوبند اور گوشوارے اتار کر لے گیا اور ان عورتوں کے پاس اس کو روکنے کا اس کے علاوہ کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہ گریہ و زاری کریں اور اس سے رحم کی بھیک مانگیں۔ پھر یہ لشیرے لوگ سارا مال لے کر واپس چلے گئے نہ ان میں سے کسی کو کوئی زخم آیا اور نہ کسی کا خون بہا۔ پس اگر ایک مسلمان اس واقعے کے بعد رنج و اندوہ سے مرجائے تو اسے ملامت نہ کی جائے گی بلکہ میری نظر میں ایسا ہی ہونا بہتر ہے''۔

ان جملوں سے امیرالمومنینؑ کے درد کو صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ آپ کی نظر میں رعایا کے طور پر ایک مسلمان اور ایک زمّی عورت میں کوئی فرق نہیں ہے اور آپ ان پر ہوئے ظلم پر یکساں طور پر بے چین نظر آتے ہیں۔ آپ کے مطابق یہ مسلمان افواج کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی سرحدوں میں رہنے والے کفار کے جان و مال و آبرو کی اسی طرح حفاظت کریں جس طرح ایک مسلمان کی اور اگر وہ ایسا نہ کرسکیں تو انھیں رنج و اندوہ سے مرجانا چاہئے۔ یقیناً امیرالمومنینؑ کے یہ جملے ان لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق محفوظ نہیں ہیں۔

قرآن شناسی

قرآن اور سائنسی علوم

الطاف اعظمی

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو مختلف علوم وفنون کے میدان میں، جن میں سائنسی علوم بھی شامل ہیں، ایک مدت دراز تک سیادت وقیادت کا مقام حاصل رہا ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی سے یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے آغاز تک کسی نہ کسی شکل میں مسلم دانشوروں نے اپنی علمی فضیلت وبرتری کو قائم رکھا۔ جابر ابن حیان (م ۸۰۳ء) ابوموسیٰ خوارزمی (م ۸۵۰ء) ابن اسحاق کندی (م ۸۷۳ء) زکریا رازی (م ۹۲۵ء) البطانی (م ۹۲۹ء) ابو نصر فارابی (م ۵۱-۹۵۰ء) ابو الحسن علی مسعودی (م ۹۵۷ء) ابو الوفا (م ۹۸-۹۹۷ء) ابو القاسم زہراوی (م ۱۰۱۳ء) ابن الہیثم (م ۱۰۳۹ء)، ابن سینا (م ۱۰۳۷ء)، البیرونی (م ۱۰۴۸ء)، الغزالی (م۱۱۱۱ء)، عمر خیام (م ۲۴-۱۱۲۳ء)، ابن رشد (م ۱۱۹۸ء) ابن بیطار (م ۱۲۴۸ء) نصیر الدین طوسی (م ۱۲۷۴ء) ابن نفیس (م ۱۲۸۸ء) قطب الدین شیرازی (م ۱۳۱۱ء)، ابن خلدون (م ۱۴۰۶ء) اور شاہ فتح اللہ شیرازی (م ۱۵۸۹ء) جیسی یگانۂ روزگار ہستیاں اس تابندہ دور کی یادگار اور نمائندہ ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی کے آغاز کے بعد مسلمانوں نے علوم وفنون کے میدان سے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کیا اور سولہویں صدی عیسویں میں داخل ہوتے ہی انہوں نے روپوشی اختیار کرلی اور آج اس مقام پر کھڑے ہیں جس کو دیکھ کر یہ گمان کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ کسی دور میں مسلمان بھی آسمان علم کے آفتاب ومہتاب رہ چکے ہیں۔

مذہبی نقطۂ نظر سے علوم وفنون بالخصوص سائنسی علوم کے میدان سے مسلمانوں کی رجعت وپسپائی کے دو بڑے اسباب ہیں۔ ایک سبب تو وہ مخالفانہ بلکہ محاربانہ رویہ ہے جو سائنسی علوم کے مغربی فاضلین نے مذہب کے بارے میں ایک عرصۂ دراز سے اختیار کررکھا ہے۔ مغرب میں نشاۃ ثانیہ کے بعد مذہب کی جو درگت بنی اور جس وسیع پیمانے پر خدا اور مذہب کو تنقید واستہزاء کا نشانہ بنایا گیا وہ ارباب مذہب کے لئے سخت اذیت ناک تھا۔ مخالفین مذہب کے اس جارحانہ رویے کو دیکھ کر دیگر مذاہب عالم کے حاملین کی طرح مسلمانوں نے بھی یقین کرلیا کہ جدید سائنسی علوم فی الواقع مذہب

اور مذہبی اقدار کے دشمن ہیں اور ان علوم کی تحصیل کا مطلب خدا اور مذہب سے پوری طرح دست بردار ہوجانا ہے۔ اس منفی خیال کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کی اکثریت نے سائنسی علوم کی تحصیل سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور ارباب مذہب نے اپنی ساری توجہ خالص روایتی مذہبی علوم کی ترویج واشاعت پر مرکوز کردی اور آج بھی امت مسلمہ کا سواد اعظم اسی راہ پر گامزن ہے۔

دوسرا بڑا سبب قرآن مجید سے مسلمانوں کا فکری انقطاع ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مسلمانوں نے قرآن کی آیات میں تدبر کیا ہوتا تو مذہب کے خلاف مغربی ارباب فکر ونظر کی تمام ہنگامہ آرائیوں کے باوجود وہ سائنسی علوم کی تحصیل سے ہرگز دست کش نہ ہوتے۔ آیئے ذرا تفصیل سے دیکھیں کہ سائنسی علوم کے باب میں قرآن کا کیا نقطۂ نظر ہے۔

قرآن، علم اور اہل علم

سائنسی علوم کے باب میں قرآنی نقطۂ نظر کو ٹھیک طور پر اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب پہلے یہ جان لیا جائے کہ اس آسمانی کتاب کے نزدیک علم اور اہل علم کا کیا مقام ومرتبہ ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک علم کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ زمانۂ نزول کے اعتبار سے سورہ علق قرآن کی پہلی سورہ ہے[1] اور اس کا موضوع توحید اور معاد ہے جس پر تخلیق انسان اور اس کے حیرت انگیز علمی کمالات سے استدلال کیا گیا ہے، فرمایا:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ کَلاَّ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰیٓ. اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی. اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی. (سورہ علق:۱-۸)

''پڑھو اے نبی، اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے غلیظ خون[2] سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جس کو وہ نہ جانتا تھا۔ ہرگز نہیں، انسان سرکشی کرتا ہے اس بنیاد پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے (حالاں کہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے''۔

۱- اس میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ سورہ مدثر کو اور بعض سورہ فاتحہ کو پہلی سورہ قرار دیتے ہیں۔

۲- علقہ کی جمع علق ہے۔ علق کے لغوی معنی خون اور لٹکائی ہوئی چیز کے ہیں۔ لسان العرب میں اس کے معنی غلیظ خون کے لکھے ہیں جو جامد ہوچکا ہو لیکن خشک نہ ہوا ہو۔ اس کے ایک دوسرے معنی جونک کے بھی ہیں۔ (لسان العرب، طبع بیروت، ۱۹۵۶ء، ج ۱۰، ص ۲۶۷)

اس آیت سے نہ صرف علم کی غیر معمولی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم وہ سب سے بڑی نعمت ہے جس سے خدا نے انسان کو نوازا ہے۔

قرآن مجید کی ایک دوسری آیت سے بھی علم کی غیر معمولی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ فرمایا:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْراً كَثِيْراً وَ مَايَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (سورہ بقرہ:۲۶۹)

''جسے وہ چاہتا ہے علم ودانائی (حکمت) عطا کرتا ہے اور جس کو دانائی ملی تو بے شک اس کو بڑی دولت مل گئی، اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو ارباب دانش ہیں''۔

جب علم کی یہ شان ہے تو یقیناً اہل علم کا تو مرتبہ ومقام نہایت بلند وبالا ہوگا، جیسا کہ درج ذیل آیات سے بالکل واضح ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمَاً بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمِ۔ (آل عمران:۱۸)

''خدا اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، فرشتے اور اہل علم بھی جو انصاف پر قائم ہیں، گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں''۔

.....يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔ (سورہ مجادلہ:۱۱)

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور وہ لوگ جن کو علم عطا کیا گیا ہے خدا ان کے درجے بلند کرے گا اور خدا تمہارے سب کاموں سے واقف ہے''۔

وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَ مَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (سورہ عنکبوت:۴۳)

''ہم یہ مثالیں لوگوں کے لئے (یعنی ان کو سمجھانے کے لئے) بیان کرتے ہیں اور اسے تو اہل علم ہی سمجھتے ہیں''۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (سورہ فاطر:۲۸)

''خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں''۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (سورہ زمر:۹)

''کہہ دو! بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے کیا دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟ اور

نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل مند ہیں''۔

آیات مذکورہ بالا سے واضح ہوگیا کہ قرآن مجید کے نزدیک انسانوں میں سے ان لوگوں کا مرتبہ مقام بہت ہی ارفع واعلیٰ ہے جو دولت علم سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک ایک انسان اور حیوان میں فی الواقع جو شے سرمایۂ امتیاز ہے وہ عقل کا جوہر گرانمایہ ہے۔ چنانچہ جو لوگ خدا کی بخشی ہوئی عقل سے کام نہیں لیتے یا دوسرے لفظوں میں علم وفہم سے تہی دست ہوتے ہیں خدا انہیں شرف انسانیت سے محروم قرار دیتا ہے، جیسا کہ ایک جگہ فرمایا ہے:

اِنَّ شَرَّالدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَايَعْقِلُوْنَ۔(سورہ انفال:۲۲)

'' خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے، گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے''۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔ (سورہ فرقان: ۴۴)

'' کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ''۔

علم اور اہل علم کے سلسلے میں قرآن مجید کے طرز التفات کے اس مختصر ذکر کے بعد اب میں سائنسی علوم کے باب میں اس کے نقطۂ نظر کو قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کروں گا۔

علوم وفنون بالخصوص سائنسی علوم کے باب میں قرآن کے نقطۂ نظر کے تعین میں علماء امت میں اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ ان علماء کا ہے جو قرآن میں سائنسی علوم کی موجودگی کا شدت سے منکر ومخالف ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ قرآن مجید ہدایت کی کتاب ہے اور اسے صرف ہدایت کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے۔ اس میں اگر کہیں بعض علوم کا تذکرہ آگیا ہے تو اس کی حیثیت بالکل ثانوی ہے اور یہ علوم بھی وہی ہیں جو عربوں میں معروف تھے۔

اس گروہ کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ شاطبی نے اپنی کتاب الموافقات میں لکھا ہے کہ عرب کا جن علوم کی طرف فی الواقع میلان تھا ان میں علم نجوم، علم انواع، اوقات باراں، بادلوں کی پیدائش، بادلوں کو اٹھانے والی ہواؤں کی گردش، علم تاریخ، امم ماضیہ کے احوال وکوائف، طب اور فنون بلاغت شامل ہیں اور یہ وہ علوم ہیں جن کا شمار علوم صحیحہ میں ہوتا ہے۔ علم قیافہ وزجر (پرندوں سے شگون لینا)

کہانت (غیب کی باتیں) اور خط رمل (کنکر یاں مارنا اور شگون لینا) کا شمار علوم باطلہ میں ہوتا ہے۔ عرب کے ان علوم کے ذکر کے بعد علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

''صحیح علوم کو برقرار رکھنے اور باطل علوم کو باطل ٹھہرانے میں شریعت نے انہی باتوں کو پیش نظر رکھا ہے جو عربوں کو معلوم تھیں۔ ان کی مالوف باتوں سے کہیں بھی باہر قدم نہیں نکالا ہے''۔[۱]

اس کے بعد ان لوگوں پر تنقید کرتے ہیں جو قرآن سے علوم جدیدہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں: ''بعض لوگ اس معاملے میں حد سے تجاوز کر گئے ہیں اور انہوں نے قرآن کی طرف ان تمام باتوں کو منسوب کر دیا ہے جنہیں کسی پہلو سے بھی زمرۂ علم میں شامل کیا جاسکتا ہے خواہ یہ علم متقدمین کا ہو یا متاخرین کا، مثلاً علوم طبعیہ، علوم ریاضی ہو یا منطقیہ، علم الحروف اور دوسرے وہ تمام علوم جن میں ارباب فکر نے عقلی ترکتازیاں دکھائی ہیں۔ ان سب علوم کا منبع انہوں نے قرآن مجید کو ٹھہرایا ہے۔ ان کے اس خیال کو کسی طرح بھی درست نہیں کہا جاسکتا ہے''۔[۲]

دوسرا گروہ ان علماء کا ہے جو نہایت سختی کے ساتھ اس بات کا دعویدار ہے کہ قرآن علوم کا جامع ہے، دنیا کا کوئی قابل ذکر اور مفید علم ایسا نہیں ہے جو قرآن میں نہ پایا جاتا ہو۔ ان کے نزدیک قرآن مجید کا یہ ایک ایسا معجزاتی وصف ہے جو آج بھی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ وہ کلام الٰہی ہے کیوں کہ یہ بات کسی انسان کے لئے ممکن نہ تھی کہ وہ چودہ سو سال پہلے کائنات کے ان حقائق ومعارف کی خبر دیتا جو موجودہ سائنسی دور میں منکشف ہوئے ہیں۔ اس گروہ کی ترجمانی کرتے ہوئے سید عبد الرحمٰن کواکبی لکھتے ہیں:

''ان سب علوم کی تصریحات یا ان کی طرف اشارے قرآن مجید میں تیرہ سو سال سے موجودہ ہیں اور اب تک مخفی اس لیے رہے کہ جب ان کے ظہور کا وقت آجائے تو وہ قرآن کا معجزہ بن کر اس بات کی گواہی دیں کہ بے ریب قرآن اس رب حقیقی کا کلام ہے جس کے سوا کسی دوسرے کو غیب کا حقیقی علم حاصل نہیں ہے۔''[۳]

۱۔الموافقات، علامہ شاطبی، طبع سلفیہ، ۱۳۴۱ ہجری، ج ۲ ص ۴۶ ۲۔ایضاً ۳۔ طبائع الاستعداد، عبد الرحمان کواکبی، ص ۲۶، بحوالہ دائرہ معارف اسلامیہ (اردو) طبع لاہور، ۱۹۶۲ء ج ۶ ص ۵۰۳۔ اس سلسلے میں قارئین درج ذیل کتابوں کا بھی مطالعہ فرمالیں۔

*کشف الاسرار النورانیة القرآنیة فی ما یتعلق بالاجرام السماویه و الارضیه و الحیوانات و النباتات و الجواهر المعدنیة، محمد بن احمد اسکندرانی (تیرہویں صدی ہجری) *بیان الاسرار الربانیة فی النباتات و المعادن و الخواص الحیوانیة، محمد احمد اسکندرانی *مقارنة بعض مباحث الهیئة بالوارد فی النصوص الشرعیة، عبداللہ فکری پاشا (سابق وزیر تعلیم) *کتاب الحیوان، الجاحظ

مصر کے مشہور ادیب مصطفیٰ صادق رافعی نے اپنی کتاب اعجاز القرآن میں لکھا ہے کہ قرآن میں جملہ علوم کے اصول وکلیات موجود ہیں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ عصر حاضر کی سائنسی ایجادات اور علوم طبیعیہ کی طرف قرآن میں واضح اشارات پائے جاتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

'' اگر علوم جدیدہ کا کوئی ماہر قرآن مجید میں غور کرے اور خوب فکر کرے اور وہ فہم صحیح سے عاری نہ ہو اور کسی بات میں الجھ کر نہ رہ جائے تو اسے قرآن میں ایسے بہت سے اشارے ملیں گے جن سے حقائق عالم ظاہر ہوتے ہیں البتہ قرآن مجید ان حقائق کو شرح وبسط کے ساتھ بیان نہیں کرتا، وہ حقائق کی طرف رہنمائی کرتا ہے اگر چہ ان کے نام مقرر نہیں کرتا''۔[۱]

اس گروہ کے اوّلین سرخیل امام غزالی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب جواہر القرآن میں اس سلسلے میں بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن میں ممکنہ علوم موجود ہیں حتی کہ انہوں نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ قرآن میں ایسے علوم بالقوہ موجود ہیں جن کا ادراک بشر کی طاقت سے باہر ہے۔[۲]

راقم سطور کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں سائنسی علوم کی موجودگی کے باب میں مذکورہ دونوں گروہ کے علماء افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ اول الذکر گروہ کا یہ کہنا کہ قرآن مجید میں سائنسی علوم کا سرے سے کوئی ذکر نہیں حقیقت واقعہ کے خلاف ہے، جیسا کہ میں آگے چل کر واضح کروں گا۔ اسی طرح موخرالذکر گروہ کا یہ خیال کہ قرآن میں جملہ علوم کے اصول وکلیات موجود ہیں محل نظر ہے اور اس میں صریح مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اس بات میں صحیح نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن کی مختلف سورتوں میں بلا شبہ ایسی آیات موجود ہیں جن میں سائنسی علوم کی طرف واضح اشارات پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ اگلی سطروں میں مختلف عنوانات کے تحت ان آیات کو لکھا گیا ہے جن میں بعض سائنسی حقائق کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن ان حقائق کے ذکر سے قرآن کا مقصود فی نفسہ سائنسی علوم کا ذکر واثبات نہیں بلکہ اس کے اساسی موضوعات : توحید رسالت اور آخرت کا عقلی اثبات ہے۔ مزید برآں، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کسی انسان کی تصنیف نہیں بلکہ خالق کائنات کا کلام ہے۔

۱- اعجاز القرآن، مصطفیٰ صادق رافعی، ص ۱۴۵ تا ۱۶۶ بحوالہ دائرہ معارف اسلامیہ (اردو) لاہور، ۱۹۶۲ج ۲، ص ۵۰۵

۲- جواہر القرآن، امام غزالی طبع مصر، ۱۳۲۹ ہجری، ص ۳۱ تا ۳۴

علم ہیئت

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّھَارَ یَطْلُبُہٗ حَثِیْثًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِہٖ۔ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (سورہ اعراف:۵۴)

''درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر اپنے عرش پر متمکن ہوا۔ (یعنی کائنات خلقت میں اپنے قوانین جاری کردیے) جو رات کو دن پر ڈھانکتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ سورج چاند اور ستارے سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ سن لو، خلق اور امر دونوں اسی کے ہیں بڑا بابرکت ہے اللہ سارے جہانوں کا پروردگار''۔

وَ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَ النَّھَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ۔ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ۔ (سورہ انبیاء: ۳۳)

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج چاند کو پیدا کیا، سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں''۔

وَ یُمْسِکُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِہٖ۔ اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔ (سورہ حج:۶۵)

''اور وہ اللہ ہی ہے جو آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا ہے۔ بے شک اللہ انسانوں کے حق میں بے اندازہ شفیق اور رحیم ہے''۔

تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْھَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا۔ وَ ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّھَارَ خِلْفَۃً الخ۔ (سورہ فرقان:۶۱۔۶۲)

''بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ (سورج) اور ایک چمک دار چاند رکھ دیا۔ وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَ یُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی الخ (سورہ لقمان:۲۹)

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ سب ایک مدت مقررہ تک جارہے ہیں''۔

وَ اٰیَۃٌ لَّھُمُ الَّیْلُ نَسْلَخُ مِنْہُ النَّھَارَ فَاِذَا ھُمْ مُّظْلِمُوْنَ۔ وَ الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّھَا ذٰلِکَ

تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ. وَ الْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ. لَاالشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَاالَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ. وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ. (سورہ یٰسٓ: ۳۷۔۴۰)

'' اورلوگوں کے لئے ایک نشانی رات بھی ہے۔ ہم ہی اس سے دن کو علیحدہ کرتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جارہا ہے۔ یہ زبردست قدرت اور علم رکھنے والی ہستی کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کی ہم نے منزلیں متعین کردی ہیں یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ بالآخر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں''۔

وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ. (سورہ ذاریات: ۴۷)

'' آسمان کو ہم نے اپنے ہاتھ (یعنی طاقت) سے بنایا ہے اور ہم ہی اس کو وسعت دینے والے ہیں''۔

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا. وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا. (سورہ نوح: ۱۵۔۱۶)

'' کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان طبق در طبق بنائے۔ اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا''۔

علم طبیعات

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (سورہ انبیاء: ۳۰)

'' کیا وہ لوگ غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو جدا کیا''۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (سورہ انبیاء: ۱۰۴)

'' وہ دن جب کہ ہم آسمان کو یوں لپیٹ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دئے جاتے ہیں''۔

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (سورہ حٰمٓ سجدہ: ۱۱)

'' پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا''۔

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ. وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (سورہ معارج: ۸۔۹)

'' جس روز (یعنی روزحشر) آسمان پگھلی ہوئی چاندی [1] (یا تانبے) کی مانند اور آسمان دھنے ہوئے

۱۔ مہل کے متعدد معانی ہیں، مثلاً فلذات، جیسے چاندی، لوہا، تانبا، پگھلی ہوئی دھاتیں، پتلا قطران، زیتون کا تیل وغیرہ۔ ان کثیر معانی کی وجہ سے یہ تعین مشکل ہے کہ ان میں سے کون سے معنی یہاں مراد ہیں۔ یہ تعین اس لیے اور بھی مشکل ہے کہ ابھی یہ واقعۂ سماوی ظہور میں نہیں آیا ہے۔

اون کی طرح ہوجائے گا"۔

يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ. فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ. وَ خَسَفَ الْقَمَرُ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ (سورہ قیامہ:۶)

" پوچھتے ہیں کب وقوع میں آئے گا وہ قیامت کا دن؟ جب آنکھیں خیرہ ہوجائیں گی، چاند بےنور ہوجائے گا۔، اور چاند سورج یکجا کر دیے جائیں گے"۔

اِذَاالشَّمْسُ كُوِّرَتْ. وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ. وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ. (سورہ تکویر:۱۔۳)

" جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے۔ اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے"۔

علم ریاضی

وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا. ذٰلِكَ تَقْدِيْرُالْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ. (سورہ انعام:۹۶)

" اسی نے رات کو ذریعۂ سکون بنایا اور اسی نے چاند اور سورج (کے طلوع وغروب) کا حساب مقرر کیا۔ یہ زبردست قدرت اور علم رکھنے والی ہستی کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے"۔

هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ. مَاخَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (سورہ یونس:۵)

" وہی ہے جس نے سورج کو ضیا اور چاند کو نور بنایا۔ اور چاند کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم اس سے برسوں کی گنتی اور (تاریخوں کا) حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ برحق پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں"۔

اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ. وَّ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدَانِ. وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِيْزَانَ. (سورہ رحمٰن: ۵۔۷)

" سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں۔ اور تارے اور درخت سب اطاعت گزار ہیں۔ اور اسی نے آسمان کو بلند کیا اور میزان قائم کی"۔

علم طبقات الارض

وَ هُوَ الَّذِىْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِىَ وَ اَنْهٰرًا وَّ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ. وَ فِى الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ. الخ (سورہ رعد: ۳۔۴)

''اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ نصب کیے اور دریا جاری کیے اور اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ... اور دیکھو زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل واقع ہیں''۔

وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ (سورہ حجر:۱۹)

'' اور ہم نے زمین کو پھیلایا اس میں پہاڑ نصب کیے اور اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ اگائیں''۔

"وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ. (سورہ نحل:۱۵)

'' اور اس نے زمین میں پہاڑ نصب کیے تاکہ وہ تم کو لے کر لڑھک نہ جائے، اور اسی نے دریا جاری کیے اور (قدرتی) راستے بنائے تاکہ تم راہ پالو''۔

"وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ. وَ جَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ.(سورہ انبیاء:۳۰۔۳۱)

" اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز کو پیدا کیا۔ کیا وہ اسے نہیں مانتے۔ اور زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انہیں لے کر لڑھک نہ جائے''۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ.(سورہ نمل:۶۱)

''وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا جاری کیے اور اس میں پہاڑ بنائے اور دو دریاؤں کے درمیان ایک پردہ (حد فاصل) رکھا۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے۔ نہیں، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''۔

"وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ. هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ.(سورہ لقمان:۱۰۔۱۱)

'' اور اس نے زمین میں پہاڑ نصب کیے تاکہ وہ تمہیں لے کر لڑھک نہ جائے۔ اور اسی نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیے اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا اور زمین میں ہر قسم کی عمدہ نباتات اگائیں۔ یہ تو ہے اللہ کی تخلیق۔ اب ذرا مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے۔ (جنہیں

تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو) اصل بات یہ ہے کہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں"۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ۔ (سورہ فاطر: ۲۷)

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس کے ذریعے ہم نے ہر طرح کے پھل نکالے جن کے رنگ مختلف ہیں۔ (اسی طرح) پہاڑوں کے بھی مختلف حصے ہیں، سفید اور سرخ، ان کے بھی رنگ مختلف ہیں۔ اور بہت گہرے سیاہ"۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا۔ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا۔ (سورہ نوح: ۱۹، ۲۰)

"اور اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی طرح بچھایا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو"۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا۔ اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا۔ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّ اَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا۔ (سورہ مرسلات: ۲۵۔۲۷)

"کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنایا۔ زندوں کے لیے بھی اور مردوں کے لئے بھی۔ اور ہم نے اس میں بلند و بالا پہاڑ نصب کیے اور تمہیں میٹھا پانی پلایا"۔

علم نباتات

وَ هُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا۔ وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْا اِلٰى ثَمَرِهٖ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (سورہ انعام: ۹۹)

"اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے ہم نے ہر قسم کی نباتات اگائیں پھر ان میں ٹہنیاں نکالیں جن سے ہم گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں۔ اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے پیدا کرتے ہیں جو بوجھ سے جھکے پڑتے ہیں۔ اور انگور، زیتون اور انار کے باغ اگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور باہم مختلف بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر پکنے کی کیفیت کو ذرا غور سے دیکھو۔ ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں"۔

وَ مَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ۔ (سورہ نحل۔ ۱۳)

''اور بہت ساری چیزیں جو اس نے تمہارے لیے زمین میں پیدا کی ہیں ان کے رنگ باہم مختلف ہیں۔ اس میں بلاشبہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں''۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا (سورہ فاطر:۲۷)

'' کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس کے ذریعے ہم نے ہر طرح کے پھل پیدا کیے جن کے رنگ باہم مختلف ہیں''۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ مِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (سورہ یٰس:۳۶)

''ہر عیب سے پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے، خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس میں سے یا ان اشیاء میں سے جن کو وہ جانتے نہیں''۔

علم حیوانات

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ۔ (سورہ انعام:۳۸)

''زمین میں چلنے والے ہر قسم کے جاندار اور پروں پر اڑنے والے ہر قسم کے پرندے تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں''۔

وَ اِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُّسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ۔ (سورہ نحل:۶۶)

''اور تمہارے لیے چوپایوں میں بھی غور وفکر کا مقام ہے۔ ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون ہے اس کے درمیان سے ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لئے نہایت خوش مزہ ہے''۔

وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ۔ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا۔ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (سورہ نحل:۶۸،۶۹)

''اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو یہ وحی کی (یعنی اس کی فطرت میں یہ ملکہ ودیعت کیا) کہ تو پہاڑوں اور درختوں میں اور ٹہنیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوستی پھر اور اپنے رب کی مقرر کی ہوئی راہ پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے اندر سے ایک

شربت نکلتا ہے (شہد) جس کے رنگ ہوتے ہیں۔جس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ اس میں ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور وفکر کرتے ہیں''۔

اَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّالسَّمَآءِ مَایُمْسِکُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ (سورہ نحل:۷۹)

''کیا ان لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا جو آسمان کی فضاؤں میں مسخر نظر آتے ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جو ان کو تھامے ہوئے ہو۔ اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں''۔

وَ اللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْھُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِہٖ۔ وَ مِنْھُمْ مَنْ یَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَیْنِ وَ مِنْھُمْ مَنْ یَّمْشِیْ عَلٰی اَرْبَعٍ یَخْلُقُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (سورہ نور:۴۵)

''اور اللہ نے ہر جاندار کو (ایک خاص قسم کے) پانی سے پیدا کیا۔ ان میں سے کوئی تو پیٹ کے بل چل رہا ہے اور کوئی دو ٹانگوں پر اور کوئی چار ٹانگوں پر۔ اور (وہ) جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ۔ (سورہ فاطر:۲۸)

''اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں''۔

علم طب

وَ ھُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ۔ الخ

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا''۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَۃٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَۃٍ مُّخَلَّقَۃٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَۃٍ لِّنُبَیِّنَ لَکُمْ۔ وَ نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَانَشَآءُ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخْرِجُکُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّکُمْ۔ (سورہ حج۔۵)

''اے لوگو! اگر تم کو دوبارہ جی اٹھنے میں کوئی شک ہے (تو اپنی ابتدائی حالت پر غور کرو جب) ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر علقہ (جمے ہوئے خون) سے پھر مضغہ (گوشت کے لوتھڑے) سے جو شکل والی (جوف دار) بھی ہے اور بے شکل (ٹھوس) بھی تاکہ ہم تم پر (حقیقت)

واضح کردیں۔ اور ہم جس نطفے کو چاہتے ہیں ایک وقت مقررہ تک رحموں میں ٹھہرا رکھتے ہیں پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں باہر نکالتے ہیں پھر تمہاری پرورش کرتے ہیں تاکہ تم جلد بلوغ کو پہنچ جاؤ''۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔ (سورہ مومنون:۱۲۔۱۴)

''ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے ایک محفوظ جگہ نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر نطفہ کو علقہ بنایا۔ پھر علقہ کو گوشت کے ایک لوتھڑے میں تبدیل کیا، پھر گوشت کے لوتھڑے کو ہڈیوں کی صورت دی، پھر ہڈی پر گوشت چڑھایا، پھر ہم نے اسے ایک بالکل دوسری ہی مخلوق بنادیا۔ یقیناً اللہ بڑا ہی برکت والا اور سب خالقوں سے بڑھ کر خالق ہے''۔

اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِيْنٍ۔ ثُمَّ سَوّٰهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔ (سورہ سجدہ:۷۔۹)

''جو چیز بھی اس نے بنائی خوب بنائی۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا طین (گیلی مٹی) سے کی، پھر اس کی نسل ایک قسم کے حقیر پانی کے خلاصہ سے چلائی۔ پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی۔ اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور دل بنائے (اس پر بھی)۔ تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو''۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا۔ (سورہ فاطر:۱۱)

''اور اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر تمہارے جوڑے بنائے''۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ۔ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ۔ (سورہ زمر:۶)

''اسی اللہ نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا پھر اس جان سے اس کا جوڑا بنایا، اور اسی نے تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے۔ اور وہی تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تاریک پردوں کے اندر تم کو ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہی ہے اللہ تمہارا رب،

بادشاہی اسی کی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر تم کدھر پھرے جا رہے ہو''۔

وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا۔ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَ يُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا۔ (سورہ نوح: ۱۷،۱۸)

'' اللہ نے تم کو زمین سے ایک خاص طور پر پیدا کیا۔ پھر وہ تمہیں اسی میں واپس لے جائے گا اور اسی میں سے (ایک دن) تم کو نکال کھڑا کرے گا''۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ (سورہ دھر: ۱۔۲)

'' بے شک انسان پر زمانے کا ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا''۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ۔ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ۔ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ۔ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ۔ (سورہ طارق: ۵ تا ۸)

'' انسان غور کرے کہ وہ کس چیز سے بنایا گیا ہے۔ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے، جو ریڑھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ یقیناً وہ اسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے''۔

آیات مذکورہ بالا سے نہ صرف قرآن مجید میں سائنسی علوم کی موجودگی ثابت ہوجاتی ہے بلکہ اس خیال کی تردید بھی ہوتی ہے کہ قرآن میں صرف انہی علوم کا تذکرہ آیا ہے جو عربوں میں معروف تھے۔

مظاہر فطرت اور قرآن کی دعوت تفکر

قرآن مجید کی متعدد آیات میں انسانوں کو عالم فطرت کے واقعات ومظاہر پر غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے اور یہ کہا گیا کہ ان میں ارباب علم کے لئے بہت سی نشانیاں (آیات) ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف سورتوں کی درج ذیل آیات قابل ملاحظہ ہیں:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ (سورہ بقرہ: ۱۶۴)

'' تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس رحمان اور رحیم کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی ساخت میں اور رات ودن کے بدلتے رہنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی

چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا، پھر اس کے ذریعے مردہ زمین کو زندگی دی اور (اسی کے ذریعہ) زمین میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے، ہواؤں کی گردش میں ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں''۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ۔ وَ هُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْهٰرًا وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۔ وَ فِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ (سورہ رعد: ۲ تا ۴)

'' یہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو بغیر کسی ظاہری ستون کے بلند کر رکھا ہے، پھر وہ اپنے تخت اقتدار (عرش) پر جلوہ افروز ہوا۔ یعنی کائنات میں اپنے احکام وقوانین جاری کیے) اور آفتاب وماہتاب کو تابع فرمان بنایا۔ ہر ایک متعین میعاد تک کے لئے (اپنے مقررہ راستے) چلا جارہا ہے۔ وہی (اس تمام کارخانۂ خلقت کا) انتظام کر رہا ہے۔ وہ (اپنی قدرت وحکمت کی) نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تمہیں یقین ہوجائے کہ (ایک دن) تم کو اپنے پروردگار سے ضرور ملنا ہے۔ اور وہی ہے جس نے اس زمین کو پھیلایا، اس میں پہاڑ نصب کیے اور اس میں دریا جاری کیے۔ اور اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے۔ پھر وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور وفکر کرتے ہیں۔ اور زمین میں قطعے (طبقات) ہیں، ایک دوسرے سے متصل، ان میں انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں۔ کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دہرے، سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں مگر ہم بعض پھلوں کو بعض پر مزے میں برتری دیتے ہیں یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں''۔

هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ۔ یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّیْتُوْنَ وَ النَّخِیْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۔ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ۔ اِنَّ فِیْ

ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ وَ مَا ذَرَاَ لَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ۔ (سورہ نحل: ۱۰ تا ۱۳)

''وہ (خدا) وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا جس سے تم کو پینے کا پانی ملتا ہے اور اس سے درخت بھی پیدا ہوتے ہیں، جس میں تم (اپنے مویشی) چراتے ہو۔ اسی پانی سے وہ تمہارے لیے (ہر طرح کے غلوں کی) کھیتیاں اگاتا ہے۔ نیز زیتون، کھجور انگور اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے ایک بڑی نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں۔ اس نے تمہارے بھلائی کے لئے رات، دن سورج اور چاند کو مسخر کیا اور ستارے بھی اسی کے تابع فرمان ہیں۔ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور زمین میں اس سے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں ان کے رنگ باہم مختلف ہیں۔ اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو صاحب فہم ہیں''۔

وَ اللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ۔ وَ اِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ۔ وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَکَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ۔ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا۔ یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ۔ (سورہ نحل: ۶۵، ۶۹)

''اللہ ہی نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کیا۔ بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو (کان لگا کر) سنتے ہیں۔ اور مویشیوں میں بھی تمہارے لئے غور وفکر کا مقام ہے۔ ان کے شکم میں جو گوبر اور خون ہے اس کے درمیان سے ہم تم کو خالص دودھ پینے کے لئے دیتے ہیں، جو پینے والوں کو خوش مزہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم لوگ نشہ کی چیز اور کھانے کی عمدہ چیزیں بناتے ہو بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور (دیکھو) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کو یہ وحی کی (یعنی اس کی جبلت میں یہ ملکہ ودیعت کردیا) کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور ٹہنیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں چھتے بنا اور ہر طرح کے

پھلوں کا رس چوستی پھر اسی طرح اپنے پروردگار کے مقرر کیے ہوئے راستے پر پوری فرماں برداری کے ساتھ چلتی رہ (اس کے نتیجے میں تم دیکھتے ہو کہ) اس کے شکم سے مختلف رنگوں کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں انسان کے لئے شفا ہے۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانی ہے جو غور وفکر کرتے ہیں"۔

" اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ۔ (سورہ روم:۸)

"کیا انہوں نے کبھی اپنے آپ میں غور نہیں کیا۔ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں برحق اور ایک مدت مقررہ تک کے لئے پیدا کیا ہے، مگر بہت سے لوگ اپنے رب سے ملاقات کے منکر ہیں"۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ۔ (سورہ روم:۲۱ تا ۲۳)

"اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت ورحمت پیدا کی۔ اس میں نشانیاں ہیں اور لوگوں کے لئے جو غور وفکر کرتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مندوں کے لئے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اس کے فضل (روزی) کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو (غور سے) بات سنتے ہیں"۔

آیات مذکورہ میں عالم فطرت سے متعلق مختلف موضوعات ومسائل، مثلاً تخلیق ارض وسما، اختلاف لیل ونہار، نظام باراں، پانی کی اثر انگیزی، تصریف ریاح، زمین اور آسمان کے درمیان بادلوں کی تسخیر، عظیم الجثہ اجرام سماویہ کا فضای نیلگوں میں کسی سہارے کے بغیر قائم رہنا، تسخیر شمس وقمر، نجوم، تسخیر لیل ونہار، زمین کی توسیع وتسویہ اور اس میں پہاڑوں اور دریاؤں کا وجود، موجودات عالم میں اصول زوج کی کارفرمائی، طبقات ارض عالم نباتات کی بوقلمونی، درختوں کے پھلوں میں رنگ وبو اور

کثیر اختلاف، جانوروں کے تھنوں میں شیریں دودھ کی پیدائش، شہد کی مکھی کا طریقہ شہد سازی عالم انفس، تخلیق انسان اور اس کے مدارج، انسانوں میں رنگ اور زبان کا اختلاف وغیرہ زیر بحث آئے ہیں اور قرآن مجید نے ان واقعات ومظاہر کو اہل علم وعقل کے لئے اپنی آیات (نشانیاں) قرار دیا ہے۔ لیکن ان آیات سے اس کا مقصود کیا ہے؟

مظاہر فطرت کو اپنی آیات ونشانیاں قرار دینے سے قرآن کی اصلی غرض توحید اور معاد کا اثبات ہے، جو اس کے دو اساسی موضوعات ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عالم فطرت میں کثرت اور تنوع ہے۔ اس کثرت وتنوع کو دیکھ کر بسا اوقات انسان دھوکہ کھاجاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ ایک سے زیادہ طاقتوں کی کرشمہ سازی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کثرت وتنوع کے باوجود تمام مظاہر کائنات ایک محکم قانون کے تابع ہیں اور اس سے ان کے متنوع ہونے کی نفی ہوجاتی ہے۔ کائنات کے مختلف واقعات ومظاہر میں جو کامل توافق وسازگاری دیکھنے کو ملتی ہے اور کہیں ادنیٰ درجے کی بے نظمی نظر نہیں آتی وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس قانون فطرت کا بنانے والا اور اس کے مطابق ساری کائنات کا نظم وانصرام کرنے والا ایک ہی وجود برتر ہے، ایک سے زیادہ ہونے کی صورت میں نظم کائنات میں اختلال وانتشار ناگزیر ہے۔ اسی حقیقت کا نام مذہب کی اصطلاح میں توحید ہے۔

مظاہر کائنات پر غوروفکر سے دوسری اہم حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ عالم مادی برحق (بالحق) ہے، یہ کوئی نظر کا دھوکہ اور فریب خیال نہیں ہے، جیسا کہ ہر دور کے اکثر صوفیاء کا خیال رہا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس عالم مادی کو بقا ودوام حاصل نہیں ہے۔ ہر شے کی طرح اس کی بھی ایک مدت حیات یا قرآن کے الفاظ میں ''اَجَلٍ مُسَمّٰی'' ہے۔ اس کے بعد اس کو نیست ونابود ہوجانا ہے اور پھر ایک دوسرا عالم نئے احوال وکوائف کے ساتھ وجود میں آئے گا۔ اسی حقیقت کو اسلام میں اصطلاحاً معاد کہا گیا ہے۔

توحید اور معاد کے ان بنیادی تصورات کی حقیقی تفہیم اس کے بغیر ممکن نہیں کہ انسان کائنات کے مختلف واقعات ومظاہر کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو اور جن پر غوروفکر کی دعوت قرآن میں بکثرت مقامات پر دی گئی ہے۔ خوش قسمتی سے اس سائنسی عہد میں وہ اسباب وذرائع موجود ہیں جن کی مدد سے مظاہر فطرت کی اصل حقیقت معلوم ہوسکتی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ جدید سائنسی علوم کی تحصیل از روئے قرآن

واجب ہے بالخصوص علماء پر کیوں کہ ان علوم کو حاصل کیے بغیر نہ تو تخلیق ارض و سما میں صحیح طور پر غور وفکر ممکن ہے اور نہ ہی توحید ومعاد سے متعلق قرآن کے آفاقی اور انفسی دلائل کی واقعی تفہیم ممکن ہے۔

یہاں ایک سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر توحید ومعاد سے متعلق قرآن مجید کے آفاقی اور انفسی دلائل کی تفہیم سائنسی علوم کی تحصیل پر منحصر ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ماضی میں جب جدید سائنسی علوم نہ تھے تو مسلمان، جن میں جلیل القدر علماء بھی شامل ہیں، ان دلائل کے فہم سے عاجز تھے اور توحید ومعاد پر ان کا ایمان بالکل سطحی اور غیر عاقلانہ تھا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ توحید ومعاد کے تصورات پر قرآن نے انفس و آفاق کے واقعات ومظاہر سے ایسے بلیغ اسلوب اور معجزانہ الفاظ میں استدلال کیا ہے کہ ہر دور کا انسان اپنی اپنی لیاقت واستعداد کے مطابق ان کا مفہوم سمجھتا رہا ہے اور ان کے مقصود ومطلوب کو بھی حاصل کرتا رہا ہے لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ فطرت کے واقعات ومظاہر کے ظہور کے اسباب وعلل کے حقیقی فہم وادراک سے ماضی کا انسان قاصر تھا۔ مثال کے طور پر فلکیاتی نظام کو لیجئے۔ یہ نظام فضائے بسیط میں جس قانون تجاذب کے نتیجے میں قائم ہے۔ اس سے ماضی کا انسان بالکل بے خبر تھا۔ لیکن جہاں تک فلکیاتی نظام کے مشاہداتی تاثرات کا تعلق ہے اس میں دور قدیم وجدید کا انسان مساوی حیثیت رکھتا ہے، یعنی جس طرح ماضی کا انسان اپنی ظاہری آنکھوں سے یہ دیکھ کر کہ ان گنت ستارے اور سیارے فضائے ناپیدا کنار میں کسی ظاہری سہارے کے بغیر مصروف گردش ہیں، متحیر رہ جاتا تھا اور اس کے دل میں خالق کائنات کے علم وحکمت اور اس کی عظمت وقدرت کے نقوش جاگزیں ہوجاتے تھے ٹھیک اسی طرح دور جدید کے ارباب علم وخرد جب بڑی بڑی رصد گاہوں سے طاقت ور دوربینوں کے ذریعے فلکیاتی نظام کا مشاہدہ کرتے ہیں تو وہ بھی یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ستارے اور سیارے اپنی کثرت تعداد، تیزی رفتار اور توسیع دائرہ حرکت کے باوجود کسی تصادم سے دو چار ہوئے بغیر حد درجہ حیران کن نظم وترتیب کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ لیکن قدیم اور جدید انسان کے مشاہد وتأثر کے درجے میں بہت نمایاں فرق ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ قرآن مجید خدا کا آخری کلام ہے اور تا وقوع قیامت یہ ہر دور کے انسانوں کے لئے حجت ہے اس لئے ماننا ہوگا کہ قرآن کی ان آیات کے اصلی مخاطب، جن

کا تعلق عالم فطرت کے پیچیدہ واقعات و مظاہر سے ہے، فی الواقع عصر حاضر کے انسان ہیں، قرآن مجید میں ایسی آیتیں بھی موجود ہیں جن کے اصل مخاطب آنے والے زمانے کے لوگ ہیں، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

قرآن مجید اور اسرار فطرت

قرآن مجید میں فطرت کے جن حقائق کو بے نقاب کیا گیا ہے ان میں سے بعض حقائق تو وہ ہیں جن کی صداقت دور حاضر کی سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں ہم پر بالکل عیاں ہوچکی ہے، لیکن بعض ایسے حقائق بھی ہیں جن تک ابھی سائنسی علوم کی رسائی نہیں ہوسکی۔ ان حقائق سے متعلق چند آیتیں گزشتہ صفحات میں علم طبیعات کے ذیل میں نقل کی گئی ہیں۔ یہاں صرف دو آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایک آیت کا تعلق معلوم حقائق سے اور دوسری آیت کا تعلق بڑی حد تک نا معلوم حقائق سے ہے۔پہلی آیت یہ ہے:

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ۔ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ۔ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَآئِبِ۔ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ۔(سورہ طارق:۵تا۸)

’’انسان دیکھے (یعنی غور کرے) کہ وہ کس چیز سے بنایا گیا ہے۔ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے بنایا گیا ہے۔ جو ریڑھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان (بَيْنَ الصُّلْبِ وَ التَّرَآئِب) سے نکلتا ہے۔ بیشک وہ اس کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے‘‘۔

اس آیت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا مادہ منویہ (Seminal Fluid) پسلیوں اور ریڑھ کے درمیان سے نکلتا ہے۔ نزول قرآن سے پہلے کے طبی لٹریچر جس میں یونانی طبی لٹریچر بھی شامل ہیں، اور اس کے بعد طبی لٹریچر میں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اس انسان کا مادۂ منویہ پسلیوں اور ریڑھ کے درمیان سے نکلتا ہے۔ اس سلسلے میں جدید علم تشریح (Anatomy) کا بیان یہ ہے کہ ماء دافق (منی) انثیین(Testicles) میں بنتا ہے اور چھوٹی چھوٹی رگوں کے ذریعے ایک بڑی خم دار نلی میں آتا ہے جسے خصیۂ فوقانی (Epididymis) کہتے ہیں اور وہاں سے ایک بڑی نلی، مجری ناقل (Deferent duct)کے ذریعے کیسۂ منی (Seminal Vesicle)میں آتا ہے۔جہاں سے وہ مجری دافع (Ejaculatory)کے ذریعے خارج ہوتا ہے۔

اس جدید تشریحی بیان کی روشنی میں قرآن کا بیان بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا بیان بالکل سچائی پر مبنی ہے جدید تشریحی تحقیقات (ModernAnatomicalResearch) سے معلوم ہوا کہ خصیے کا اصلی مقام فوطہ نہیں بلکہ ٹھیک وہ جگہ ہے جسے قرآن میں بین الصلب والترائب کہا گیا ہے۔ چوں کہ اندرون شکم درجہ حرارت زیادہ ہوتا ہے اور یہ خصیوں میں تولید جراثیم کے عمل میں مانع ہے اس لیے دسویں قمری مہینے کے اختتام پر یعنی بچے کی پیدائش سے کچھ پہلے خصیے، فوطے میں منتقل ہوجاتے ہیں لیکن اخراج منی کے عصبی نظام کا کنٹرول بین الصلب والترائب ہی کے مقام پر رہتا ہے۔ چنانچہ بوقت جماع یا کسی بھی شہوانی خیال کے تحت جب دماغ سے برقی رو اس مقام یعنی حرام مغز کے صلبی حصے (Lumbar Region) کے مرکز اعصاب کو پہنچتی ہے تو اس کی تحریک (Trigor Action) سے کیسۂ منویہ سکڑتا ہے اور منی ماء دافق کی صورت میں خارج ہوتی ہے۔[1]

نامعلوم حقائق سے متعلق دوسری آیت ملاحظہ ہو:

يَمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَن تَنفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَانفُذُوا لَا تَنفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ. فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ. يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنتَصِرَانِ. فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ. فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ. فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ. (سورہ رحمن: ۳۳ تا ۳۸)

''اے گروہ انس وجن! اگر تم اس کی طاقت رکھتے ہو کہ زمین اور آسمان کے کناروں (فضائی حدود) سے نفوذ [2] کرسکو تو نفوذ کرو، تم نفوذ نہیں کرسکتے مگر طاقت کے ساتھ۔ تم اپنے رب کے کن کن کرشموں [3] کو جھٹلاؤ گے۔ (جب تم طاقت کے استعمال کے بعد نفوذ کرو گے تو) تم پر آگ کا شعلہ [4] اور دھواں [5] چھوڑ دیا جائے گا جس کا تم مقابلہ نہ کرسکو گے۔ تم اپنے رب کی کن کن قدروں کو جھٹلاؤ گے۔

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھیں: گریز ناظمی، ص ۲۶۱، ۵۵۴ مزید دیکھیں مضمون: قرآن اور علم الجنین، جو اسی کتاب میں شامل ہیں۔

۲۔ نفوذ کے معنی چھید کر کے پار ہوجانے کے ہیں۔ نفذ الهم الرمية و فيها و منها کے معنی ہیں: تیر کا شکار میں لگ کر پار ہوجانا (منجد) مزید دیکھیں: لسان العرب، طبع بیروت، ۱۹۵۵ ج ۳، ص ۵۱۴

۳۔ الی کی جمع آلا ہے۔ اسکے دو معنی ہیں۔ ایک نعمت اور دوسرے قدرت وکرشمہ، حدیث میں ہے:۔ تفكروا في آلاء الله ولا تفكروا في الله۔ نابغہ کا شعر ہے: هم الملوك و ابناء الملوك لهم
فضل على الناس في الالاء والنعم (لسان العرب، ج ۱۴ طبع بیروت۔ ۱۹۵۶)

۴۔ شواظ کے معنی شعلے کے دھواں کے ہیں۔ سورج اور آگ کی گرمی کے معنی بھی آتے ہیں (لسان العرب، ج ۷، ص ۴۴۶، طبع بیروت، ۱۹۵۶ء)

۵۔ نحاس کے معنی دھواں کے ہیں یا ایسا دھواں جس میں شعلہ نہ ہو۔ (لسان العرب، ج ۶ ص ۲۲۷، طبع بیروت، ۱۹۵۶ء)

(پھر اس وقت کیا حال ہوگا) جب آسمان پھٹے گا (یعنی اس کی بندشیں کھل جائیں گے۔ اور وہ سرخ چمڑے[۱] کی طرح ہوجائے گا۔ تم اپنے رب کی کن کن قدروں کا انکار کروگے"۔

یہ قرآن مجید کی ایک اہم سورہ کی آیات ہیں اور گہرے غور وفکر کی طالب ہیں۔ ان آیات کی تفسیر میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس اختلاف کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ ان آیات کا تعلق ان حقائق فطرت سے ہے جن کی تہہ تک ابھی خود جدید سائنس بھی نہیں پہنچ سکی ہے۔ میں نے نظم کلام اور الفاظ قرآنی کی روشنی میں جو کچھ سمجھا ہے وہ بیان کرتا ہوں۔ ان آیات میں تین اہم باتیں بیان کی گئی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ انسان زمین کی فضائی حدود سے طاقت کے ذریعے نفوذ کرکے نظام شمسی کے دوسرے سیاروں کی حدود میں داخل ہوسکتا ہے، اور وہ داخل بھی ہو چکا ہے۔ آیت : لَاتَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطَانٍ "نفوذ نہیں کرسکتے مگر طاقت کے ساتھ" سے یہی مفہوم نکلتا ہے۔ آگے کی آیت: یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ۔ "تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا۔" سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن اکثر مفسرین نے اس آیت کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انسان زمین وآسمان کے کناروں یعنی ان کے حدود سے نفوذ نہیں کرسکتا ہے۔ اگر آیت کا یہ مفہوم ہے تو پھر آگے کی آیت جس میں آگ اور دھوئیں سے دو چار ہونے کا ذکر ہوا ہے اس کا کیا مطلب ہوگا؟ نظم کلام سے بالکل واضح ہے کہ یہ مقام آتش ودود تو زمین اور آسمانوں کی حدود سے نفوذ کرجانے کے بعد ہی آسکتا ہے۔ اب تک بین السیاراتی نفوذ کی انسانی کوششوں سے پہلی ہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔

دوسری اہم بات یہ بیان کی گئی ہے کہ انسان خواہ کتنی ہی جانفشانی کرے نظام شمسی کے سیاروں سے آگے اس کا گزر ممکن نہیں ہے۔ آیت: "یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَاتَنْتَصِرَانِ" تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا جس کا تم مقابلہ نہ کرسکو گے" اس عدم امکان پر دلالت کرتی ہے، لیکن آیت کا صحیح مفہوم مستقبل میں سائنس کی مزید خلائی پیش رفت ہی سے جانا جاسکے گا۔

۱- دھان کے معنی سرخ چمڑے کے ہیں (لسان العرب، ج ۱۳، ص ۱۶۲، طبع بیروت، ۱۹۵۶ء)

تیسری اہم بات جس کا ذکر ان آیات میں ہوا وہ یہ ہے کہ وقوع قیامت کے وقت نظام شمسی میں جو تبدیلیاں واقع ہوں گی ان میں سے ایک نمایاں تبدیلی یہ ہے کہ آسمان سرخ ہو جائے گا۔ آسمان کی اس سرخی کو قرآن نے چمڑے کی سرخی کے مشابہ قرار دیا ہے۔ ''وَرْدَةً كَالدِّهَانِ'' لیکن یہ مفہوم بھی ابھی غیر واضح ہے۔ آئندہ سائنسی تحقیقات سے حیات شمسی کے آخری ایام میں واقع ہونے والے اس واقعہ سماوی کی اصل حقیقت معلوم ہو سکے گی۔

قرآن مجید میں اس نوع کی آیات کی موجودگی سے بالکل ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ اس علیم وخبیر ہستی کا کلام ہے جو کائنات خلقت کے ہر راز سے واقف ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ ان آیات سے ان لوگوں کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ قرآن میں صرف انہی علوم کا تذکرہ ہوا ہے جو عربوں کو معلوم تھے۔ عرب تو کیا ماضی قریب کے انسان بھی ان حقائق فطرت سے واقف نہ تھے، حتی کہ دور جدید کا انسان بھی پورے طور پر ان سے آگاہ نہیں ہے۔

قرآن مجید اور تسخیر فطرت

سائنسی علوم سے متعلق متذکرہ صدر آیات سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو سائنسی طرز فکر عطا کرتا ہے اور انہیں ان علوم کی تحصیل کی ترغیب دیتا ہے جن کی مدد سے وہ نہ صرف فطرت کے واقعات ومظاہر کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں بلکہ خود فطرت کو مسخر کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کی درج ذیل آیت بڑی معنی خیز ہے، فرمایا:

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (سورہ جاثیہ:۱۳)

''اس نے اپنی طرف سے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور وفکر کرتے ہیں''۔

اس آیت کے علاوہ قرآن مجید کی دیگر آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے انسانوں کے لئے سورج، چاند ستاروں اور سمندروں کو مسخر کر دیا ہے۔ (نحل:۱۲، اعراف:۵۴) بعض آیات میں جانوروں کی تسخیر کا ذکر آیا ہے۔ (سورہ حج:۳۶) لیکن آیت مذکورہ بالا میں کسی مخصوص شے کی تسخیر کے

بجائے زمین اور آسمانوں کی جملہ اشیاء کی تسخیر کی بات کہی گئی ہے، حالانکہ اس کائنات مادی میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بالفعل انسانوں کے لئے مسخر نہیں ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ بالقوہ مسخر ہیں، بالفاظ دیگر اگر انسان اپنی عقل وفکر کی قوتوں کو صحیح طور پر بروئے کار لائے تو عالم فطرت کی غیر مسخر اشیاء کو بھی مسخر کرسکتا ہے۔ جدید سائنسی علوم کے انکشاف سے پہلے بجلی کی حقیقت اور اس کے فوائد سے انسان بے خبر تھا۔ فضائے بسیط میں ریڈیائی لہروں وغیرہ کے وجود سے بھی وہ آگاہ نہ تھا سائنس کی مسلسل تحقیقات کے نتیجے میں آج انسان فطرت کی ان غیر مسخر قوتوں کو مسخر کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ تسخیر فطرت کا عمل اگر اسی رفتار سے جاری رہا تو ایک دن انسان کو عالم فطرت پر مکمل بالادستی حاصل ہوجائے گی اور سَخَّرَلَكُمْ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ کا قرآنی بیان حقیقت واقعہ بن جائے گا۔

یہاں اس تلخ حقیقت کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا کہ موجودہ دور میں تسخیر فطرت کے لئے کی جانے والی جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے صرف اس لئے کہ وہ سائنسی علوم کی تحصیل میں پیچھے رہ گئے۔ اس غفلت کی ایک بڑی وجہ ذکر اور فکر میں تفریق ہے۔ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ہر دور میں ذکر کی طرف گیا اور فکر سے بے نیاز رہا، ایک چھوٹا سا طبقہ (اہل فلسفہ) فکر کی طرف مائل ہوا لیکن ذکر سے غافل رہا۔ ان کی یہ فکر بھی اہل یونان کے قیاسی فکر وفلسفہ کی مدد سے مابعد الطبیعاتی مسائل کے حل میں مدتوں الجھی رہی۔ انہوں نے مظاہر فطرت سے مطلق تعرض نہ کیا۔ حیرت ہے کہ مسلمانوں کے ان دونوں طبقات نے قرآن کی درج ذیل آیت کی موجودگی میں نہ صرف ذکر وفکر میں تفریق کی بلکہ فکر کی ایک ایسی راہ اختیار کی جو غیر قرآنی تھی۔ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۔ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (سورہ آل عمران:۱۹۰۔۱۹۱)

''بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں نشانیاں ہیں ان ارباب دانش کے لئے جو کسی حال میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے خواہ کھڑے ہوں، خواہ بیٹھے ہوں، خواہ لیٹے ہوں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور وفکر کرتے ہیں۔ (اس غور وفکر

کے نتیجے میں ان پر اصل حقیقت بے نقاب ہوجاتی ہے اور وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں) خدایا یہ سب کچھ جو تو نے پیدا کیا ہے بلاشبہ بے کار وعبث نہیں پیدا کیا ہے۔ یقیناً تو اس سے پاک ہے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے"۔

اس آیت میں صاف لفظوں میں صرف ان لوگوں کو دانش مند کہا گیا ہے جو خدا کو یاد بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ عالم ارض وسما کی تخلیق میں غوروفکر بھی کرتے ہیں۔ ملحوظ رہے کہ آیت میں تخلیق عالم میں غوروفکر کی بات کہی گئی ہے نہ کہ خالق کائنات کی ذات میں براہ راست غوروفکر۔ اگر اس آیت کو ٹھیک طور پر سمجھ لیا گیا ہوتا تو مسلمان کبھی فکروفلسفہ اور تصوف کی طرف مائل نہ ہوتا۔ اور یہ عین ممکن تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں جدید سائنس کی بنیاد پڑتی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

عقائد شناسی

بارہ اماموں کے مختصر حالات زندگی

علامہ سید محمد حسین طباطبائی

پہلے امام

امیر المومنین علیؑ [1] بنو ہاشم کے سردار حضرت ابو طالبؑ کے فرزند تھے۔ حضرت ابو طالبؑ رسول اکرمؐ کے چچا اور سرپرست تھے جو آنحضرتؐ کو اپنے گھر لے آئے تھے اور آپؐ کو اولاد کی طرح پالا تھا۔ آنحضرتؐ کی بعثت کے بعد بھی حضرت ابو طالبؑ جب تک زندہ رہے کفار عرب اور بالخصوص قریش کے مقابلے میں آپ کی مدافعت کرتے رہے۔

مشہور روایت کے مطابق حضرت علیؑ رسول اکرمؐ کی بعثت سے دس سال پہلے پیدا ہوئے۔ جب آپ چھ برس کے تھے تو مکہ اور اس کے گردونواح میں قحط پڑ گیا اور اس بنا پر آپ آنحضرتؐ کے کہنے پر اپنے والد بزرگوار کے گھر سے ان کے گھر منتقل ہو گئے اور یوں آنحضرتؐ کی براہ راست سرپرستی میں آ گئے۔ [2]

چند سال بعد جب رسول اکرمؐ منصب نبوت پر فائز ہوئے تو آپ پر پہلی وحی غار میں نازل ہوئی۔ جب آپؐ غار سے اپنے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے تو آپؐ کی ملاقات حضرت علیؑ سے ہوئی۔ آپؐ نے انہیں سارا ماجرا سنایا اور انہوں نے اسی وقت نیا دین قبول کر لیا [3] پھر ایک مجلس میں جس میں رسول اکرمؐ نے اپنے رشتے داروں کو جمع کیا تھا اور انہیں اسلام کی دعوت دی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا کہ جو شخص سب سے پہلے میری دعوت قبول کرے گا وہ میرا بھائی، وصی اور خلیفہ ہوگا اور اس موقع پر حضرت علیؑ واحد شخص تھے جو اٹھے اور ایمان لائے اور آنحضرتؐ نے ان کا ایمان قبول کیا۔ [4] پس حضرت علیؑ اسلام میں پہلے شخص تھے جو ایمان لائے اور آنحضرتؐ کے پیروؤں میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے خدائے واحد کے علاوہ کسی کی پرستش نہیں کی۔

۱۔ اہل تشیع میں 'امیر المومنین' لقب حضرت علیؑ کے لیے مخصوص ہے اور ان کے علاوہ کسی اور کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ (مدیر)

۲۔ الفصول المہمہ، ص ۴۱، اور مناقب خوارزمی، ص ۷۱

۳۔ ذخائر العقبیٰ، ص ۵۸، مناقب خوارزمی، ص ۱۶ تا ۲۲، اور ینابیع المودۃ، ص ۶۸ تا ۷۲

۴۔ ارشاد، مفید، ص ۳، اور ینابیع المودۃ، ص ۱۲۲

حضرت علیؑ ہمیشہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر رہے حتیٰ کہ آنحضرتؐ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی اور ہجرت کی رات جب کفار نے آنحضرتؐ کے گھر کا محاصرہ کررکھا تھا اور رات ختم ہونے پر گھر میں داخل ہوکر آپ کو آپؐ کے بستر پر شہید کردینا چاہتے تھے، حضرت علیؑ آپؐ کے بستر پر سوئے اور آپ گھر سے نکل کر مدینہ روانہ ہوگئے [۱] آنحضرتؐ کی روانگی کے بعد آپؐ کی خواہش کے مطابق حضرت علیؑ نے وہ تمام امانتیں لوگوں کو لوٹادیں جو انہوں نے آنحضرتؐ کے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ پھر آپ اپنی والدہ اور دختر رسولؐ اور دو اور خواتین کو لیکر مدینہ پہنچے۔ [۲]

مدینہ میں بھی خلوت اور کیا جلوت میں حضرت علیؑ ہمیشہ رسول اکرمؐ کے ہمراہ رہے۔ آنحضرتؐ نے اپنی اکلوتی اور پیاری بیٹی فاطمہؑ کو آپ کی زوجیت میں دے دیا اور جب آنحضرتؐ اپنے اصحاب کے مابین رشتۂ اخوت قائم کررہے تھے تو انہوں نے حضرت علیؑ کو اپنا بھائی قرار دیا۔ [۳] جن غزوات میں رسول اکرمؐ نے حصہ لیا ان سب میں حضرت علیؑ نے بھی شرکت کی بجز غزوۂ تبوک کیونکہ اس موقع پر آنحضرتؐ نے انہیں اپنا جانشین مقرر کرکے مدینہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا تھا [۴] آپ نے نہ کسی جنگ میں پسپائی اختیار کی اور نہ ہی کسی دشمن کو پیٹھ دکھائی۔ آپ نے رسول اکرمؐ کے کسی حکم سے کبھی بھی روگردانی نہیں کی۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا: علیؑ نہ حق سے جدا ہوتے اور نہ حق علیؑ سے جدا ہوتا ہے"۔ [۵]

رسول اکرمؐ کے وصال کے وقت علیؑ کی عمر ۳۳ سال تھی۔ اگرچہ آپ دینی فضائل کے لحاظ سے سب سے اول اور اصحاب رسولؐ میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے لیکن آپ کو اس بنا پر خلافت سے الگ کردیا گیا کہ ایک تو آپ نوعمر ہیں اور دوسرے آپ نے رسول اکرمؐ کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوکر مشرکین کا خون بہایا تھا اس لیے بہت سے لوگ آپ کے دشمن ہیں لہٰذا حضرت علیؑ کا تمام عوامی معاملات سے تعلق تقریباً بالکل ختم ہوگیا چنانچہ آپ خانہ نشین ہوکر باصلاحیت اشخاص کو الٰہی علوم کی تربیت دینے میں مشغول ہوگئے۔ پہلے تین خلفاء کا پچیس سالہ دور آپ نے اسی طرح گزارا تیسرے خلیفہ کے قتل ہوجانے کے بعد لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور آپ خلیفہ منتخب ہوگئے۔

۱- الفصول المہمہ، ص ۲۸ تا ۳۰، تذکرۃ الخواص، ص ۳۴، ینابیع المودۃ، ص ۱۰۵، اور مناقب خوارزمی، ص ۷۳، ۷۴

۲- الفصول المہمہ، ص ۳۴ ۳- الفصول المہمہ، ص ۲۰، تذکرہ الخواص، ص ۲۰ تا ۲۴، اور ینابیع المودۃ، ص ۶۳ تا ۶۵

۴- تذکرۃ الخواص، ص ۱۸، الفصول المہمہ، ص ۲۱، اور مناقب خوارزمی، ص ۷۴

۵- مناقب آل ابی طالب، مصنفہ محمد ابن علی ابن شہر آشوب، ج ۳، ص ۶۲ اور ۲۱۸، مطبوعہ قم، غایت المرام، ص ۵۳۹، اور ینابیع المودۃ، ص ۱۰۴

حضرت علیؑ نے اپنی خلافت کے زمانے میں جس کی مدت تقریباً چار سال نو ماہ تھی رسول اکرمؐ کی سیرت کی پیروی کی۔ آپ نے اپنی خلافت کو ایک تحریک اور انقلاب کی شکل دی اور کئی ایک اصلاحات نافذ کیں۔ قدرتی طور پر ان اصلاحات سے کئی ایک مفاد پرستوں کے مفادات خطرے میں پڑ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ کے ایک گروہ نے (جس میں طلحہ اور زبیر جنہیں ام المومنین عائشہؓ کی حمایت حاصل تھی اور بالخصوص معاویہ پیش پیش تھے) تیسرے خلیفہ کے قتل کو بہانہ بنا کر آپ کی مخالفت شروع کر دی اور بغاوت پر کمر بستہ ہو گئے۔

فتنہ و فساد کا قلع قمع کرنے کے لئے حضرت علیؑ نے ایک جنگ بصرہ کے نزدیک طلحہ اور زبیر کے خلاف لڑی جس میں ام المومنین عائشہؓ بھی شریک تھیں۔ اسے جنگ جمل کہا جاتا ہے۔ آپ نے ایک اور جنگ عراق اور شام کی سرحد پر معاویہ کے خلاف لڑی جو ڈیڑھ سال جاری رہی یہ جنگ صفین کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے نہروان کے مقام پر ایک جنگ خوارج[1] کے خلاف لڑی جو جنگ نہروان کہلاتی ہے لہٰذا حضرت علیؑ کی خلافت کا بیشتر وقت اندرونی مخالفت پر قابو پانے میں صرف ہوا۔ بالآخر ۱۹ رمضان المبارک ۴۰ھ کو صبح کے وقت جب آپ مسجد کوفہ میں نماز میں مشغول تھے، عبدالرحمٰن ابن ملجم نامی ایک خارجی نے آپ کو زخمی کر دیا جس کے نتیجے میں ۲۱ رمضان المبارک کی رات کو آپ کی شہادت واقع ہو گئی[2]۔

حضرت علیؑ کے دوست اور دشمن دونوں اعتراف کرتے ہیں کہ انسانی کمال کے نقطۂ نگاہ سے آپ میں کوئی خامی نہ تھی اور اسلامی فضائل کے لحاظ سے آپ رسول اکرمؐ کی تربیت کا کامل نمونہ تھے۔ جو بحثیں آپ کی شخصیت کے بارے میں کی گئی ہیں اور جتنی کتابیں اس موضوع پر سنی شیعہ اور دوسرے مذاہب کے علماء اور محققین نے لکھی ہیں اس کی نظیر تاریخ کی کسی اور شخصیت کے بارے میں نہیں ملتی۔

علم و دانش کے لحاظ سے حضرت علیؑ صحابۂ رسولؐ اور دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں سب سے بلند مرتبہ تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے علمی بیانات کے ذریعے اسلام میں منطق استدلال کا آغاز کیا اور معارف الٰہیہ پر فلسفیانہ بحث کی انہوں نے قرآن کے باطن کے بارے میں گفتگو کی اور اس کے متن کی حفاظت کے لئے عربی گرامر وضع فرمائی۔ وہ عربوں میں سب سے بلند پایہ خطیب تھے۔

۱۔ 'خوارج' جس کے لغوی معنی باہر نکل جانے والوں کے ہیں، ایک ایسے گروہ کا نام ہے جو جنگ صفین کے بعد حضرت علیؑ اور معاویہ دونوں کے مخالف ہو گئے تھے اور انہوں نے ایک انتہا پسند جماعت تشکیل دی جو حکومت وقت کے احکام نہیں مانتی تھی اور سنی اور شیعہ دونوں کی شدید مخالف تھی (مدیر)

۲۔ مناقب آل ابی طالب، ج ۳، ص ۳۱۲، الفصول المہمہ، ص ۱۳۱ تا ۱۳۳، اور تذکرۃ الخواص ص ۱۷۲ تا ۱۸۳

حضرت علیؑ کی شجاعت ضرب المثل تھی۔ ان تمام جنگوں میں جن میں انہوں نے رسول اکرمؐ کی زندگی میں یا ان کے بعد شرکت کی انہوں نے کبھی بھی کسی خوف یا اضطراب کا مظاہرہ نہیں کیا حالانکہ کئی ایک جنگوں نے مثلاً احد، حنین، خیبر اور خندق وغیرہ میں صحابہ اور اسلامی فوج کے سپاہی خوف کے مارے کانپ رہے تھے یا میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے لیکن حضرت علیؑ نے کبھی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی۔ ایسا کوئی دلاور جنگجو ان کے مقابلے پر نہیں آیا جو اپنی جان سلامت لے گیا ہو۔ اس کے باوجود ان کی جوانمردی کا یہ عالم تھا کہ کمزور دشمن کو ہرگز قتل نہیں کرتے تھے اور جو لوگ راہ فرار اختیار کرتے ان کا پیچھا نہیں کرتے تھے۔ وہ نہ تو شبخون مارتے تھے اور نہ ہی دشمن پر پانی بند کرتے تھے۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ انہوں نے جنگ خیبر میں جب قلعہ قاموس پر حملہ کیا تو اس کے دروازے کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔[۱] ایک ایسا ہی واقعہ اس دن پیش آیا جب فتح مکہ کے دن رسول اکرمؐ نے بتوں کو توڑنے کا حکم دیا۔ ہبل مکہ کے بتوں میں سب سے بڑا بت تھا۔ یہ پتھر کا ایک بہت بڑا مجسمہ تھا۔ خانہ کعبہ کے اوپر نصب کیا گیا تھا۔ رسول اکرمؐ کے حکم کے مطابق حضرت علیؑ آنحضرتؐ کے کندھے پر پاؤں رکھ کر خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ گئے اور ہبل کو اس کی جگہ سے اکھاڑ کر نیچے لڑھکا دیا۔[۲]

حضرت علیؑ پارسائی اور اللہ کی عبادت میں بھی منفرد تھے۔ چند ایسے لوگوں کو جواب دیتے ہوئے جنہوں نے حضرت علیؑ کی سختی کی شکایت کی تھی رسول اکرمؐ نے فرمایا:

''علیؑ کی شکایت نہ کرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں''۔[۳]

ایک صحابی ابو دردا نے مدینہ کے ایک نخلستان میں حضرت علیؑ کا بدن زمین پر پڑا ہوا دیکھا جو خشک لکڑی کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ وہ حضرت علیؑ کے گھر گئے تاکہ ان کی زوجۂ گرامی قدر، دختر رسول اکرمؐ کو اطلاع دیں اور ان کے حضور اظہار تعزیت کریں۔ حضرت فاطمہؑ نے فرمایا:

''میرے ابن عم (حضرت علیؑ) فوت نہیں ہوئے بلکہ اللہ کے خوف سے انہیں غش آ گیا ہے۔ ان کی یہ حالت اکثر ہو جاتی ہے''

حضرت علیؑ کی زیر دستوں پر مہربانی، بیچاروں سے ہمدردی اور حاجتمندوں اور غریبوں کے حق

۱- تذکرۃ الخواص، ص ۲۷ ۲- تذکرۃ الخواص، ص ۲۷، اور مناقب، خوارزمی، ص ۷۱

۳- مناقب ابی طالب، ج ۳، ص ۲۲۱، اور مناقب خوارزمی، ص ۹۲

میں سخاوت کے بارے میں بہت سے قصے مشہور ہیں۔ آپ جو کچھ میسر آتا غریبوں اور حاجتمندوں پر خرچ کر دیتے اور خود بڑی کٹھن اور سادہ زندگی گزارتے۔ آپ کو زراعت سے بیحد لگاؤ تھا اور آپ اپنا زیادہ تر وقت کنویں کھودنے، درخت لگانے اور کھیتی باڑی کرنے میں گزارتے تاہم جن کھیتوں میں آپ کاشت کرتے اور جو کنویں کھودتے انہیں غریبوں کے لئے وقف کر دیتے۔ آپ کے اوقاف ''صدقات علیؑ'' کے نام سے مشہور تھے اور آپ کے عہد کے آخری ایام میں ان سے چوبیس ہزار طلائی دینار کی معقول آمدنی ہوتی تھی[۱]۔

دوسرے امام

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام دوسرے امام تھے۔ وہ اور ان کے بھائی امام حسینؑ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اور دختر رسولؐ حضرت فاطمہؑ کے فرزند تھے۔ رسول اکرمؐ نے کئی دفعہ فرمایا: ''حسنؑ اور حسینؑ میرے بیٹے ہیں''۔ اسی بنا پر حضرت علیؑ اپنے دوسرے فرزندوں سے فرمایا کرتے تھے: ''تم میرے فرزند ہو اور حسنؑ اور حسینؑ رسول اللہؐ کے فرزند ہیں''۔[۲]

امام حسنؑ ہجرت کے تیسرے سال مدینہ میں پیدا ہوئے[۳] اور ان کا سات سال سے کچھ زیادہ عرصہ اپنے جد بزرگوار رسول اکرمؐ کی آغوش محبت میں گزرا۔ آنحضرتؐ کے وصال اور حضرت فاطمہؑ کی رحلت کے بعد جس کی درمیانی مدت تین یا چھ ماہ سے زیادہ نہیں تھی۔ امام حسنؑ براہ راست اپنے والد بزرگوار کی زیر تربیت آ گئے۔

اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد امام حسنؑ اللہ کے حکم اور حضرت علیؑ کی وصیت کے مطابق منصب امامت پر فائز ہوئے اور ظاہری خلافت بھی سنبھالی۔ آپ نے چھ ماہ تک مسلمانوں کے امور کی سرپرستی فرمائی۔ اس دوران امیر شام معاویہ نے جو حضرت علیؑ اور ان کے خاندان کے سخت مخالف تھے اور جنہوں نے کئی سال تک شروع میں تیسرے خلیفہ کے قتل کے قصاص کے بہانے اور بعد میں خلافت کے دعویدار کی حیثیت سے حضرت علیؑ سے لڑائیاں لڑی تھیں، اپنی فوج عراق میں اتار دی

۱۔ نہج البلاغہ، ص ۶۷۱، ترجمہ مفتی جعفر حسین ۲۔ مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۲۱ اور ۲۵، اور ذخائر العقبیٰ، ص ۶۷ اور ۱۲۱
۳۔ مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۲۸، دلائل الامامت، تالیف محمد بن جریر طبری، مطبوعہ نجف ۱۳۶۹ھ، ص ۶۰، الفصول المہمہ، ص ۱۳۳، تذکرۃ الخواص، ص ۱۹۳، تاریخ یعقوبی، ج ۲ ص ۲۰۴، مطبوعہ نجف ۱۳۱۴ھ اور اصول کافی، ج ۱ ص ۴۶۱، ارشاد، مفید، ص ۱۷۲، مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴ ص ۳۳، اور الفصول المہمہ، ص ۱۳۴

جہاں امام حسنؑ کی خلافت قائم تھی۔ نتیجتاً جنگ چھڑ گئی جس کے دوران معاویہ نے بتدریج امام حسنؑ کی فوج کے سرداروں کو بھاری رقموں اور پرکشش وعدوں کے عوض خرید لیا حتیٰ کہ امام حسن علیہ السلام کی فوج نے آپ کے خلاف بغاوت کردی۔[1]

بالآخر امام حسن علیہ السلام امیر شام معاویہ سے صلح کرنے اور خلافت سپرد کرنے پر مجبور ہوگئے۔ عہد نامۂ صلح میں یہ شرائط بھی شامل تھیں کہ معاویہ کے بعد خلافت دوبارہ امام حسنؑ کو لوٹا دی جائے گی اور ان کے خاندان اور حمایتیوں سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔[2]

یوں امیر شام نے اسلامی خلافت پر قبضہ کرلیا اور عراق میں اپنا عمل دخل کرلیا عوام کے ایک مجمع میں تقرر کرتے ہوئے انہوں نے رسمی طور پر صلح کی شرائط کو کالعدم قرار دیا[3] اور اہل بیت رسولؐ اور شیعوں پر ہر ممکن طریقے سے سختی کی۔ امام حسنؑ نے اپنی امامت کے دس سال انتہائی تکلیف اور پریشانی میں گزارے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں بھی محفوظ نہ تھے۔ ۵۰ھ میں انہیں ان کی بیوی نے زہر دیکر شہید کردیا۔ جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے کہ انہیں اس کام پر امیر شام نے آمادہ کیا۔[4]

انسانی کمالات میں امام حسنؑ اپنے والد کی یادگار اور اپنے جد بزرگوار کا کامل نمونہ تھے۔ رسول اکرمؐ جب تک زندہ رہے امام حسنؑ اور ان کے بھائی (امام حسینؑ) ان کی آغوش محبت میں رہے اور بعض اوقات آنحضرتؐ انہیں اپنے کندھوں پر بھی سوار کرتے تھے۔ سنی اور شیعہ دونوں ذرائع نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے بارے میں آنحضرتؐ کی یہ حدیث روایت کی ہے:

''میرے یہ دونوں فرزند امام ہیں خواہ وہ کھڑے ہوں یا بیٹھے ہوں''۔ (اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ خواہ انہیں ظاہری خلافت حاصل ہو یا نہ ہو)[5]

علاوہ ازیں امام حسنؑ کے اپنے والد بزرگوار کے بعد منصب امامت پر فائز ہونے کے بارے میں رسول اکرمؐ اور حضرت علیؑ سے بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں۔

۱- ارشاد مفید، ص ۱۷۲، مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴ ص ۳۳، الامامۃ والسیاسۃ، مصنفہ عبد اللہ ابن مسلم ابن قتیبہ، ج ۱ ص ۱۶۳، الفصول المہمہ، ص ۱۴۵، اور تذکرۃ الخواص، ص ۱۹۷ ۲- ارشاد، ص ۱۷۳، مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۳۵، اور الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱، ص ۶۴ ۳- ارشاد، ص ۱۷۴، مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴ ص ۴۲، الفصول المہمہ، ص ۱۴۶، اور تذکرۃ الخواص، ص ۲۱۱ ۴- ارشاد، ص ۱۸۱، اور اثبات الہداۃ، ج ۵، ص ۱۲۹ اور ۱۳۴ ۵- ارشاد مفید، ص ۱۷۲، مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۳۳، الامامۃ والسیاسۃ، مصنفہ عبد اللہ ابن مسلم ابن قتیبہ، ج ۱ ص ۱۶۳، الفصول المہمہ، ص ۱۴۵، اور تذکرۃ الخواص، ص ۱۹۷

تیسرے امام

سید الشہداء امام حسینؑ تیسرے امام تھے۔ آپ حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کے فرزند تھے۔ آپ ۴ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے بھائی حسن مجتبیٰؑ کی شہادت پر امر خداوندی اور اپنے والد بزرگوار کی وصیت کے مطابق امام بنے۔[۱] آپ کی امامت کی مدت دس سال تھی جو آخری تقریباً چھ ماہ کے علاوہ ساری کی ساری معاویہ کے عہد میں گزری۔ آپ نے یہ دن انتہائی تکلیف میں گزارے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو دینی احکام اور دین اپنا وزن اور اعتبار کھو بیٹھے تھے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی جگہ اموی حکومت کی خواہشات اور احکام نے لے لی تھی اور دوسرے معاویہ اور ان کے حامی اہلبیتؑ اور ان کے حامیوں کو کچلنے اور علیؑ اور ان کے اہل خاندان کا نام ونشان مٹانے کی کوششوں میں مصروف تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ معاویہ اپنے بیٹے یزید کی خلافت کی بنیاد مستحکم کرنا چاہتے تھے حالانکہ بہت سے لوگ یزید کے گھٹیا کردار کی بنا پر اس تجویز پر خوش نہیں تھے۔ چنانچہ معاویہ نے یزید کی مخالفت کا قلع قمع کرنے کے لئے زیادہ سختی شروع کردی تھی اور نئے نئے ہتھکنڈے استعمال کرنے لگے تھے۔

امام حسینؑ بہ امر مجبوری یہ دن کسی نہ کسی طرح گزار رہے تھے اور معاویہ اور اس کے حامیوں کا تشدد اور سخت گیری برداشت کررہے تھے حتیٰ کہ ۶۰ ہجری میں معاویہ کی موت واقع ہوگئی اور یزید نے ان کی جگہ سنبھالی۔[۲]

''بیعت'' عرب کی ایک قدیم روایت تھی جو اہم کاموں مثلاً بادشاہت یا امارت کے سلسلے میں لی جاتی تھی۔ رعایا کے افراد اور بالخصوص سربرآوردہ اشخاص بیعت کرکے بادشاہ یا امیر کی اطاعت کا اقرار کرتے تھے اور یوں اس کے افعال کی تائید کرتے تھے۔ بیعت کرنے کے بعد بادشاہ یا امیر کی مخالفت کرنا باعث شرم سمجھا جاتا تھا اور یہ ایسا ہی تھا جیسے کہ کوئی شخص ایک قطعی پیمان کرکے اس کی خلاف ورزی کرے اور اسے جرم تصور کیا جاتا تھا۔ رسول اکرمؐ کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اگر بیعت مجبور ہوکر نہیں بلکہ اپنی مرضی اور اختیار سے کی جائے تو معتبر ہے۔

معاویہ نے ممتاز لوگوں کو یزید کی بیعت کرنے کے لیے کہا تھا لیکن اس نے امام حسینؑ کو اس پر

۱۔ ارشاد، ص ۲۰۷، مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۷۳، الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱، ص ۱۴۳

۲۔ ارشاد، ص ۲۰۷، مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۸۸، الفصول المہمہ، ص ۱۶۰، اور تذکرۃ الخواص، ص ۲۱۱

مجبور نہیں کیا تھا۔ اس نے بالخصوص اپنی آخری وصیت میں یزید سے کہا تھا کہ اگر امام حسینؑ بیعت سے انکار کریں تو انہیں مجبور نہ کرے بلکہ خاموشی اور چشم پوشی سے کام لے۔ اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ اگر امام حسین علیہ السلام پر اس سلسلے میں دباؤ ڈالا گیا تو اس کے خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔ تاہم یزید نے اپنی خود پسندی اور ناعاقبت اندیشی کی بناپر اپنے باپ کی وصیت کو نظر انداز کردیا اور اس کی موت کے فوراً بعد مدینہ کے گورنر کو حکم بھیجا کہ امام حسینؑ کو بیعت کرنے پر مجبور کرے یا ان کا سرکاٹ کر دمشق بھیج دے [۲]۔

جب والیٔ مدینہ نے امام حسینؑ کو صورت حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے مہلت مانگی اور پھر راتوں رات اپنے اہل خاندان کے ساتھ مکہ روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے خانہ کعبہ میں پناہ لی جسے اسلام میں رسمی طور پر دارالامان تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ۶۰ ہجری کے ماہ رجب کے آخری دنوں میں اور ماہ شعبان کے شروع میں پیش آیا۔ امام حسینؑ تقریبا چار ماہ تک مکہ میں پناہ لیے رہے اور یہ خبر ساری اسلامی دنیا میں پھیل گئی۔ ایک طرف تو ان لوگوں نے جو معاویہ کی غیر عادلانہ حکومت سے بیزار تھے اور یزید کے خلیفہ بننے پر اور زیادہ برداشتہ ہوگئے تھے، امام حسینؑ سے رابطہ قائم کیا اور ان سے اظہار ہمدردی کیا اور دوسری طرف مختلف جگہوں سے اور خاص کر عراق سے اور بالخصوص عراق کے شہر کوفہ سے امام حسین علیہ السلام کو بیشمار خط لکھے گئے۔ جن میں آپ سے استدعا کی گئی تھی کہ وہاں آکر لوگوں کی قیادت سنبھالیں تاکہ ظلم اور ناانصافی کا قلع قمع کرنے کے لئے تحریک کی ابتداء کی جاسکے۔ بلاشبہ یہ صورت یزید کے لئے خطرناک تھی۔

امام حسینؑ مکہ میں ہی مقیم رہے حتیٰ کہ حج کا وقت آگیا اور ہر گوشے سے مسلمان مناسک حج ادا کرنے کے لئے گروہ در گروہ وہاں جمع ہونا شروع ہوگئے۔ اس دوران میں آپ کو اطلاع ملی کہ یزید کے کچھ سپاہی حاجیوں کے بھیس میں مکہ پہنچ گئے ہیں اور رسوم حج کی ادائیگی کے وقت اپنے احرام میں چھپائے ہوئے ہتھیاروں کے ذریعے آپ کو قتل کردینا چاہتے ہیں۔ [۳]

یہ اطلاع ملنے پر امام حسینؑ نے مناسک حج مختصر کرکے مکہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ اٹھے اور لوگوں کے جم غفیر کے سامنے ایک مختصر تقریر میں اپنی عراق کی جانب روانگی کا اعلان فرمایا [۴] انہوں

۱- ارشاد، ص ۱۸۱، اور اثبات الہداۃ، ج ۵، ص ۱۲۹ اور ۱۳۴

۲- ارشاد، ص ۱۷۹، اثبات الہداۃ، ج ۵، ص ۱۶۸ تا ۲۱۲، اور اثبات الوصیۃ مسعودی، ص ۱۲۵، مطبوعہ تہران ۱۳۲۰ھ

۳- ارشاد، ص ۱۸۲، تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۲۲۶ تا ۲۲۸، اور الفصول المہمہ، ص ۱۶۳ ۴- مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۸۸

نے اس مختصر خطاب میں یہ بھی بتایا کہ وہ شہید ہوجائیں گے اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کی مدد کریں اور اپنی جانیں اللہ کی راہ میں قربان کریں۔ اس سے اگلے دن اپنے اہل خاندان اور ساتھیوں کی ایک جماعت کے ساتھ عراق روانہ ہوگئے۔

امام حسینؑ نے طے کررکھا تھا کہ وہ یزید کی بیعت نہیں کریں گے اور یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ شہید کردیے جائیں گے۔ انہیں علم تھا کہ بنی امیہ کی دہشت ناک فوجی طاقت جسے عام بے راہ روی اور ذہنی انحطاط اور عوام میں اور بالخصوص اہل عراق میں جرأت کے فقدان کی تائید حاصل تھی انہیں ختم کردیگی۔ مکہ کے کچھ سربرآوردہ اشخاص نے انہیں روکنے کی کوشش کی اور اس سفر اور تحریک کے خطرات سے آگاہ کیا لیکن امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

" میں بیعت نہیں کروں گا اور ظالم اور ستمگر حکومت کو تسلیم نہیں کروں گا۔ میں جانتاہوں کہ میں جہاں بھی جاؤں گا اور جس جگہ بھی ہوں گا مجھے قتل کردیا جائے گا۔ میں مکہ اس لیے چھوڑ رہا ہوں تاکہ میرا خون بہنے سے اللہ کے گھر کی حرمت پامال نہ ہو"۔

امام علیہ السلام کوفہ روانہ ہوئے۔ ابھی آپ راستے میں ہی تھے اور کوفہ تک چند دن کا سفر باقی تھا کہ آپ کو اطلاع ملی کہ کوفہ میں یزید کے والی نے آپ کے نمائندے کو اور شہر کے ایک اور سرکردہ شخص کو جو آپ کا مخلص وحامی تھا قتل کرادیا ہے اور ان کے پاؤں میں رسی باندھ کر ان کی لاشیں گلیوں میں گھسیٹی گئی ہیں۔[۲] آپ کو یہ بھی پتا چلا کہ شہر اور اس کے گردونواح کی سخت نگرانی کی جارہی ہے اور دشمن کے لاتعداد سپاہی آپ کے انتظار میں ہیں اور آپ کے لیے قتل ہوجانے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا۔ اسی موقع پر امام علیہ السلام نے شہید ہوجانے کا قطعی فیصلہ کرلیا اور اپنا سفر جاری رکھا۔[۳]

کوفہ سے تقریباً ستر کیلومیٹر دور واقع ایک بیابان میں جس کا نام کربلا ہے۔ یزید کی فوج نے امام حسین علیہ السلام اور آپ کے ہمراہیوں کو گھیر لیا۔ انہوں نے یہاں آٹھ دن قیام کیا۔ اس دوران محاصرہ دن بدن تنگ ہوتا گیا اور دشمن کی تعداد بڑھتی گئی۔ بالآخر امام علیہ السلام، آپ کے اہل خاندان اور آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج نے گھیرے میں لے لیا۔[۴] ان

۱۔ مناقب، ابن شہرآشوب، ج ۴، ص ۸۸، ارشاد، مفید، ص ۱۸۲، الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱، ص ۲۰۳، تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۲۲۹، الفصول المہمہ، ص ۱۶۳، اور تذکرۃ الخواص، ص ۲۳۵ ۲۔ ارشاد، ص ۲۰۱

۳۔ مناقب، ابن شہرآشوب، ج ۴، ص ۸۹ ۴۔ ارشاد، ص ۲۰۱، الفصول المہمہ، ص ۱۶۸

دنوں میں آپ نے اپنی حالت مستحکم کی اور اپنے ساتھیوں کا قطعی انتخاب کیا۔ رات کے وقت آپ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور مختصر تقریر کے دوران فرمایا:

" اب ہمارے لیے موت اور شہادت کے علاوہ کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا اور دشمن میرے علاوہ کسی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے لہٰذا میں تم لوگوں سے اپنی بیعت اٹھائے لیتا ہوں۔ جو شخص چاہے وہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر جا سکتا ہے اور اپنی جان بچا سکتا ہے"۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا چراغ گل کر دیے جائیں۔ پھر آپ کے بہت سے ساتھی جو مادی منفعت کی امید پر آپ کے ساتھ ہو لیے تھے، چلے گئے اور حق کے شیدائیوں کی ایک مختصر جماعت (جن کی تعداد تقریباً چالیس تھی) اور بنی ہاشم کے کچھ افراد کے علاوہ آپ کے ساتھ کوئی نہ رہا۔[۱]

جو لوگ باقی رہ گئے تھے امام حسین علیہ السلام نے انہیں ایک دفعہ پھر جمع کیا، اور ان کا امتحان لیا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں اور ہاشمی قرابت داروں سے خطاب فرمایا اور دوبارہ کہا کہ دشمن کو میرے علاوہ کسی سے سروکار نہیں اور تم میں سے جو چاہے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ تاہم اس دفعہ بھی امام علیہ السلام کے باوفا ساتھیوں نے مختلف الفاظ میں جواب دیا کہ:

" ہم ہرگز اس راہ حق سے منہ نہیں موڑیں گے جس کے آپ پیشوا ہیں اور آپ کو اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک ہمارے بدنوں میں خون کا آخری قطرہ باقی ہے اور تلوار کا قبضہ ہاتھ میں ہے ہم آپ کا اور آپ کے خاندان کا دفاع کریں گے"۔[۲]

ماہ محرم کے نویں دن امام علیہ السلام کو دشمن کی طرف سے آخری چیلنج (بیعت یا جنگ) دیا گیا۔ امام علیہ السلام نے رات بھر عبادت کے لیے مہلت مانگی اور دوسرے دن قطعی جنگ لڑنے کا ارادہ کر لیا۔[۳]

محرم ۶۱ ہجری (بمطابق ۶۸۰ میلادی) کے دسویں دن (یوم عاشورہ) امام حسینؑ اپنی مختصر سی جماعت کے ساتھ دشمن کی بیکراں فوج کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے۔ آپ کے ساتھیوں کی تعداد نوے سے بھی کم تھی۔ ان میں آپ کے سابقہ چالیس ساتھی اور دشمن کی فوج کے تقریباً تیس سپاہی جو جنگ کی رات اور دن میں آپ سے آملے تھے، شامل تھے اور ان کے علاوہ آپ کے فرزندوں،

۱- مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۹۸ ۲- مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۹۹، ارشاد، ص ۲۱۴
۳- مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۹۸، ارشاد، ص ۲۱۴

بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں اور چچا زاد بھائیوں پر مشتمل ہاشمی قرابتدار تھے۔ اس دن انہوں نے صبح کے وقت جنگ شروع کی اور آخری دم تک لڑتے رہے حتیٰ کہ امام حسینؑ، تمام ہاشمی نوجوان اور امامؑ کے دوسرے تمام ساتھی شہید ہوگئے (ہائے افسوس! کہ ان ظالموں کو بچوں پر بھی رحم نہ آیا اور انہوں نے امام حسنؑ کے دو خورد سال فرزندوں اور امام حسینؑ کے ایک خورد سال اور ایک شیر خوار بچے کو بھی تیغ ستم سے گھائل کردیا۔)

جنگ کے خاتمے پر دشمن کی فوج نے امام حسینؑ کے حرم کو لوٹ لیا اور ان کے خیمے جلادیے۔ انہوں نے شہداء کے سر کاٹ لیے، ان کے لباس اتار لیے اور بغیر دفن کیے انہیں میدان میں پڑا رہنے دیا۔

پھر وہ حرم امامؑ کو ساتھ لے کر جو بیکس عورتوں اور لڑکیوں پر مشتمل تھا اور شہداء کے سر اٹھائے ہوئے کوفہ روانہ ہوگئے۔ اسیروں میں کل تین مرد تھے۔ ان میں ایک تو امام حسینؑ کے بائیس سالہ فرزند علیؑ ابن حسینؑ یعنی چوتھے امام تھے جو اس وقت بیحد علیل تھے۔ دوسرے علیؑ ابن حسینؑ کے چچا رسالہ فرزند محمد بن علیؑ تھے جو بعد میں پانچویں امام بنے اور تیسرے امام حسنؑ کے فرزند اور امام حسینؑ کے داماد حسن مثنیٰ تھے جو جنگ میں زخمی ہوگئے تھے اور مقتولین کے درمیان گرے ہوئے تھے۔ جب دشمنوں کی نظر ان پر پڑی تو وہ قریب المرگ تھے لیکن ایک سالار فوج کی سفارش پر انہوں نے ان کا سر نہیں کاٹا بلکہ قیدی بنا کر پہلے کوفہ اور پھر یزید کے پاس دمشق لے گئے۔

کربلا کا واقعہ اور اہل بیتؑ کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر شہر بہ شہر پھرانا اور جو تقریریں حضرت علیؑ کی دختر زینبؑ اور چوتھے امام نے (جو کہ قیدیوں میں شامل تھے) کوفہ اور شام میں کیں، ان سب چیزوں نے بنی امیہ کو رسوا کردیا اور امیر شام نے سالہا سال تک جو پروپگنڈا کیا تھا اس پر پانی پھر گیا۔ حالات اتنے نازک ہوگئے کہ یزید کو اپنے کارندوں کے فعل سے کھلے عام بیزاری کا اعلان کرنا پڑا۔ واقعہ کربلا بنی امیہ کے زوال کا اہم سبب ثابت ہوا۔ گو اسکے موثر ہونے میں کچھ تاخیر ہوگئی، لیکن اس واقعہ نے حقانیت کی جڑیں مضبوط کردیں۔ اس کا فوری نتیجہ وہ بغاوتیں اور شورشیں تھیں جو خونریز جنگوں کے ساتھ ساتھ بارہ سال کی مدت تک جاری رہیں۔ جن لوگوں نے امامؑ کے قتل میں حصہ لیا تھا ان میں سے ایک بھی سزا اور انتقام سے نہ بچ سکا۔

اگر امام حسینؑ اور یزید کے حالات زندگی اور اس زمانے کے حالات کا بغور مطالعہ کیا جائے اور تاریخ اسلام کے اس دور کا تجزیہ کیا جائے تو اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ان

حالات میں امام حسینؑ کے لیے بجز جام شہادت نوش کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا یزید کی بیعت کرنے کے یہ معنی ہوتے کہ امام حسین علیہ السلام اسلام سے کھلم کھلا بیزاری کا اعلان کررہے ہیں اور یہ آپ کے لیے ہرگز ممکن نہ تھا کیونکہ یزید نہ صرف یہ کہ اسلام اور اس کے احکام کا کوئی احترام نہ کرتا تھا بلکہ اس نے کمال دیدہ دلیری سے اس کے اصول اور قوانین کو کھلے عام پامال کرنے کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ اس کے پیشرو اگر دینی احکام کی خلاف ورزی بھی کرتے تھے تو دین کا لبادہ اوڑھ کر کرتے تھے اور کم از کم ظاہری طور پر دین کا احترام کرتے تھے اور رسول اکرمؐ اور عوام کی نظروں میں محترم بعض دینی شخصیتوں کے ساتھی ہونے پر فخر کرتے تھے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ان واقعات کے بعض مفسرین کا یہ کہنا غلط ہے کہ دو بھائیوں یعنی امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا مزاج الگ الگ تھا اور ان میں سے ایک نے صلح اور دوسرے نے جنگ کا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ جہاں ایک نے چالیس ہزار کا لشکر ہوتے ہوئے معاویہ سے صلح کرلی وہاں دوسرے نے چالیس آدمیوں کے دستے کے ساتھ یزید سے جنگ کی۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ امام حسین جس نے ایک دن کے لئے بھی یزید کی بیعت سے انکار کردیا، منصب امامت پر فائز ہونے کے بعد دس سال معاویہ کے عہد حکومت میں اس کی مخالفت کیے بغیر گزارے جیسے کہ اس سے پیشتر ان کے بھائی نے دس سال گزارے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر امام حسنؑ معاویہ کے خلاف جنگ کرتے تو وہ شہید ہوجاتے لیکن ان کی شہادت سے اسلام کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔ معاویہ ایک ہوشیار سیاستداں تھے جو اپنے صحابی رسول، کاتب وحی اور خال المومنین ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور اپنی حکومت کو مذہبی رنگ دینے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے چنانچہ معاویہ کی بظاہر دیندارانہ روش کی بنا پر ان کی (یعنی امام حسنؑ اور امام حسینؑ) کی شہادت کی کوئی وقعت نہ ہوتی۔ علاوہ ازیں اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے انہیں ملکہ حاصل تھا اس سے بعید نہ تھا کہ انہیں انہی کے ہوا خواہوں کے ہاتھوں قتل کرادیا جاتا اور پھر ان کا ماتم کیا جاتا اور ان کے خون کے قصاص کا دعویٰ کیا جاتا جیسا کہ تیسرے خلیفہ کے قتل کے سلسلے میں کیا تھا۔

چوتھے امام

چوتھے امام حضرت علی بن حسینؑ تھے جو زین العابدینؑ اور سجادؑ کے القاب سے مشہور ہیں۔ وہ تیسرے امام اور شاہ ایران یزدگرد کی دختر حضرت شہر بانو (شاہ زناں) کے فرزند تھے۔ وہ امام حسینؑ کے واحد فرزند تھے جو زندہ بچے کیونکہ ان کے باقی تین بھائی نوجوان علی اکبرؑ خورد سال جعفر اور شیر

خوار علی اصغر (عبد اللہ) سانحہ کربلا میں شہید ہو گئے تھے۔ ۱

اس سفر میں جس کا نتیجہ فاجعہ کربلا کی شکل میں نکلا امام سجادؑ بھی اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ تھے لیکن چونکہ آپ شدید طور پر علیل تھے اور ہتھیار باندھ کر لڑنے کے قابل نہ تھے اس لئے آپ کے جہاد میں شریک ہو کر جام شہادت نوش کرنے کی نوبت نہ آئی اور آپ کو خواتین کے ہمراہ دمشق لے جایا گیا۔ آپ نے کچھ مدت وہاں اسیری کی حالت میں گزاری لیکن بعد میں آپ کو عزت واحترام کے ساتھ مدینہ واپس بھیج دیا گیا کیونکہ یزید رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنا چاہتا تھا۔ آپ کو اموی خلیفہ عبد الملک کے حکم سے ایک دفعہ پھر بیڑیوں میں جکڑ کر مدینہ سے شام لے جایا گیا اور پھر مدینہ واپس کر دیا گیا۔ ۲

مدینہ واپس آنے پر امام سجادؑ نے گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ وہ اپنا بیشتر وقت عبادت الٰہی میں گزارتے تھے۔ تاہم آپ نے چند ایک شیعہ اکابرین مثلاً ابو حمزہ ثمالی اور ابو خالد کابلی سے رابطہ قائم رکھا۔ یہ لوگ دینی علوم امام علیہ السلام سے حاصل کرتے تھے اور اہل تشیع تک پہنچا دیتے تھے۔ اس طرح شیعیت کو کافی فروغ حاصل ہوا اور اس کا اثر پانچویں امامؑ کے زمانے میں ظاہر ہوا۔

چوتھے امامؑ نے دعاؤں کا ایک مجموعہ چھوڑا ہے جسے ''صحیفہ سجادیہ'' کہا جاتا ہے۔ اس میں ستاون دعائیں ہیں جو دقیق ترین معارف الٰہیہ پر مشتمل ہیں۔ اسے '' زبور آل محمدؐ'' کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ امام سجاد علیہ السلام ۳۵ سال منصب امامت پر فائز رہنے کے بعد ۹۵ ہجری (بمطابق ۷۱۲ میلادی) میں فوت ہوئے (کچھ شیعہ روایات کے مطابق اموی خلیفہ ہشام کی تحریک پر ولید بن عبد الملک نے آپ کو زہر دے کر شہید کیا)۔ ۳

پانچویں امام

پانچویں امام حضرت محمد بن علی الباقرؑ تھے جو چوتھے امام کے فرزند تھے (باقر کے معنی پھاڑنے والے کے ہیں اور یہ لقب آپ کو رسول اللہؐ نے دیا تھا) ۴ آپ ۵۷ ہجری (بمطابق ۶۷۵ میلادی) میں پیدا ہوئے۔ آپ واقعہ کربلا کے موقع پر موجود تھے اور اس وقت آپ کی عمر چار سال تھی۔ آپ اپنے

۱۔ مقاتل الطالبین، ص ۵۲ اور ۵۹ ۲۔ تذکرۃ الخواص، ص ۳۲۴، اثبات الہداۃ، ج ۵، ص ۲۴۲
۳۔ مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۱۷۶، دلائل الامامۃ، ص ۸۰، الفصول المہمہ، ص ۱۹۰
۴۔ ارشاد، مفید، ص ۲۴۶، الفصول المہمہ، ص ۱۹۳، مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۱۹۷

والد بزرگوار کے بعد امر الٰہی اور اپنے پیشروؤں کی وصیت کے مطابق منصب امامت پر فائز ہوئے۔ آپ کی وفات ۱۱۴ ہجری (بمطابق ۷۳۲ میلادی) میں ہوئی۔ بعض روایات کے مطابق اموی خلیفہ ہشام کے بھتیجے ابراہیم ابن ولید ابن عبد اللہ نے آپ کو زہر دیکر شہید کیا۔[1]

امام باقرؑ کے دور امامت میں بنی امیہ کے مظالم کی وجہ سے آئے دن اسلامی دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں بغاوتیں اور لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ علاوہ ازیں بنی امیہ میں باہمی اختلافات بھی تھے جن کی بنا پر خلیفہ اپنے معاملات میں مصروف رہتے تھے اور کسی حد تک اہل بیتؑ رسول کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے تھے۔ دوسری جانب سانحۂ کربلا اور اہل بیتؑ پر ڈھائے گئے مظالم کی بنا پر لوگ ائمہ کی جانب مائل ہو رہے تھے۔ ان عوامل کی بنا پر عوام اور بالخصوص اہل تشیع کے لئے ممکن ہوگیا کہ جوق در جوق مدینہ آئیں اور پانچویں امام کی خدمت میں حاضر ہوں۔ انہیں حقائق اسلام اور علوم اہل بیتؑ کی اشاعت کے لئے وہ مواقع نصیب ہوئے جو ان سے پہلے کسی امام کو میسر نہیں آئے تھے۔ کثیر احادیث جو پانچویں امامؑ سے روایت کی گئی ہیں اور بہت سے علماء اور شیعہ محققین جنہوں نے ان سے تربیت حاصل کی اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں۔ ان کے نام مشاہیر اسلام کی سوانح حیات کی کتابوں میں درج ہیں۔[2]

چھٹے امام

چھٹے امام حضرت جعفر بن محمد الصادقؑ پانچویں امامؑ کے فرزند ہیں۔ آپ ۸۳ھ (بمطابق ۷۰۲ میلادی) میں پیدا ہوئے اور ۱۴۸ھ (بمطابق ۷۶۵ میلادی) میں فوت ہوئے۔ شیعہ روایات کے مطابق عباسی خلیفہ منصور کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں آپ کو زہر دیکر شہید کیا گیا۔ وہ اپنے والد بزرگوار کی وفات پر امر الٰہی اور اپنے پیشروؤں کی وصیت کے مطابق منصب امامت پر فائز ہوئے۔

چھٹے امامؑ کو اپنے دور امامت میں اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے لیے بہتر مواقع اور سازگار فضا میسر تھی۔ یہ صورت اسلامی ممالک میں بغاوتوں اور بالخصوص "مسودہ" کی جانب سے بنی امیہ کی حکومت ختم کرنے کے لئے بغاوت سے اور ان خونریز جنگوں سے پیدا ہوئی جن کے نتیجے میں بنی امیہ

۱- اصول الکافی، ج ۱، ص ۴۶۹، ارشاد، ص ۲۴۵، الفصول المہمہ، ص ۲۰۲، ۲۰۳، تاریخ یعقوبی، ج ۳، ص ۶۳، تذکرۃ الخواص، ص ۳۴۰، دلائل الامامۃ، ص ۹۴، مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴ ص ۲۱۰

۲- ارشاد، ص ۲۴۵ تا ۲۵۳، نیز دیکھئے کتاب رجال کشی، مصنف محمد بن عمر بن عبدالعزیز کشی، مطبوعہ بمبئی ۱۳۱۷ھ، کتاب الرجال الطوسی، مصنف محمد ابن حسن طوسی، مطبوعہ نجف ۱۳۸۱ھ، کتاب فہرست طوسی، مطبوعہ کلکتہ ۱۲۸۱ھ، اور سوانح حیات پر دوسری کتابیں۔

کی خلافت ختم ہوگئی شیعہ تعلیمات کی اشاعت کے بہتر مواقع اس لیے بھی میسر آئے کہ پانچویں امامؑ نے اپنے بیس سالہ دور امامت میں اسلام کی صحیح تعلیمات اور اہل بیت رسولؐ کے علوم کی تبلیغ کے ذریعے اس مقصد کے لئے میدان ہموار کردیا تھا۔

امام صادقؑ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دینی علوم کی اشاعت اپنے دور امامت کے آخری ایام تک جاری رکھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بنی امیہ کی خلافت کا خاتمہ ہوا اور بنی عباس کی خلافت کا آغاز ہوا۔ آپ نے بہت سی علمی شخصیتوں مثلاً زرارہ، محمد بن مسلم، مومن طاق، ہشام بن حکمراں ابان بن تغلب، ہشام بن سالم، حریز، ہشام کلبی نسابہ، جابر بن حیان وغیرہ کی مختلف عقلی اور نقلی علوم میں تربیت کی حتیٰ کہ کچھ معروف سنی علماء مثلاً سفیان ثوری، حنفی مسلک کے بانی ابو حنیفہ، قاضی سکونی اور قاضی ابو البختری وغیرہ نے بھی آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے حلقۂ درس سے چار ہزار محدث اور دوسرے علوم کے ماہر فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔[۱]

جو احادیث پانچویں اور چھٹے امامؑ سے ہم تک پہنچی ہیں ان کی تعداد رسول اکرمؐ اور دوسرے تمام اماموں سے روایت کی گئی تمام احادیث سے زیادہ ہے۔ تاہم امامؑ کی زندگی کے آخری ایام میں آپ پر عباسی خلیفہ منصور نے سخت پابندیاں عائد کردیں۔ اس خلیفہ نے علوی سادات پر اتنی سختی کی اور انہیں اس بے رحمی سے قتل کیا کہ اس سفاکی کے سامنے بنی امیہ کے مظالم بھی ماند پڑ گئے۔ اس نے انہیں گروہ در گروہ قتل کیا اور کال کوٹھریوں میں بند کر کے اس وقت تک ایذائیں دیں جب تک ان کی موت واقع نہیں ہوگئی۔ بعض کی گردن ماردی گئی بعض کو زندہ دفن کردیا گیا اور کئی ایک کو عمارتوں کی بنیادوں اور دیواروں میں چن دیا گیا۔

اموی خلیفہ ہشام نے حکم دیا تھا کہ چھٹے امام کو گرفتار کر کے دمشق لایا جائے بعد میں عباسی خلیفہ السفاح نے آپ کو گرفتار کر کے عراق بلوایا اور بالآخر منصور نے آپ کو دوبارہ گرفتار کر کے سامرہ بلوایا اور اپنی زیر نگرانی رکھا۔ آپ کے ساتھ منصور کا رویہ جابرانہ اور ہتک آمیز تھا اور اس نے کئی دفعہ آپ کو شہید کرنے کے بارے میں سوچا۔[۲]

بالآخر آپ کو مدینہ واپس جانے دیا گیا۔ جہاں آپ نے اپنے ایام گوشہ نشینی میں گزارے حتیٰ کہ

۱۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۴۷۲، دلائل الامامۃ، ص ۱۱۱، ارشاد، ص ۲۵۴، تاریخ یعقوبی، ج ۳، ص ۱۱۹، الفصول المہمہ، ۲۱۲، تذکرۃ الخواص، ۳۳۶، مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۲۸۰ ۲۔ ارشاد، ص ۲۵۴، الفصول المہمہ، ص ۲۰۴، مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۲۴۷

منصور کی سازش سے آپ کو زہر دیکر شہید کردیا گیا۔[1]

جب منصور کو امامؑ کی شہادت کی اطلاع ملی تو اس نے مدینہ کے والی کو خط لکھا اور ہدایت کی کہ امامؑ کے گھر جائے اور ان کے اہل خانہ سے تعزیت کے بہانے ان کا وصیت نامہ حاصل کرکے پڑھے اور اگر امامؑ نے کسی کو اپنا وصی مقرر کیا ہو تو اسی وقت اس کی گردن اڑادے۔ یہ حکم دینے سے بلاشبہ منصور کا مقصد یہ تھا کہ امامت کا سلسلہ ختم کردے اور شیعیت کی شمع مکمل طور پر گل کردے تاہم اس کے منصوبے کے برعکس جب والئی مدینہ نے اس کے حکم کے مطابق وصیت نامہ پڑھا تو اسے معلوم ہوا کہ امامؑ نے اپنی وصیت پر عملدرآمد کے لئے چار اشخاص یعنی خود خلیفہ اور والئی مدینہ اور اپنے بڑے بیٹے عبداللہ افطح اور چھوٹے بیٹے موسیٰؑ کو نامزد کیا ہے۔ یوں منصور بہ ناکام ہوگیا۔ [2]

ساتویں امام

ساتویں امام حضرت موسیٰ الکاظمؑ چھٹے امام کے فرزند تھے۔ آپ ۱۲۸ھ (بمطابق ۷۴۴ میلادی) میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳ ہجری میں قید خانے میں زہرخورانی کی وجہ سے شہید ہوئے۔ [3] آپ اپنے والد بزرگوار کی شہادت پر امر الٰہی اور اپنے آباء واجداد کی وصیت کے مطابق منصب امامت پر فائز ہوئے۔

ساتویں امامؑ عباسی خلفاء منصور ہادی، مہدی اور ہارون کے ہمعصر تھے۔ انہوں نے اپنا وقت سخت تقیہ کی حالت میں بڑی تکلیف اور پریشانی میں گزارا، حتیٰ کہ ہارون سفر حج کے دوران مدینہ آگیا اور امام علیہ السلام کو مسجد نبوی میں نماز پڑھتے ہوئے گرفتار کرکے زنجیروں میں کسا اور قید خانے میں ڈال دیا۔ پھر آپ کو مدینہ سے بصرہ اور وہاں سے بغداد لے جایا گیا اور سالہا سال تک مختلف قید خانوں میں منتقل کیا جاتا رہا۔ آخر کار بغداد میں واقع سندی ابن شاھک کے قید خانے میں زہرخورانی کی وجہ سے آپ کی شہادت واقع ہوگئی [4] اور ورقریش کے قبرستان میں دفن ہوئے جواب شہر کاظمیہ کہلاتا ہے۔

آٹھویں امام

آٹھویں امام حضرت علی الرضاؑ ساتویں امامؑ کے فرزند تھے۔ مشہور روایات کے مطابق آپ ۱۴۸ ہجری (بمطابق ۷۶۵ میلادی) میں پیدا ہوئے اور ۲۰۳ھ (بمطابق ۸۱۷ میلادی) میں فوت

۱- الفصول المہمہ، ص ۲۱۲، دلائل الامامۃ، ص ۱۱۱، اثبات الوصیۃ، ۱۴۲ ۲- اصول کافی، ج ۱، ص ۳۱۰

۳- اصول کافی، ج ۱، ص ۴۷۶، ارشاد، ص ۲۷۰، الفصول المہمہ، ۲۱۴ تا ۲۲۳، دلائل الامامۃ، ص ۱۴۶ تا ۱۴۸، تذکرۃ الخواص، ص ۳۴۸ تا ۳۵۰، مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۳۲۴، تاریخ یعقوبی، ج ۳، ص ۱۵۰ ۴- ارشاد، ص ۲۷۹ تا ۲۸۳، دلائل الامامۃ، ص ۱۴۸ تا ۱۵۴، الفصول المہمہ، ص ۲۲۲، مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۳۲۳ تا ۳۲۷، تاریخ یعقوبی، ج ۳، ص ۱۵۰

ہوئے۔[۱] آپ امر الٰہی اور اپنے آباء واجداد کی وصیت کے مطابق اپنے والد بزرگوار کی وفات پر منصب امامت پر فائز ہوئے۔ آپ اپنی امامت کے زمانے میں عباسی خلفاء ہارون اور اس کے بیٹوں امین اور مامون کے ہمعصر تھے۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد مامون اور امین آپس میں الجھ گئے جس کے نتیجے میں خونریز جنگیں ہوئیں۔ بالآخر امین مارا گیا اور مامون خلیفہ بن گیا[۲] اس وقت تک عباسی خلفاء کا شیعوں کے ساتھ برتاؤ بڑا سخت اور ظالمانہ تھا۔ چنانچہ آئے دن حضرت علیؑ کے حامی (علوی) علم بغاوت بلند کرتے۔ نتیجہ خونریز جنگیں ہوتیں جو خلفاء کے لئے بڑی تشویش کا باعث تھیں۔

ائمہ اہل بیتؑ نہ تو بغاوت کرنے والوں کے ساتھ تعاون کرتے اور نہ ہی ان کے معاملات میں دخل دیتے تھے۔ اس زمانے کے شیعہ جن کی تعداد اچھی خاصی تھی ائمہ علیہم السلام کو اپنے واجب الاطاعت روحانی پیشوا اور امام سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک وہی رسول اکرمؐ کے حقیقی خلیفہ تھے۔ وہ خلافت کو ائمہؑ کے مقدس دائرہ اختیار سے دور سمجھتے تھے کیونکہ اس وقت خلافت نے قیصر وکسریٰ کے درباروں کی وضع اختیار کر لی تھی اور وہ لوگ اس کا کاروبار چلا رہے تھے جنہیں دینی احکام کے اجراء کی بجائے دنیاوی حکومت میں زیادہ دلچسپی تھی۔ اس صورت حال کا باقی رہنا خلافت وقت کے لئے بیحد خطرناک تھا۔

جن مشکلات پر مامون کے عباسی آباء واجداد کے ستر سال پرانے طریق کار کے ذریعے قابو نہیں پایا جاسکا تھا انہیں حل کرنے کے لئے اس نے ایک نئی تجویز سوچی۔ چنانچہ اس نے آٹھویں امام کو اپنا ولی عہد نامزد کردیا۔ اس طرح وہ دو مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اول یہ کہ سادات علوی حکومت کے خلافت بغاوت نہیں کرسکیں گے کیونہ وہ خود حکومت کے کاروبار میں شریک ہوں گے۔ دوم یہ کہ امامونؑ پر سے لوگوں کے روحانی اعتقاد اور دلی عقیدت کا خاتمہ ہوجائے گا کیونکہ جب شیعہ دیکھیں گے کہ جس خلافت کو وہ ناپاک سمجھتے رہے خود ان کے امامؑ اس سے وابستہ ہوگئے ہیں اور دنیاوی معاملات میں دلچسپی لینے لگے ہیں تو وہ ان سے بدظن ہوجائیں گے۔ یوں ان کی مذہبی تنظیم کا خاتمہ ہوجائے گا اور وہ خلافت کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقاصد حاصل ہوجانے کے بعد امامؑ کو راستے سے ہٹادینا عباسیوں کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔[۳]

۱۔ اصول الکافی، ج ۱، ص ۴۸۶، ارشاد، ص ۲۸۴ تا ۲۹۵، دلائل الامامۃ، ص ۱۷۵ تا ۱۷۷، الفصول المہمہ، ص ۲۲۵ تا ۲۲۶، تاریخ یعقوبی، ج ۳ ص ۱۸۸ ۲۔ اصول الکافی، ج ۱، ص ۴۸۸، الفصول المہمہ، ص ۲۳۷

۳۔ دلائل الامامۃ، ص ۱۹۷، مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۳۶۳

اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مامون نے امامؑ کو مدینہ سے مرو بلوا بھیجا۔ جب آپ وہاں پہنچ گئے تو اس نے انہیں خلافت کی اور پھر ولی عہدی کی پیش کش کی۔ امامؑ نے معذرت کی اور مامون کی پیشکش قبول کرنے سے انکار کردیا لیکن بعد میں مجبوراً ولی عہدی اس شرط پر قبول کرلی کہ آپ حکومت کے کاروبار یا عمال کی تعیناتی یا برطرفی میں کوئی حصہ نہیں لیں گے۔[1]

یہ واقعہ ۲۰۰ء ہجری (بمطابق ۸۱۴ میلادی) میں پیش آیا تاہم مامون کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ اس نے امامؑ کو ولی عہد مقرر کرکے غلطی کی ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں شیعیت تیزی سے پھیلنے لگی۔ لوگوں کو امامؑ سے بے پناہ عقیدت ہوگئی اور عوام نے حتیٰ فوج اور سرکاری حکام نے بھی آپ کا والہانہ استقبال کیا۔ مامون نے اس مشکل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی اور بالآخر امام رضاعلیہ السلام کو زہر دیکر شہید کردیا۔ آپ ایران کے شہر طوس میں دفن ہوئے جو آج کل مشہد کہلاتا ہے۔

مامون نے عقلی علوم پر مبنی کتابوں کا دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ کرانے میں بیحد دلچسپی لی۔ وہ علمی مجالس منعقد کیا کرتا تھا جن میں مختلف ادیان اور مذاہب کے علماء جمع ہوتے تھے اور علمی مناظرے کرتے تھے۔ آٹھویں امامؑ بھی ان مجالس میں شرکت فرماتے اور دوسرے علماء سے مباحثہ اور مناظرہ کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سے مناظروں کی روئداد شیعوں کی حدیث کی کتابوں میں درج ہیں۔[2]

نویں امام

نویں امام حضرت محمد التقیؑ ہیں (جنہیں جواد اور ابن الرضا بھی کہاجاتا ہے) آپ آٹھویں امامؑ کے فرزند تھے۔ آپ ۱۹۵ ہجری (مطابق ۸۰۹ میلادی) میں پیدا ہوئے۔ شیعہ روایات کے مطابق آپ کی بیوی نے جو مامون کی بیٹی تھی عباسی خلیفہ معتصم کی تحریک پر آپ کو زہر دیدیا جس کے نتیجے میں ۲۲۰ ہجری (بمطابق ۸۳۵ میلادی) میں آپ کی شہادت واقع ہوگئی۔ آپ کو کاظمین میں آپ کے دادا یعنی ساتویں امامؑ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ آپ اپنے والد کی وفات پر امر الٰہی اور اپنے اجداد کی وصیت کے مطابق منصب امامت پر فائز ہوئے۔ اپنے والد کی وفات کے وقت آپ مدینہ میں تھے۔ مامون نے آپ کو بغداد بلا بھیجا (جو اس وقت دار الخلافت تھا) اور بظاہر آپ سے بڑا اچھا سلوک

۱- اصول الکافی، ج ۱، ص ۴۸۹، ارشاد، ص ۲۹۰، الفصول المہمہ، ص ۲۳۷، تذکرۃ الخواص، ص ۳۵۴، مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۳۶۳

۲- مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۳۵۱، اور کتاب احتجاج مصنفہ احمد علی ابن علی ابن ابی طالب الطبرسی، ج ۲، ص ۱۷۰ تا ۲۳۷، مطبوعہ نجف ۱۳۸۵ھ

کیا۔ اس نے اپنی بیٹی آپ کے نکاح میں دیدی اور آپ کو بغداد میں ہی رکھا۔ دراصل وہ اس ترکیب سے آپ پر اندرونی اور بیرونی دونوں اطراف سے نظر رکھنا چاہتا تھا۔ امامؑ نے کچھ وقت بغداد میں گزارا اور پھر مامون کی رضامندی سے مدینہ چلے گئے۔ آپ مامون کی وفات تک مدینہ میں ہی رہے لیکن معتصم خلیفہ بنا تو اس نے انہیں دوبارہ بغداد بلوا بھیجا اور جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے آپ کی بیوی کے ذریعے زہر دلواکر شہید کردیا۔[۱]

دسویں امام

دسویں امام حضرت علی النقیؑ تھے (جنہیں ہادی کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔) آپ نویں امامؑ کے فرزند تھے۔ آپ ۲۱۲ ہجری (بمطابق ۸۲۷ میلادی) میں مدینہ میں پیدا ہوئے اور شیعہ روایات کے مطابق ۲۵۴ ہجری (بمطابق ۸۶۸ میلادی) میں عباسی خلیفہ معتز نے زہر دے کر آپ کو شہید کردیا۔[۲]

دسویں امامؑ نے سات عباسی خلفاء یعنی مامون، معتصم، واثق متوکل، منتصر، مستعین اور معتز کا زمانہ دیکھا۔ معتصم کے دور حکومت میں آپ کے والد بزرگوار نے زہر خورانی کی وجہ سے ۲۲۰ ہجری (بمطابق ۸۳۵ میلادی) میں بغداد میں شہادت پائی۔ اس وقت حضرت علی بن محمد النقیؑ مدینہ میں تھے اور امر الٰہی اور اپنے اجداد کی وصیت کے مطابق آپ نے وہیں منصب امامت سنبھالا۔ آپ متوکل کے خلیفہ بننے تک مدینہ میں ہی مقیم رہے اور دینی علوم کی تعلیم دیتے رہے۔ ۲۴۳ ہجری (بمطابق ۸۵۷ میلادی) میں متوکل نے کچھ جھوٹے الزامات کی بنا پر اپنے ایک افسر کو ہدایت کی کہ آپ کو سامرہ آنے کو کہے جو اس وقت دار الخلافت تھا۔ اس نے خود امامؑ کو بھی ایک بڑا محبت آمیز خط لکھا جس میں آپ سے درخواست کی کہ سامرہ آکر اس سے ملیں۔[۳] سامرہ پہنچنے میں بھی بظاہر آپ سے اچھا سلوک کیا گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ متوکل نے آپ کو اذیت پہنچانے اور آپ کی توہین وتذلیل کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ اس نے کئی بار آپ کو قتل یا ذلیل کرنے کے لئے اپنے پاس بلوایا

۱۔ ارشاد، ص ۲۹۷، اصول الکافی، ج ۱، ص ۴۹۲ تا ۴۹۷، دلائل الامامۃ، ص ۲۰۱ تا ۲۰۹، مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۳۷۷ تا ۳۹۹، الفصول المہمہ، ص ۲۴۷ تا ۲۵۸، تذکرۃ الخواص، ص ۳۵۸

۲۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۴۹۷ تا ۵۰۲، ارشاد، ص ۳۰۷، دلائل الامامۃ، ص ۲۱۶ تا ۲۲۲، الفصول المہمہ، ص ۲۵۹ تا ۲۶۵، تذکرۃ الخواص، ص ۳۶۲، مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۴۰۱ تا ۴۲۰

۳۔ ارشاد، ص ۳۰۷ تا ۳۱۳، اصول کافی، ج ۱، ص ۵۰۱، الفصول المہمہ، ص ۲۶۱، تذکرۃ الخواص، ص ۳۵۹، مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۴۱۷، اثبات الوصیۃ، ص ۱۷۶، تاریخ یعقوبی، ج ۳، ص ۲۱۷

اور آپ کے گھر کی تلاشی بھی لی۔

خاندان رسالت سے دشمنی کے معاملے میں عباسی خلفاء میں متوکل کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اسے حضرت علیؑ سے بالخصوص عداوت تھی اور وہ آپ کو کھلم کھلا برا بھلا کہتا تھا۔ اس نے ایک مسخرے کو عیش وعشرت کی محفلوں میں حضرت علیؑ کی نقلیں اتارنے کا حکم دے رکھا تھا۔ ۲۳۷ ہجری (بمطابق ۸۵۰ میلادی) میں اس نے کربلا میں امام حسینؑ کے روضہ مبارک اور اس کے اردگرد واقع کئی مکانات کو مسمار کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد روضہ امامؑ پر پانی چھوڑ دیا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ روضۂ مبارک پر ہل چلا کر فصل بودی جائے تاکہ روضہ کا نام ونشان تک باقی نہ رہے۔[۱] متوکل کے دور میں حجاز میں مقیم علوی سادات کی زندگی کے حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہو گئے تھے کہ ان کی عورتوں کے پاس سر ڈھانکنے کے لئے چادریں تک نہ تھیں کئی مخدرات کے پاس ایک ہی چادر ہوتی جسے وہ نماز پڑھتے وقت استعمال کرتی تھیں۔ مصر میں مقیم علوی سادات پر بھی ایسی ہی سختی کی گئی۔[۲]

دسویں امامؑ نے متوکل کی ایذائیں اور سختیاں صبر سے برداشت کیں حتیٰ کہ وہ مرگیا اور اس کی جگہ منتصر، مستعین اور معتز یکے بعد دیگرے خلیفہ بنے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے معتز نے زہر دیکر آپ کو شہید کردیا۔

گیارھویں امام

گیارھویں امام حضرت حسن العسکریؑ جو دسویں امامؑ کے فرزند تھے ۲۳۲ء (بمطابق ۸۴۵ میلادی) میں پیدا ہوئے۔ کچھ شیعہ روایات کے مطابق آپ کو عباسی خلیفہ معتمد کی تحریک پر ۲۶۰ھ (بمطابق ۸۷۲ میلادی) میں زہر دے کر شہید کردیا گیا۔[۳]

آپ اپنے والد بزرگوار کی شہادت پر امر الٰہی اور اپنے اجداد کی وصیت کے مطابق منصب امامت پر فائز ہوئے۔ آپ کی امامت کے سات سالوں کے دوران آپ پر خلافت کی طرف سے اس قدر پابندیاں عائد کی گئیں کہ آپ کو بیمدت خانہ نشینی اور تقیہ کی حالت میں گزارنی پڑی، حتیٰ کہ آپ کا شیعہ عوام سے بھی کوئی معاشرتی رابطہ قائم نہ رہا اور فقط سرکردہ شیعہ اشخاص آپ سے مل سکتے تھے۔

۱- مقاتل الطالبین، ص ۳۹۵ ۲- مقاتل الطالبین، ص ۳۹۵، ۳۹۶

۳- ارشاد، ص ۳۱۵، دلائل الامامۃ، ص ۲۲۳، الفصول المہمہ، ص ۲۶۶ تا ۲۷۲، مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۴۲۲، اصول الکافی، ج ۱، ص ۵۰۳

علاوہ ازیں آپ کا زیادہ تر وقت قید خانہ میں گزرا۔[۱]

چونکہ اس زمانے میں شیعہ آبادی کی تعداد اور قوت میں کافی اضافہ ہوگیا تھا اس لیے ان پر بے حد سختی کی جانے لگی۔ سبھی جانتے تھے کہ شیعہ امامت پر اعتقاد رکھتے ہیں اور ان کے اماموں کے بارے میں بھی سب کو علم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دربار خلافت کی طرف سے ان پر کڑی نگرانی کی جاتی تھی اور ہر ممکن ذریعے سے خفیہ سازشیں کرکے انہیں نیست ونابود کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں خلفاء کو اس بات کا بھی علم ہوگیا تھا کہ خاص الخاص شیعہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ گیارہویں امامؑ اور ان کے بزرگوں کی روایت کردہ احادیث کے مطابق ان کا (یعنی گیارھویں امامؑ کا) ایک فرزند ہوگا جو جدوجہد موعود ہوگا۔ مہدیؑ کی آمد کی پیشین گوئی رسولؐ اللہ کی احادیث میں کی گئی تھی جو سنی اور شیعہ دونوں کے نزدیک معتبر تھیں۔[۲]

یہی وجہ تھی کہ دوسرے اماموںؑ کے مقابلے میں گیارہویں امامؑ پر خلافت کی جانب سے کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ خلیفۂ وقت نے شیعیت میں امامت کا خاتمہ کرنے اور امامت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کردینے کا قطعی فیصلہ کرلیا تھا۔

پس جونہی معتمد کو گیارہویں امامؑ کی علالت کی خبر ملی اس نے ایک طبیب اور اپنے چند معتمد اشخاص اور قاضی امامؑ کے گھر بھیجے اور انہیں ہدایت کی کہ ان کے پاس رہیں اور ان کی حالت اور ان کے گھر کی کیفیت پر مسلسل نظر رکھیں۔ امامؑ کی شہادت کے بعد انہوں نے پورے گھر کی تلاشی لی اور دائیوں کے ذریعے تمام کنیزوں کا معائنہ کرایا۔ دوسال تک خلیفہ کے کارندے خفیہ طور پر امامؑ کے جانشین کی جستجو میں لگے رہے اور بالآخر مایوس ہوگئے[۳] گیارہویں امامؑ کو سامرہ میں ان کے مکان میں ان کے والد بزرگوار کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ائمہ علیہم السلام نے اپنے حین حیات میں سینکڑوں علماء کو دین اور حدیث کی تعلیم دی تھی اور ہمیں ائمہؑ کے بارے میں اطلاعات انہیں علماء کے ذریعے پہنچی ہیں۔

۱- ارشاد، ص ۳۲۴، اصول الکافی، ج ۱، ص ۵۱۲، مناقب، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۴۲۹، ۴۳۰

۲- صحیح ترمذی، ج ۹، باب ما جاء فی المہدی، مطبوعہ قاہرہ ۵۲ - ۱۳۵۰ھ، سنن ابوداؤد، ج ۲، کتاب المہدی، سنن ابن ماجہ، ج ۲، باب خروج المہدی، ینابیع المودۃ، کتاب البیان فی اخبار صاحب الزمان، مصنفہ کنجی شافعی، مطبوعہ نجف ۱۳۸۰ھ، نورالابصار، مشکوۃ المصابیح، مصنفہ محمد ابن عبداللہ الخطیب، مطبوعہ دمشق ۱۳۸۰ھ، الصواعق المحرقہ، اسعاف الراغبین، مصنفہ محمد الصبان، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۱۸ھ، الفصول المہمہ، صحیح مسلم، کتاب الغیبت، مصنفہ محمد ابراہیم النعمانی، مطبوعہ تہران ۱۳۱۸ھ، اکمال الدین، مصنفہ شیخ صدوق، مطبوعہ تہران ۱۳۰۱ھ، اثبات الہداۃ اور بحارالانوار، ج ۵۲-۵۱

۳- اصول الکافی، ج ۱، ص ۵۰۵، ارشاد، ص ۳۱۹

طوالت سے بچنے کے لئے یہاں علماء کے اسماء، تصانیف اور حالات زندگی درج نہیں کیے گئے۔[۱]

بارہویں امام

بارہویں امامؑ یعنی مہدی موعود علیہ السلام جنہیں عموماً امام العصرؑ اور صاحب الزمانؑ کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ گیارہویں امام علیہ السلام کے فرزند ہیں۔ آپ رسول اکرمؐ کے ہمنام ہیں۔ آپ ۲۵۶ ہجری (بمطابق ۸۶۸ م ء) میں سامرہ کے مقام پر پیدا ہوئے اور اپنے والد بزرگوار کی شہادت تک جو ۲۶۰ھ (بمطابق ۸۷۴ء) میں وقوع پذیر ہوئی اور ان کے زیر تربیت رہے۔ آپ کو عوام الناس کی نظروں سے پوشیدہ رکھا گیا ور فقط کچھ سربرآوردہ شیعہ ان کی زیارت سے مشرف ہو سکے۔

آپ اپنے والد کی شہادت پر منصب امامت پر فائز ہوئے اور اللہ کے حکم کے مطابق غیبت اختیار فرمائی۔ اس کے بعد آپ خاص مواقع پر اپنے نائبین کے سامنے آتے تھے۔[۲] امام علیہ السلام نے کچھ مدت کے لئے عثمان ابن سعید عمری کو جو آپ کے والد اور دادا کے صحابی اور آپ کے معتمد رفیق تھے اپنا خاص نائب مقرر کیا۔ آپ شیعوں کے سوالات کے جوابات اپنے نائب کے ذریعے ہی دیتے تھے۔ عثمان ابن سعید کے بعد آپ نے ان کے فرزند محمد بن عثمان عمری کو اپنا نائب مقرر کیا اور ان کے وفات کے بعد ابو القاسم حسین ابن روح نوبختی نائب خاص مقرر ہوئے۔ حسین ابن روح کی وفات پر یہ منصب علی ابن محمد سمری کے سپرد کیا گیا۔[۳]

علی ابن محمد سمری کی وفات سے کچھ دن پہلے امام علیہ السلام کی جانب سے ایک فرمان جاری کیا گیا جس میں اطلاع دی گئی کہ علی ابن محمد سمری چھ دن میں فوت ہو جائیں گے، اس کے بعد نیابت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور امام علیہ السلام کی غیبت کبریٰ کا آغاز ہو جائے گا جو اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ ظاہر ہونے کی اجازت نہ دیدے۔

لہٰذا بارہویں امام کی غیبت دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ غیبت صغریٰ کا ہے جو ۲۶۰ھ (بمطابق ۸۷۴ میلادی) میں شروع ہو کر ستر سال جاری رہی اور ۳۲۹ھ (بمطابق ۹۳۹ میلادی) میں ختم ہوئی اور دوسرا حصہ غیبت کبریٰ کا ہے جو ۳۲۹ ہجری (بمطابق ۹۳۹ میلادی) میں شروع ہوئی

۱- کتاب الرجال کشی، رجال طوسی، فہرست طوسی اور علم الرجال پر دوسری کتابیں

۲- بحار الانوار، ج ۵۱، ص ۲ تا ۳۴ اور ۳۴۳ تا ۳۶۶، کتاب الغیبت، مصنفہ محمد ابن حسن طوسی، ص ۲۱۴ تا ۲۴۳، مطبوعہ تہران، اثبات الہداۃ، ج ۶، ۷ ۳- بحار الانوار، ج ۵۱، ص ۳۶۰، ۳۶۱، کتاب الغیبت، طوسی، ص ۲۴۲

اور جب تک اللہ چاہے گا جاری رہے گی۔ ایک حدیث کے مطابق جس کی صحت کے بارے میں سبھی متفق ہیں۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ:

''اگر دنیا کی زندگی کا فقط ایک دن باقی ہوگا تب بھی اللہ تعالیٰ اس دن کو اتنا طویل کردے گا کہ میری قوم اور خاندان میں سے ایک شخص کو بھیجے۔ وہ میرا ہم نام ہوگا اور وہ دنیا کو جو پہلے ظلم وستم سے پر ہوچکی ہوگی عدل وانصاف سے معمور کردے گا''۔[1]

ظہور مہدیؑ

نبوّت اور امامت کے بارے میں بحث کے دوران اس امر کی جانب اشارہ کیا گیا تھا کہ عام ہدایت کے قانون کے مطابق جس کا اطلاق ساری مخلوق پر ہوتا ہے بنی نوع انسان کو لازمی طور پر ایک ایسی قوت (وحی اور نبوت کی قوت) عطا کی گئی ہے جو اس کی رہنمائی انسانیت کے کمال اور خوش بختی کی جانب کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ کمال اور خوش بختی انسان کو میسر نہ ہو (جس کی زندگی اجتماعی ہے) تو اس کو اس قوت کا عطا ہونا لغو اور باطل قرار پائے گا اور کسی لغو چیز کے وجود کا تخلیق میں کوئی امکان نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب سے انسان اس دنیا میں آیا ہے اس کی یہ خواہش رہی ہے کہ صحیح معنوں میں خوشی سے بھرپور اجتماعی زندگی گزارے اور اس مقصد کے حصول کی امید میں سرگرم عمل رہا ہے۔ اگر اس قسم کی خواہش کا کوئی خارجی وجود نہ ہوتا تو اس کے حصول کی امید اس کی فطرت میں ہرگز نہ ابھرتی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ اگر خوراک نہ ہوتی تو بھوک نہ ہوتی، اگر پانی نہ ہوتا تو پیاس بھی نہ ہوتی اور اگر تولید نہ ہوتی تو جنسی کشش بھی نہ ہوتی۔

لہٰذا بوجہ ضرورت (لازماً) ایک دن ایسا آئے گا جب انسانی معاشرہ عدل سے معمور ہوجائے گا۔ سب لوگ امن وامان میں رہیں گے اور انہیں مکمل فضیلت اور کمال حاصل ہوگا۔ اس قسم کے معاشرے کا پیشوا جو عالم انسانیت کا نجات دہندہ ہوگا حدیث کی زبان میں مہدیؑ کہلاتا ہے۔

دنیا میں جو مختلف مذاہب رائج ہیں (مثلاً ہندومت، بدھ مت، یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور اسلام) اور ان سب میں ایک ایسے شخص کا ذکر کیا گیا ہے جو عالم انسانیت کا نجات دہندہ بن کر آئے گا۔ ان مذاہب نے بالعموم اس کے آنے کی خوشخبری دی ہے۔ اگرچہ جزئیات کے بارے میں ان کے مابین کچھ اختلافات ہیں جن کا پتا ان کی تعلیمات کے تقابلی مطالعہ سے چلتا ہے۔ رسول اکرمؐ کی

۱۔ الفصول المہمہ، ص ۲۷۱ (عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی یہ بیان کتاب الفصول المہمہ سے لیا گیا ہے۔)

حدیث جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے (یعنی مہدیؑ میری عترت میں سے ہوگا)۔ اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

اہل تسنن اور اہل تشیع کے حدیث کے مجموعہ میں رسول اکرمؐ اور ائمہ اطہارؑ سے امام مہدیؑ کے ظہور کے بارے میں متعدد روایات نقل کی گئی ہیں مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کی عترت میں سے ہوں گے اور ان کے ظہور کے نتیجے میں انسانی معاشرہ صحیح کمال حاصل کرے گا اور اپنی روحانی زندگی کا مقصد پالے گا۔[1]

علاوہ ازیں بہت سی احادیث میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ امام مہدیؑ گیارہویں امام حسن العسکریؑ کے فرزند ہوں گے۔ ان احادیث میں اس امر پر اتفاق کیا گیا ہے کہ اپنی پیدائش کے بعد امام مہدیؑ طویل غیبت میں چلے جائیں گے اور پھر دوبارہ ظاہر ہو کر اس دنیا کو جو ظلم اور نا انصافی سے پر ہوگی عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔

مثلاً آٹھویں امامؑ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ:

''میرے بعد میرا بیٹا محمدؑ امام ہوگا اور اس کے بعد اس کا بیٹا علیؑ اور اس کے بعد اس کا بیٹا حسن امام ہوگا اور حسنؑ کے بعد اس کا بیٹا حجت القائمؑ امام ہوگا جس کی غیبت کے دوران اس کا انتظار کیا جائے گا اور ظہور کے دوران اس کی اطاعت کی جائے گی۔ اگر دنیا کی زندگی میں سے فقط ایک دن باقی رہ گیا ہوگا تب بھی اللہ تعالیٰ اس دن کو اتنا طویل کردے گا کہ اس کا (یعنی امام مہدیؑ کا) ظہور ہو اور وہ دنیا کو اسی طرح عدل سے معمور کردے گا جس طرح وہ پہلے ظلم وستم سے پر ہوگی لیکن اس کا ظہور کب ہوگا؟'' جہاں تک ''ساعت'' کا تعلق ہے بلاشبہ میرے والد بزرگوار نے مجھے بتایا''۔

(جنہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے اجداد سے اور انہوں نے حضرت علیؑ سے سنا) کہ رسول اکرمؐ سے پوچھا گیا۔'' یا رسول اللہؐ!'' قائمؑ'' کا جو آپؐ کے خاندان سے ہیں ظہور کب ہوگا؟'' آپ نے فرمایا:

۱۔ حضرت ابوجعفر (پانچویں امامؑ) نے فرمایا ہے:'' جب ہمارا سہارا (قائمؑ) قیام کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا ہاتھ اپنے بندوں کے سر پر رکھ دے گا۔ پھر اس کے ذریعے ان کے دل یکجا ہو جائیں گے اور اس کے ذریعے ان کے دماغ کامل ہو جائیں گے''۔ بحارالانوار، ج ۵۲، ص ۳۲۸ اور ۳۲۶ اور حضرت ابوعبداللہؑ (چھٹے امامؑ) نے فرمایا ہے:'' علم ۷۲ حروف پر مشتمل ہے اور جو کچھ انبیاء کرامؑ لائے وہ صرف دو حرفوں پر مشتمل ہے اور لوگوں نے ان دو حروف کے علاوہ کسی چیز کا علم حاصل نہیں کیا۔ جب ہمارا سہارا (قائمؑ) آئے گا تو وہ باقیماندہ ۷۰ حروف ظاہر کردے گا اور انہیں لوگوں میں نشر کردے گا۔ وہ ان دو حروف کو بھی ان میں شامل کردے گا تاکہ پورے ۷۲ حروف کی اشاعت ہو سکے''۔ بحارالانوار، ج ۵۲، ص ۳۳۶

''ان کا معاملہ ساعت (قیامت) کی مانند ہے' جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے: '' وہی اسے اس کے معینہ وقت پر ظاہر کرے گا۔ وہ آسمانوں اور زمین میں ایک کٹھن وقت ہوگا۔ وہ تمہارے پاس بس اچانک آجائے گی''۔۱ (سورہ اعراف۔ آیت ۱۸۷)

صقر بن ابی دلف نے کہا ہے:

'' میں نے ابوجعفر محمد ابن علی الرضاؑ (نویں امام) کو یہ فرماتے ہوئے سنا: میرے بعد امام میرا بیٹا علیؑ ہوگا۔ اس کا حکم میرا حکم ہے، اس کا کلام میرا کلام ہے، اس کی اطاعت میری اطاعت ہے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا حسنؑ امام ہوگا۔ اس کا حکم اس کے باپ کا حکم ہوگا، اس کا کلام اس کے باپ کا کلام ہوگا اور اس کی اطاعت اس کے باپ کی اطاعت ہوگی''۔

یہ فرمانے کے بعد امامؑ خاموش ہوگئے۔ میں نے عرض کیا'' یا ابن رسول اللہؐ! حسنؑ کے بعد کون امام ہوگا؟''

امام علیہ السلام بیحد روئے پھر فرمایا:'' بلاشبہ حسنؑ کے بعد اس کا بیٹا امام ہوگا جو امام منتظر اور امام القائمؑ بالحق ہے''۔۲

موسیٰ بن جعفر بغدادی نے کہا ہے: میں نے امام حسن العسکریؑ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

'' میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے بعد تم لوگوں میں اس بارے میں اختلاف پیدا ہوجائے گا کہ میرے بعد امام کون ہے؟ جو شخص رسول اللہؐ کے بعد اماموں کا انکار کرے اس کی مثال اس شخص کی ہے جو تمام انبیاء کی نبوت پر ایمان رکھتا ہو لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا منکر ہو اور اگر کوئی رسول اللہؐ کی نبوت سے منکر ہو تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کہ اس نے تمام انبیاء کی نبوت سے انکار کردیا کیونکہ ہم میں سے آخری کی اطاعت کرنا پہلے کی اطاعت کرنا ہے اور آخری کا منکر ہونا پہلے کا منکر ہونا ہے لیکن یاد رکھو! میرے بیٹے کے لئے بلاشبہ غیبت ہے جس کے دوران میں لوگ اس کے بارے میں شک میں پڑ جائیں گے بجز ان لوگوں کے جنہیں اللہ محفوظ رکھے''۔۳

شیعیت کے مخالفین اعتراض کرتے ہیں کہ اس مکتب کے اعتقاد کے مطابق امامؑ غائب کی عمر اس وقت تقریباً ۱۲ سو سال ہے جبکہ اتنی لمبی عمر ایک انسان ہرگز نہیں پاتا۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اعتراض احتمال کے بارے میں ہے، امکان کے بارے میں نہیں ہے۔ بلاشبہ اتنی لمبی یا اسے

۱۔ بحارالانوار، ج ۵۱، ص ۱۵۴ ۲۔ بحارالانوار، ج ۵۱، ص ۱۵۴ ۳۔ بحارالانوار، ج ۵۱، ص ۱۶۰

زیادہ لمبی عمر کا احتمال نہیں ہے تاہم جو لوگ رسولؐ اللہ اور ائمہ اطہارؑ کی احادیث کا مطالعہ کریں تو انہیں پتا چلے گا کہ وہ امام مہدیؑ کی زندگی کو بطور معجزہ پیش کرتے ہیں۔ معجزے یقیناً ناممکنات میں سے نہیں ہیں اور نہ ہی علمی دلائل سے ان کی نفی کی جاسکتی ہے۔ یہ ہرگز ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ جو اسباب اور عوامل دنیا میں مصروف کار ہیں وہ فقط وہی ہیں جنہیں ہم دیکھتے یا جانتے ہیں اور دوسرے اسباب جنہیں ہم نہیں جانتے یا جن کے آثار اور اعمال کا ہمیں علم نہیں ہے ان کا کوئی وجود نہیں لہٰذا یہ ممکن ہے کہ ایک بار بنی نوع انسان میں ایسے اسباب اور عوامل وجود میں آجائیں جن کی بنا پر انہیں ایک ہزار یا کئی ہزار سال کی طویل عمر حاصل ہو جائے۔ دنیائے طب بھی ابھی تک ایسے ذرائع دریافت کرنے سے مایوس نہیں ہوئی جو انسان کے لئے طویل عمر کی ضمانت دے سکیں بہر حال یہ اعتراض یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں جیسے اہل کتاب کی جانب سے جو اپنی اپنی مقدس کتابوں کے مقدس مندرجات کی روشنی میں انبیاء علیہ السلام کے معجزات پر ایمان رکھتے ہیں بیحد عجیب ہے۔[1]

شیعیت کے مخالفین یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ اگرچہ اہل تشیع دینی احکام اور حقائق کی تشریح اور لوگوں کی رہنمائی کے لئے امام کا وجود ضروری سمجھتے ہیں لیکن امام کی غیبت اس مقصد کی نفی کرتی ہے کیونکہ جو امام غائب ہو اور لوگ اس سے رابطہ قائم نہ کرسکتے ہوں اس کا وجود لوگوں کے لئے مفید اور موثر نہیں ہوسکتا وہ کہتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کی اصلاح کے لئے کوئی امام بھیجنا چاہے تو وہ اسے ضرورت کے وقت پیدا کرنے پر قادر ہے اور اسے مناسب وقت سے ہزاروں سال پہلے پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں نے امامت کے حقیقی معنی سمجھے ہی نہیں کیونکہ امامت کے بارے میں بحث سے واضح ہوگیا ہے کہ امام کا فریضہ فقط لوگوں کو دینی علم سکھانا اور ان کی ظاہری رہنمائی کرنا ہی نہیں ہے بلکہ وہ ولایت اور لوگوں کی باطنی رہنمائی کا بھی ذمہ دار ہے۔ وہی لوگوں کی روحانی زندگی کی تنظیم کرتا ہے اور ان کے اعمال کے باطنی پہلو کی سمت اللہ تعالیٰ کی جانب متعین کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے میں امام کی جسمانی موجودگی یا غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اگرچہ لوگوں کی جسمانی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے لیکن باطنی طور پر ان پر نگاہ رکھتا ہے اور ان کی روحوں سے اس کا رابطہ قائم ہوتا ہے اور اگرچہ اصلاح عالم کے لئے اس کے ظہور کا وقت ابھی نہ آیا ہو لیکن اس کی موجودگی ہر وقت ضروری ہے۔

۱۔ غیبت امام مہدیؑ پر جامعہ تعلیمات اسلامی کی کتاب "انتظار امام" مؤلفہ آیت اللہ سید محمد باقر صدر ملاحظہ فرمائیں۔

شیعیت کا روحانی پیغام

عالم انسانیت کے لئے شیعیت کے پیغام کا خلاصہ ایک جملے میں پیش کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگ'' اللہ کو پہچانیں'' دوسرے الفاظ میں یہ مذہب لوگوں کو ہدایت کرتا ہے کہ معرفت الٰہی حاصل کریں تا کہ لوگ نجات پائیں۔ یہ وہی جملہ ہے جس کے ساتھ رسول اکرمؐ نے اپنی عالمگیر دعوت کی ابتداء کی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا:

'' اے لوگو! اللہ کو اس کی توحید میں پہچانو ور اقرار کرو تا کہ فلاح پاؤ''۔ [۱]

اس پیغام کی مختصر توضیح ہم ان الفاظ میں کرتے ہیں:

اس دنیا وی زندگی میں انسان فطری طور پر بہت سے مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے اور بہت سی مادی لذتوں کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ لذیذ خوراک، خوشنما لباس، شاندار محلات، دلفریب ماحول، حسین وجمیل بیوی، مخلص دوست اور کثیر دولت چاہتا ہے۔ علاوہ ازیں اسے سیاسی قوت، اعلیٰ عہدوں، عزت وشہرت اور حکومت کی خواہش ہوتی ہے اور جو چیزیں اس کی خواہشات کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ بنے اسے تباہ کردینا چاہتا ہے۔ تاہم اپنی خداداد فطرت کی بدولت وہ اس بات کو سمجھتا ہے کہ گویا تمام چیزیں انسان کے لئے بنائی گئی ہیں لیکن انسان ان چیزوں کے لئے نہیں بنایا گیا۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
(اقبال)

لہٰذا ضروری ہے کہ یہ چیزیں انسان کی تابع ہوں نہ یہ کہ انسان ان کے تابع ہو۔ پیٹ اور اس کے نچلے حصے کو زندگی کا حقیقی مقصد سمجھنا گائے اور بھیڑ کی منطق ہے اور چیر پھاڑ کرنا اور دوسروں کو بے دست وپا کردینا شیر، بھیڑیے اور لومڑی کی خاصیت ہے۔ انسان کی فطری منطق فقط عقل ودانش کا حصول ہے اور بس۔

عقل پر مبنی منطق اپنی حقیقت شناسی کی قوت کے ساتھ ہماری رہنمائی نفس پرستی، خود بینی اور خود غرضی کی جانب نہیں بلکہ حق وصداقت کی پیروی کی جانب کرتی ہے۔ یہ منطق انسان کو کائنات کا ایک

۱۔ فلاح کے معنی موجودہ دور میں سمجھے جانے والے فقط غالباً ظاہری نجات کے نہیں ہیں بلکہ اس کا مطلب عالی تر معنوں میں رہائی اور روحانیت کا حصول بھی ہے۔

جزو سمجھتی ہے جسے کوئی آزادی اور خودسری حاصل نہیں۔ موجود نظریے کے برخلاف جس کے مطابق انسان تمام مخلوق کا فرمانروا ہے اور سرکش فطرت کو رام کرتا ہے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ درحقیقت انسان خود فطرت کے ہاتھ میں ایک آلہ ہے اور اس کے تابع ہے۔ عقل پر مبنی منطق انسان کو دعوت دیتی ہے کہ انسان اس دنیا کی ہستی کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے اس پر زیادہ توجہ متمرکز کرے حتیٰ کہ اس پر واضح ہوجائے کہ جہان ہستی اور جو کچھ اس میں ہے اس نے خود اس سے جنم نہیں لیا بلکہ اس کا سرچشمہ ایک لامتناہی منبع ہے۔ اس وقت اسے معلوم ہوگا کہ یہ تمام حسن وقبح اور آسمانوں اور زمین کے تمام موجودات جو بظاہر مستقل حقیقتیں نظر آتے ہیں در اصل اپنی حقیقت ایک اور حقیقت سے حاصل کرتے ہیں۔ جس طرح کل کی حقیقتیں، قدرت اور عظمت آج قصے کہانیوں سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتیں، اسی طرح آج کی حقیقتیں آنے والے کل کی حقیقت کے مقابلے میں ایسے خواب کی مانند ہوں گی جس کی دھندلی سی یاد باقی ہو اور بالآخر ہر چیز بجائے خود ایک افسانے اور خواب سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ فقط اللہ ہی وہ مطلق حقیقت ہے جو زوال ناپذیر ہے ہر چیز اس ہستی کی پناہ میں ہستی حاصل کرتی ہے اور اسی کی ذات کی روشنی سے روشن اور ظاہر ہوتی ہے۔ اگر انسان کو اس کی بصیرت حاصل ہوجائے تو اس کا علیحدہ ہستی کا خیمہ اس کی نگاہوں کے سامنے ہی گر جائے گا جیسے پانی کی سطح پر بلبلا پھوٹ جاتا ہے پھر وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے گا کہ دنیا اور اس کے موجودات ایک ایسی لامحدود ہستی پر تکیہ کرتے ہیں جو زندگی، قدرت، علم اور ہر قسم کے لامتناہی کمال کی مالک ہے۔ انسان اور دنیا کا ہر دوسرا موجود بہت سے دریچوں کی مانند ہیں جو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اپنے آپ سے آگے پھیلے ہوئے جہان ابدیت کی جھلک دکھاتے ہیں۔

یہی وہ وقت ہے جب انسان خود اپنے آپ سے اور تمام دوسرے موجودات سے آزادی اور افضیلت کی صفات واپس لے کر ان کے مالک کے سپرد کردیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدائے واحد سے وابستہ کرنے کے لئے باقی سب چیزوں سے رشتہ توڑ لیتا ہے۔ وہ فقط اس کی عظمت اور کبریائی کے سامنے سر تعظیم خم کرتا ہے۔ اس موقع پر اس کی رہنمائی اپنے پروردگار کی جانب ہوتی ہے اور جس چیز کو وہ پہچانتا ہے اللہ کے واسطے سے پہچانتا ہے۔ خداوندی ہدایت کی بدولت وہ پاکیزہ اور نیک اعمال سے آراستہ ہوجاتا ہے اور یہی چیز اسلام یعنی اللہ تعالیٰ کے آگے سرتسلیم خم کرنا ہے جو کہ دین فطرت ہے۔

یہ انسانی کمال کا آخری درجہ اور انسان کامل یعنی امام کا مقام ہے جس پر وہ اللہ کے کرم سے پہنچتا

ہے۔ علاوہ ازیں جو لوگ روحانی طریقوں پر عمل کر کے اس مقام پر پہنچیں ان کے مختلف درجے ہوتے ہیں اور وہ امام کے حقیقی پیرو ہوتے ہیں۔

لہٰذا یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ اللہ کی معرفت اور امام کی معرفت ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔ جیسا کہ اللہ کی معرفت اور خود اپنی معرفت جدا نہیں ہوتیں کیونکہ جو شخص اپنی مجازی ہستی کو پہچان لے وہ خداوند بزرگ و برتر کی ہستی کو بھی پہچان لیتا ہے۔

من عرف نفسه فقد عرف ربه

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
(میر تقی میر)

(ماخوذ از: پاسداران اسلام، علامہ محمد حسین طباطبائی، مطبع: شاہین بکڈپو کراچی)

تاریخ اسلام

زندگانی پیغمبرؐ اسلام

ایک مذہبی اور سیاسی سفر

آیت اللہ جعفر سبحانی

ہجرت کا چھٹا سال اپنی تلخ اور شیریں یادوں کے ساتھ گزرتا جارہا تھا۔ اچانک پیغمبر اکرمؐ نے ایک عمدہ اور پسندیدہ خواب دیکھا کہ مسلمان ''مسجد الحرام'' میں خانۂ خدا کے مراسم انجام دینے میں سرگرم ہیں۔ پیغمبرؐ نے اپنے دوستوں سے اس خواب کا تذکرہ کیا اور اسے فال نیک قرار دیتے ہوئے کہا کہ انشاء اللہ امتِ اسلامیہ بہت جلد اپنی دیرینہ خواہش پوری کرے گی۔[1]

ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ عمرہ کے لئے آمادہ ہوجائیں اور پڑوسی قبیلوں کو بھی، جو ابھی مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے، مدعو کیا کہ وہ لوگ بھی مسلمانوں کے ہمسفر بن جائیں۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر عربستان کے ہر گوشہ میں پھیل گئی کہ مسلمان ''ذی القعدہ'' کے مہینے میں مکہ کی طرف روانہ ہورہے ہیں اور وہاں یہ لوگ ''عمرہ'' کے مراسم انجام دینے والے ہیں۔

یہ روحانی سفر، معنوی اور روحانی صفات کے علاوہ مختلف النوع سیاسی اور سماجی مصالح کا حامل اور جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کی حیثیت کو دوبالا کرتے ہوئے عرب قوم کے درمیان توحید و یکتا پرستی پر منحصر دین کی تبلیغ و اشاعت کا باعث بھی تھا۔

اولاً عربستان کے مشرک قبیلوں کا یہ خیال تھا کہ پیغمبرؐ ان لوگوں کے تمام قومی اور مذہبی عقائد و مراسم، حتیٰ فریضۂ حج و عمرہ جو ان کے بزرگوں کی یادگار ہے، کے مخالف ہیں۔ اسی وجہ سے وہ لوگ محمدؐ اور ان کے مذہب سے خوفزدہ اور مضطرب رہا کرتے تھے۔ اس موقع پر ''مراسم عمرہ میں'' محمدؐ اور ان کے اصحاب کی شرکت نے مشرکین کے خوف و وحشت و اضطراب میں کمی پیدا کردی اور ان لوگوں پر یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ پیغمبرؐ زیارت خانۂ خدا اور ان لوگوں کے مذہبی آداب و رسوم پر مشتمل فرائض کے نہ صرف مخالف ہیں بلکہ اس کو ایک لازم فریضہ تسلیم کرتے ہیں اور عربوں کے

۱۔ ''مجمع البیان''، جلد ۹ ص ۱۲۶

جد بزرگ حضرت اسماعیلؑ کی طرح ان دیرینہ مراسم کو زندہ اور باقی رکھنے کی بھرپور کوشش بھی کر رہے ہیں۔ چنانچہ اپنی اس راہ و روش کے ذریعہ لوگوں کے خوف کو کم اور ان کے دلوں کو جیت سکتے ہیں جو آنحضرتؐ کو اپنے قومی اور مذہبی مراسم اور طور طریقوں کا سو فیصد مخالف خیال کرتے تھے۔

ثانیاً اگر اپنی اس راہ و روش میں مسلمان کامیاب ہوجاتے ہیں اور ''مسجد الحرام'' میں اطمینان و آزادی کے ساتھ ہزاروں مشرک عربوں کی نگاہوں کے سامنے اسلامی اعتبار سے عمرہ کے فرائض انجام دے لیتے ہیں تو ان کا یہ عمل مذہب اسلام کی غیر معمولی تبلیغ و اشاعت کا باعث ہوگا کیونکہ اس زمانے میں عربستان کے تمام علاقوں سے مشرکین کی ایک بڑی تعداد اس مرکز پر جمع ہوگی اور عمرہ کے بعد وطن جاتے وقت وہ لوگ مسلمانوں کی خبر اپنے ساتھ لے جائیں گے اور اس طرح ان علاقوں میں بھی اسلام کی آواز پہنچ جائے گی جہاں اس زمانے میں پیغمبر اکرمؐ کوئی مبلغ نہیں بھیج سکتے تھے۔ اس کے علاوہ مشرکین پر خود ان کی برادری والوں کا اثر زیادہ ہوگا۔

ثالثاً پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ میں محترم مہینوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، ''ہم لوگ فقط خانۂ خدا کی زیارت کے لئے جارہے ہیں''۔ پھر تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ تلوار کے علاوہ وہ لوگ اس سفر میں کوئی اسلحہ اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔ پیغمبرؐ کے اس حکم نے اکثر اجنبی لوگوں کو اسلام کی طرف متوجہ کردیا کیونکہ اسلام کے سلسلے میں کفار قریش جو تبلیغ کررہے تھے، وہ پیغمبرؐ کے اس حکم کی روشنی میں باطل اور جھوٹی ثابت ہوگئی اور ان لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح پیغمبر اسلامؐ نے بھی ان مہینوں میں جنگ کو حرام قرار دیتے ہوئے عرب کی قدیم روایات کو اپنی حقیقی روش پر باقی رہنے کی پرزور حمایت بھی کی ہے۔

اسلام کے قائد عظیم الشان اپنی جگہ پر یہ سوچ رہے تھے کہ اگر اس مقصد میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوجاتی ہے تو ان لوگوں کی دیرینہ خواہش پوری ہوجائے گی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وطن سے دور پڑے ہوئے لوگوں کو اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے تجدید ملاقات کا موقع بھی مل جائے گا اور اگر قریش سرزمین حرم میں ان لوگوں کی آمد پر روک لگاتے ہیں تو عرب دنیا میں ان لوگوں کی کوئی حیثیت نہ رہ جائے گی۔

کیونکہ غیر جانبدار قبیلوں کے نمائندے عام طور پر یہ دیکھیں گے کہ قریش نے خانۂ کعبہ کی زیارت اور مراسم عمرہ انجام دینے کی غرض سے آنے والی اس جماعت کے ساتھ کیسی بداخلاقی کا مظاہر کیا جن

کے پاس ایک تلوار کے علاوہ، جو بالعموم ہر عرب مسافر کے ساتھ ہوا کرتی ہے، کوئی دوسرا اسلحہ موجود نہیں تھا۔ جبکہ ''مسجد الحرام''، ہر عرب کی ملکیت ہے اور قبیلہ قریش کو فقط اس کی تولیت سپرد کی گئی ہے۔

ایسی صورت میں مسلمانوں کی حقانیت پوری طرح واضح ہو جائے گی اور لوگوں کو قبیلہ قریش کی سینہ زوری اور زیادتی کا بھی پتہ چل جائے گا اور قریش ایک بار پھر مذہب اسلام کے خلاف عرب قبیلوں کے فوجی معاہدہ کی تشکیل میں ناکام ہو جائیں گے کیونکہ ان لوگوں نے ہزاروں زائرین کی نگاہوں کے سامنے مسلمانوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیا۔

پیغمبر اکرمؐ نے اس سلسلے میں بھرپور تجزیہ اور باقاعدہ غور و فکر کے بعد چودہ سو، سولہ سو یا اٹھارہ سو افراد کے ساتھ مکہ کی طرف کوچ کا حکم جاری کر دیا۔ مسلمانوں نے ''ذوالحلیفہ'' نامی مقام پر احرام باندھا۔ پیغمبر اکرم نے قربانی کے لیے ۷۰ اونٹ منتخب کیے اور ان کی پشت پر مخصوص علامت کے ذریعہ یہ نشاندہی بھی کر دی کہ یہ قربانی کے اونٹ ہیں۔ درحقیقت اس عمل کے ذریعہ انہوں نے پوری طرح یہ واضح کر دیا کہ ان کے اس سفر کا مقصد کیا تھا۔

پیغمبر اکرمؐ کی اطلاعاتی جماعت ان سے قبل مکہ کی طرف روانہ ہو گئی تا کہ اگر نصف راہ گزرنے کے بعد دشمن کی ''فوج'' سے ان لوگوں کا ٹکراؤ ہو جائے تو اس کی اطلاع فوراً پیغمبرؐ کو فراہم کر دی جائے۔

پیغمبرؐ کی اطلاعاتی جماعت سے وابستہ ایک، مردِ خزاعی نے 'عسفان'' کے قریب پیغمبرؐ کو یہ اطلاع دی کہ:

''قریش کو آپ لوگوں کے کوچ کی اطلاع مل چکی ہے۔ ان لوگوں نے اپنی فوجی طاقت کو ایک جگہ جمع کرتے ہوئے یہ قسم کھائی ہے کہ وہ آپ لوگوں کو سرزمین مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے''۔

شہر مکہ کے قریب میں واقع ''ذی طوی'' نامی جگہ پر قریش کے موثر لیڈران اور نامور افراد جمع ہو گئے ہیں اور مسلمانوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے اپنے بہادر سردار، ''خالد بن ولید'' کو دو سو مسلح سواروں کے ہمراہ ''کراع الغمیم'' نامی جنگل میں تعینات کر دیا ہے جو ''عسفان'' سے آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ان مسلح سواروں نے اس جگہ محاذ آرائی کر لی ہے[۴] اور ان لوگوں نے اس بات کا پکا ارادہ کر لیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو سرزمین مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے چاہے انہیں اپنی جان

۱۔ ''سیرہ ابن ھشام'' جلد ۲ ص ۳۰۹ ۲۔ ''روضۂ کافی'' ص۔ ۳۲۲ ۳۔ ''مجمع البیان'' جلد ۲ ص ۴۸۸

۴۔ ''بحار'' جلد ۲۰ ص ۳۳۰

ہی کیوں نہ گنوانی پڑے۔

پیغمبرؐ نے اس خبر کو سننے کے بعد ارشاد فرمایا" قریش کے حال پر ترس آتا ہے۔ جنگ نے ان لوگوں کو نابود کردیا۔ کاش ان لوگوں نے ہمارے معاملے کو تمام بت پرست جماعتوں کے حوالے کردیا ہوتا تاکہ اگر وہ لوگ ہم پر غالب و کامیاب ہوجاتے تو انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوجاتی اور اگر میں ان لوگوں پر کامیاب ہوجاتا تو یا وہ لوگ اسلام قبول کرلیتے یا اپنی محفوظ فوجی ٹکڑیوں کی مدد سے میرے خلاف جنگ کرتے۔ خدا کی قسم! میں دین یکتا پرحق کی تبلیغ و اشاعت میں ہمہ تن سرگرم رہوں گا تاوقتیکہ خداوند عالم اس دین کو کامیاب و سربلند کردے یا مجھے اس کی تبلیغ میں شہادت نصیب ہوجائے۔" اس کے بعد انہوں نے لوگوں سے رہنمائی طلب کرتے ہوئے ایسا راستہ معلوم کیا جس پر چلتے ہوئے وہ مکہ پہنچ جائیں لیکن راستہ میں ان کا ٹکراؤ خالد بن ولید سے نہ ہو۔ قبیلۂ "اسلم" کے ایک آدمی نے پیغمبرؐ کے قافلے کی رہنمائی کی ذمہ داری قبول کرلی اور نہایت مشکل سے پار کی جانے والی گھاٹیوں اور درّوں سے گذرتے ہوئے ان لوگوں کو" حدیبیہ" نامی جگہ پر پہنچا دیا۔ اس جگہ پر آنے کے بعد پیغمبرؐ کی سواری خود بخود ٹھہر گئی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ جانور خود سے نہیں رکا بلکہ حکم خداوندی کی پیروی میں اس جگہ ٹھہر گیا ہے تاکہ ہم لوگ اپنی آئندہ حکمت عملی آمادہ کرسکیں۔ اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا کہ سب لوگ اپنی سواری سے نیچے آجائیں اور اسی جگہ پر اپنا خیمہ لگالیں۔

قریش کے مسلح سواروں کو پیغمبرؐ کے راستہ کا علم ہوگیا اور وہ لوگ فوراً ہی مسلمانوں کے قریب پہنچ گئے اگر پیغمبرؐ اپنے راستہ پر آگے بڑھنا چاہتے تو انہیں قریش کے مسلح سواروں کے درمیان سے انہیں موت سے ہمکنار کرتے ہوئے آگے بڑھنا پڑتا جبکہ تمام لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ پیغمبر اکرمؐ زیارت خانۂ خدا اور مراسم عمرہ ادا کرنے آئے ہیں اور ان کے اس سفر کا کوئی دوسرا مقصد ہرگز نہیں ہے اور قتل و غارتگری پیغمبرؐ کی حیثیت اور صلح پسندی کو نقصان پہنچاتی ہے۔ دوسری طرف ان مسلح سواروں کے قتل کے بعد بھی پیغمبرؐ کے راستہ میں آنے والی رکاوٹ، دور نہ ہوتی بلکہ قریش کی امدادی فوجی ٹکڑیاں یکے بعد دیگر محاذ پر آتی رہتیں اور جنگ و خونریزی ختم نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے پاس سفر والے اسلحوں کے علاوہ کوئی دوسرا اسلحہ یا جنگی سازوسامان نہ تھا اور ایسی صورت میں مصلحت کا تقاضہ جنگ و خونریزی ہرگز نہیں تھا بلکہ گفتگو اور مذاکرہ کے ذریعہ ہی اس پریشانی سے نجات حاصل کی جاسکتی تھی۔

ان تمام پہلوؤں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے پیغمبرؐ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد

فرمایا ''اگر آج قریش مجھ سے کوئی ایسی چیز طلب کریں جو ان کے اور ہمارے درمیان تعلقات کے استحکام کا باعث ہو تو میں ان کی مطلوبہ چیز انہیں فوراً دے دوں گا اور آپس میں صلح و سلامتی کی راہ اختیار کرلوں گا۔[۱]

پیغمبرؐ کی یہ بات لوگوں کے کانوں تک پہنچی اور فطری طور پر دشمنوں کو بھی اس کی اطلاع حاصل ہوگئی۔ چنانچہ قریش نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ پتہ لگایا جائے کہ پیغمبر اکرمؐ کے اس سفر کا مقصد کیا ہے؟ ان لوگوں نے مقصد سفر سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے قریش کے نامور لوگوں کی ایک جماعت کو پیغمبرؐ کی خدمت میں بھیجا تاکہ مسلمانوں کے اس سفر کے حقیقی مقصد کے بارے میں اطلاع حاصل کرسکیں۔

نمائندگان قریش پیغمبرؐ کی خدمت میں

قریش نے اپنے متعدد نمائندے پیغمبرؐ کی خدمت میں ارسال فرمائے تاکہ وہ پیغمبر اکرمؐ کے اس سفر کا بنیادی مقصد معلوم کرسکیں۔

پہلے ''بدیل'' خزاعی قبیلہ ''خزاعہ'' کی چند نامور شخصیتوں کے ہمراہ قریش کے نمائندوں کی حیثیت سے پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اس سلسلے میں حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی۔ پیغمبرؐ نے ان لوگوں سے کہا ''میں جنگ کے لیے نہیں بلکہ خانۂ خدا کی زیارت کے لئے آیا ہوں''۔ یہ نمائندے واپس چلے گئے اور سرداران قریش کے سامنے حقیقت بیان کردی۔ لیکن جلدی باور نہ کرنے والے سردارانِ قریش نے ان لوگوں کی بات قبول نہ کی اور کہنے لگے ''خدا کی قسم! ہم لوگ انہیں سرزمین مکہ میں داخل ہونے نہ دیں گے چاہے وہ خانۂ خدا کی زیارت کے لیے ہی کیوں نہ آئے ہوں''۔

دوسری مرتبہ ''مکرز'' نامی شخص نے نمائندہ قریش کی حیثیت سے پیغمبر اسلامؐ سے ملاقات کی۔ گفتگو کے بعد سردارانِ قریش سے ''بدیل'' کے بیان کی تصدیق کردی لیکن قریش نے ان دونوں لوگوں کی بات پر قطعی بھروسہ نہ کیا۔ تیسری بار ''حلیس بن علقمہ'' کو جو عرب تیراندازوں کا سردار تھا، اس معاملے کی مکمل تحقیق کے لئے پیغمبرؐ کی خدمت میں ارسال کیا[۲] جیسے ہی رسول خداؐ نے دور سے حلیس کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے کہ اس شخص کا تعلق ایک پاکیزہ اور خداشناس

۱۔ ''لاتدعونی قریش الیوم الی خطة یسألوننی فیها صلة الرحم الااعطیتهم ایاها''۔ تاریخ طبری'' جلد ۲ ص ۲۷۲۔۲۷۰

۲۔ ''تاریخ طبری'' جلد ۲ ص۔ ۲۷۶ کے مطابق عروۃ ثقفی کے بعد وہ پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

گھرانے سے ہے۔ قربانی کے اونٹوں کو اس شخص کی طرف آزاد چھوڑ دو تا کہ اس شخص کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہ ہو کہ ہم لوگ جنگ کے لئے نہیں بلکہ خانۂ خدا کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔ جیسے ہی ''حُلیس'' نے ان لاغر بدن اونٹوں کو دیکھا جو بھوک کی شدت کی وجہ سے ایک دوسرے کے بال نوچ کر کھا رہے تھے تو انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ قربانی والے اونٹ ہیں اور پیغمبرؐ زیارت خانۂ خدا کی غرض سے آئے ہیں۔ اس نے پیغمبرؐ سے کوئی رابطہ نہ کیا اور وہیں سے واپس چلا گیا اور سردارانِ قریش کے ساتھ نہایت شدت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اس نے سردارانِ قریش سے کہا ''میں نے تم لوگوں کے ساتھ ہرگز یہ معاہدہ نہیں کیا کہ ہم خانۂ خدا، کے زائروں کو زیارت سے محروم کردیں گے۔ اس سفر کے دوران زیارت کے علاوہ محمدؐ کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہے۔ قسم اس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر تم لوگوں نے محمدؐ کے داخلہ پر پابندی لگائی تو میں اپنے پورے قبیلے کے ساتھ، جو عرب کے مشہور تیرانداز ہیں، تم لوگوں پر حملہ کرکے تمہیں نیست و نابود کرڈالوں گا''۔

''حلیَس'' کی یہ بات قریش کو بہت ناگوار معلوم ہوئی اور اس کی مخالفت کی وجہ سے وہ لوگ خوفزدہ اور فکر کی گہرائیوں میں غرق ہوگئے۔ کچھ دیر بعد ان لوگوں نے ''حُلیَس'' کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم خاموش ہوجاؤ۔ ہم لوگ خود ہی ایسے راستے کا انتخاب کریں گے جس سے تم بھی راضی رہو۔

آخری مرحلہ میں قریش نے، عروۃ بن سعود ثقفی، کو پیغمبرؐ کی خدمت میں روانہ کیا۔ یہ لوگ عروۃ کی سوجھ بوجھ اور خیر خواہی سے غیر معمولی طور پر مطمئن تھے۔ ابتدائی مرحلہ میں عروۃ ان لوگوں کی نمائندگی قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ تھے کیونکہ سابقہ نمائندوں کے سلسلے میں قریش کی بداخلاقی انہیں اچھی نہیں لگی تھی۔ بہرحال ان لوگوں نے عروۃ کو اطمینان دلایا کہ ان لوگوں کو عروۃ کے مقام و مرتبہ کا بخوبی اندازہ ہے لہٰذا وہ ان پر خیانت کا الزام نہ لگائیں گے۔

مسعود کا بیٹا پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اے محمد! تم نے مختلف جماعتوں کو اپنے اردگرد جمع کر رکھا ہے۔ کیا تم نے اپنے وطن یعنی مکہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ دیکھو قریش تمہارے ہر حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے اور تمہیں کسی قیمت پر مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے لیکن مجھے یہ ڈر لگ رہا ہے کہ کل کہیں یہ لوگ تمہیں تنہا چھوڑ کر الگ نہ ہٹ جائیں۔

جس وقت عروۃ نے یہ بات کہی ابو بکر پیغمبر کے قریب ہی کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے عروۃ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تم غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہو۔ پیغمبرؐ کے ساتھی ان سے ہرگز الگ نہیں ہوں گے۔ عروۃ نے ایک ماہر سفارت کار کی حیثیت سے محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کی حوصلہ شکنی کے لئے یہ تمام باتیں کہی تھیں۔ بہرحال اپنی بات کہنے کے بعد وہ خاموش ہوگئے۔

گفتگو کے دوران ابن مسعود بار بار اپنا ہاتھ پیغمبرؐ کی داڑھی کے قریب تک لے جاتا تھا۔ پیغمبرؐ کے قریب میں ''مغیرہ بن شعبہ'' کھڑے ہوئے تھے اور بار بار اس کا ہاتھ پکڑ کر متوجہ کر رہے تھے۔ ''ادب و احترام سے کام لو اور پیغمبرؐ کی شان میں جسارت و گستاخی نہ کرو۔ عروۃ بن مسعود نے پیغمبرؐ سے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ (یہ سوال اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبرؐ کے ارد گرد کھڑے لوگوں نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا) پیغمبرؐ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا ''یہ تیرا بھتیجہ اور شعبہ کا بیٹا مغیرہ ہے۔ عروۃ نے ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ''اے مکار! کل ہی میں نے تیری عزت بچائی ہے۔ تو نے چند روز قبل اسلام قبول کرنے کے لئے قبیلہ ثقیف کے ۱۳ لوگوں کو قتل کر ڈالا تھا اور میں نے قبیلہ ثقیف کے درمیان جنگ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ان لوگوں کا خوں بہا ادا کیا تھا۔

پیغمبرؐ نے عروۃ کی بات کاٹی اور اپنے سفر کا مقصد، جیسا کہ سابقہ نمائندوں سے بیان کر چکے تھے، اس کے سامنے بھی واضح کر دیا لیکن عروۃ کی دھمکیوں کا دندان شکن جواب دینے کے لئے وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور وضو کیا۔ ''عروہ'' نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اصحاب و یاران پیغمبرؐ نے ان کے وضو کے پانی کی ایک بوند بھی زمین پر نہیں گرنے دی۔

عروہ اس جگہ سے اٹھا اور محفل قریش میں وارد ہوگیا۔ اس نے ''ذی طوی'' نامی مقام پر جمع سرداران قریش سے پیغمبر کے ساتھ اپنی ملاقات اور ان کے سفر کا مقصد بیان کر دیا۔ اپنی گفتگو کے دوران عروہ نے کہا کہ ''میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کو دیکھا ہے۔ شاہان کسری و قیصر روم اور حبشہ کے سلاطین کی شان و شوکت کا مشاہدہ کر چکا ہوں لیکن اپنی قوم کے درمیان ان لوگوں میں سے کسی کو وہ قدر و منزلت حاصل نہیں رہی جو اس وقت محمد کو اپنی قوم کے درمیان حاصل ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ان کے دوستوں نے ان کے وضو کے پانی کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں گرنے دیا بلکہ اس پانی کو تبرک کی حیثیت سے آپس میں تقسیم کر لیا۔ اگر محمد کا ایک بال بھی زمین پر گرتا

ہے تو وہ لوگ فوراً اسے بڑے احترام سے اٹھالیتے ہیں اور سردارانِ قریش کو اس خطرناک موقع پر غور وفکر سے کام لینا چاہئے۔[۱]

پیغمبر اسلامؐ نمائندہ روانہ کرتے ہیں

قریش کے نمائندوں نے اسلام کے رہبر عالی قدر سے متعدد بار رابطہ قائم کیا لیکن اس سے کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوا۔ لہٰذا پیغمبرؐ کا یہ سوچنا فطری تھا کہ نمائندگان قریش یا اپنے سرداروں کو حقائق سے آگاہ نہیں کرسکے یا نہیں کرنا چاہتے اور الزام و اتہام کے خوف کی وجہ سے وہ لوگ حقائق کو واضح طور پر بیان نہیں کرپائے۔ پس پیغمبر اکرمؐ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ اپنا ایک نمائندہ ان سرداران شرک کی خدمت میں روانہ کریں تاکہ وہ ان لوگوں کو پیغمبرؐ کے اس سفر کے مقصد سے پوری طرح آگاہ کرسکیں اور انہیں یہ باور کراسکیں کہ اس سفر کا مقصد خانۂ خدا کی زیارت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اس کام کے لئے قبیلہ ''خزاعہ'' کے ایک زبردست آدمی ''خراش بن امیہ'' کا انتخاب کیا گیا۔ پیغمبرؐ نے سواری کے لئے ایک اونٹ ان کے سپرد کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سردارانِ قریش کے پاس پہنچ گئے اور نہایت واضح انداز میں ان لوگوں کو حقائق سے مطلع کردیا۔ لیکن اقوام عالم کی رسومات و امیدوں کے برعکس، جس میں سفیر کو ہر ممکن حفاظتی ضمانت حاصل ہوا کرتی ہے، ان لوگوں نے ان کے اونٹ کو دوڑا لیا، اور ایسا لگتا تھا کہ وہ نمائندہ پیغمبرؐ کو قتل کرڈالیں گے لیکن عرب تیر اندازوں کی وساطت کی وجہ سے انہیں نجات مل گئی۔ بہرحال اس بزدلانہ حرکت کی وجہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ قریش صلح وسلامتی کے خواہاں نہیں ہیں بلکہ جنگ کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں۔

اس حادثہ کے کچھ ہی دنوں بعد قریش کے پچاس آزمودہ اور تجربہ کار نوجوانوں کو اس کام پر تعینات کیا گیا کہ جس علاقے میں پیغمبرؐ اور سپاہیان اسلام قیام پذیر ہیں وہاں گشت لگائیں اور اگر ممکن ہو تو ان لوگوں کے ساتھ مار پیٹ لوٹ کھسوٹ کریں اور کچھ مسلمانوں کو قیدی بنالیں۔ لیکن ان لوگوں کا یہ منصوبہ پوری طرح ناکام ہوگیا اور وہ لوگ خود سپاہیان اسلام کے ذریعہ اسیر کرکے پیغمبرؐ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ ان لوگوں نے مسلمانوں پر تیر اور پتھر برسائے تھے پھر بھی پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا کہ ان لوگوں کو آزاد کردیا جائے۔ اپنے اس اقدام کے ذریعہ پیغمبرؐ نے دوبارہ یہ ثابت کردیا کہ وہ صلح وسلامتی چاہتے ہیں اور جنگ ونبرد آزمائی کی طرف قطعی مائل نہیں ہیں۔[۲]

۱۔ سیرۃ ابن ہشام'' جلد ۲ ص ۳۱۴ ''تاریخ طبری'' جلد ۲ ص۔ ۲۷۴۔۲۷۰ ۲۔ ''تاریخ طبری'' جلد ۲ ص ۲۷۸

پیغمبرؐ دوسرا نمائندہ روانہ کرتے ہیں

ان تمام ناخوشگوار حوادث کے باوجود پیغمبر گرامی صلح و سلامتی کی طرف سے مایوس نہیں ہوئے۔ ان کی ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ مذاکرہ و گفتگو کے ذریعہ پریشانی ٹل جائے اور قریش نے مسلمانوں کے سلسلے میں جو باتیں ذہن نشین کر رکھی ہیں وہ غلط ثابت ہوجائیں اور مسئلہ کا مناسب حل نکل آئے۔ لہٰذا اس بار انہیں اپنی نمائندگی کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کرنا تھا جس کے ہاتھوں سے کسی قریش کا قتل نہ ہوا ہو۔ پس علی، زبیر اور دیگر جانبازان اسلام، جو عرب اور قریش کے باطل افراد کے خلاف جنگ و نبردآزمائی کے دوران ان کی ایک جماعت کو موت کے گھاٹ لگا چکے تھے، اس نمائندگی کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ آخر کار انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ ذمہ داری عمر بن خطاب کو سونپ دی جائے کیونکہ اس وقت تک انہوں نے مشرکین میں سے کسی کا ایک قطرہ خون بھی نہیں بہایا تھا۔ عمر نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے معذرت طلب کرتے ہوئے فرمایا کہ ''قریش سے میری جان کے لئے بڑا خطرہ ہے اور میرے خانوادہ کا کوئی بھی آدمی مکہ میں موجود نہیں ہے جو میری حمایت کر سکے البتہ میں آپ کو ایک ایسے آدمی کا نام بتاتا ہوں جو اس ذمہ داری کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ وہ شخص ''عثمان بن عفان اموی ہیں جو ابوسفیان کے قریبی عزیز ہیں اور آپ کے پیغام کو سرداران قریش تک بخوبی پہنچا سکتے ہیں''۔

بہرحال یہ ذمہ داری عثمان کو سونپ دی گئی اور وہ مکہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد ''ابان بن سعید بن عاص'' سے ان کی ملاقات ہوگئی لہٰذا اسی کی پناہ میں وہ مکہ میں داخل ہوگئے۔ ''ابان'' نے وعدہ کیا کہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر پیغمبرؐ کا پیغام سرداران قریش تک پہنچادیں۔ قریش نے پیغمبرؐ کے پیغام کے جواب میں کہا ''ہم لوگوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ محمد کو طاقت کے ذریعہ مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے اب اس قسم کی وجہ سے مکہ میں مسلمانوں کے داخلہ کے سلسلے میں گفتگو و مذاکرہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے عثمان کو اس بات کی اجازت بھی دے دی کہ وہ خانۂ کعبہ کا طواف بھی کرلیں لیکن انہوں نے پیغمبرؐ کے احترام میں طواف کرانے سے انکار کردیا۔ عثمان کے سلسلے میں قریش نے یہ طریقۂ کار اختیار کیا کہ ان کی واپسی میں رکاوٹیں کھڑی کردیں۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس مدت کے دوران شاید

کوئی راہ حل پیدا ہوجائے۔[۱]

بیعت رضوان: پیغمبر کے نمائندہ کی واپسی میں تاخیر کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان ہلچل سی پیدا ہوگئی۔ جیسے ہی عثمان کے قتل کی خبر پھیلی، مسلمانوں کے درمیان غیر معمولی جوش و خروش پیدا ہوگیا اور ان لوگوں نے انتقام کی ٹھان لی۔ پیغمبرؐ نے بھی مسلمانوں کے ارادہ کو مزید ٹھوس اور مستحکم بنائے رکھنے کے لئے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''معاملہ کو پوری طرح حل کئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا''۔

ایسے نازک حالات میں جبکہ خطرہ سامنے تھا اور مسلمان جنگی ساز و سامان کے ساتھ وطن سے باہر نہیں نکلے تھے، پیغمبرؐ نے مسلمانوں کے ساتھ اپنے معاہدہ کی تجدید کا فیصلہ کیا اور اس کام کو انجام دینے کے لئے وہ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ تمام مسلمانوں نے بیعت و معاہدہ وفاداری کے طور پر ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ قسم کھائی کہ آخری سانس تک وہ لوگ اسلام کا دفاع کرتے رہیں گے۔ معاہدہ ''رضوان'' کی یہی وہ روداد ہے جو قرآن مجید میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔[۲]

اس معاہدہ کے بعد مسلمانوں کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا کہ ان لوگوں کا فریضہ کیا ہے۔ یا قریش ان لوگوں کو خانۂ خدا کی زیارت کی اجازت دے دیں گے اور وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں گے یا قریش کی سخت گیری کے خلاف ان لوگوں کو جنگ کرنی ہوگی۔ اسلام کے قائد عظیم الشان ابھی اسی فکری کشمکش میں لگے ہوئے تھے کہ انہیں تھوڑی دور پر عثمان کا چہرہ دکھائی پڑا۔ یہ بذات خود اس صلح کی خوشخبری تھی جو پیغمبرؐ کی دلی خواہش تھی۔ عثمان نے پیغمبرؐ کو تمام حقائق سے آگاہ کردیا۔ انہوں نے کہا کہ قریش کی سب سے بڑی پریشانی ان کی قسم ہے اور نمائندہ قریش اس سلسلے میں آپ سے گفتگو کرے گا تاکہ اس مشکل کا کوئی حل نکل سکے۔

سہیل بن عمرو کی پیغمبرؐ سے ملاقات و گفتگو

سرداران قریش کے خصوصی احکام کے بموجب، ''سہیل بن عمرو'' کو پانچویں بار اس کام کے لئے تعینات کیا گیا کہ وہ ایک مخصوص معاہدہ کے ذریعہ، جس کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا، اس جھگڑے کا کام تمام کردے۔ جیسے ہی پیغمبرؐ نے ''سہیل'' کو دیکھا کہنے لگے کہ ''سہیل'' ہمارے اور قریش کے درمیان معاہدہ صلح کی تشکیل کے لئے یہاں آئے ہیں۔ سہیل آئے اور پیغمبرؐ کے قریب ہی

۱۔ ''تاریخ طبری'' جلد ۲ ص ۔ ۲۷۶ تا ۲۷۸ ۲۔ لقد رضی الله عن المومنین..... واثابهم فتحاً قریباً۔ سورہ فتح آیت ۱۸

بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ایک ماہر سفارت کار کی حیثیت سے انہوں نے مختلف موضوعات پر گفتگو کی اور پیغمبرؐ کے دلی جذبات اور خفیہ خیالات و نظریات کو سمجھنے کے لئے انہیں بہت کریدا اور تحریک آمیز لہجے میں اپنی بات بھی کہی۔

سہیل نے اپنی گفتگو کے دوران کہا'' اے ابو القاسم! مکہ حرم اور ہم لوگوں کی عزت و آبرو کا مقام ہے۔ پوری عرب دنیا جانتی ہے کہ تم نے ہم لوگوں سے جنگ کی ہے۔ اگر تم موجودہ حالت میں، جو تمہاری طاقت و حاکمانہ قدرت کی مظہر ہے، سرزمین مکہ کے اندر داخل ہوگئے تو عربستان کے ہر گوشہ میں ہماری کمزوری و بیچارگی کا چرچا ہونے لگے گا اور آنے والے وقت میں جملہ عرب قبائل ہمارے علاقے پر اپنا قبضہ جمانے کی کوشش میں سرگرم ہوجائیں گے۔ میں تم کو اپنی قرابت داری کی قسم دیتا ہوں اور تمہیں تمہارے وطن عزیز سرزمین مکہ کے احترام کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں .....

ابھی سہیل اپنی بات پوری نہیں کرپائے تھے کہ پیغمبرؐ نے ان کی بات کاٹتے ہوئے فرمایا'' تمہارا مقصد کیا ہے؟''

سہیل نے جواب دیا'' درحقیقت سرداران قریش کا یہ خیال ہے کہ اس سال تم لوگ یہاں سے مدینہ واپس چلے جاؤ اور عمرہ کے مراسم کو آئندہ سال کے لئے ملتوی کردو۔ آئندہ سال دیگر عرب قبیلوں اور جماعتوں کی طرح مسلمان بھی مراسم حج میں شریک ہوں لیکن شرط یہ ہوگی کہ وہ مکہ میں تین دن سے زیادہ قیام نہ کریں اور مسافرانہ اسلحے کے علاوہ وہ لوگ کوئی جنگی اسلحہ اپنے ساتھ لے کر نہ آئیں۔

سہیل اور پیغمبرؐ کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کی وجہ سے مسلمانوں اور قریش کے سرداروں کے درمیان ایک مکمل اور وسیع معاہدہ کی زمین ہموار ہوگئی۔ وہ معاہدہ کی شرائط اور خصوصیات کے سلسلے میں غیر معمولی سخت گیری سے کام لے رہے تھے اور کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہونے لگتا تھا کہ معاہدہ صلح عملی شکل وصورت اختیار نہ کرسکے گا اور گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوجائے گا لیکن فریقین صلح و سلامتی کے خواہاں تھے اسی وجہ سے گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوجاتا تھا اور دونوں اس کوشش میں سرگرم ہوجاتے تھے کہ صلح کی صورت نکل آئے۔

سہیل کی تمام سخت گیریوں کے ساتھ دونوں کی گفتگو ختم ہوگئی اور یہ طے پایا کہ جن باتوں پر موافقت ہوچکی ہے ان کے دو کتبی نسخے تیار کئے جائیں اور فریقین کے دستخط کے بعد دونوں کو ایک ایک نسخہ دے دیا جائے۔

جملہ سیرت نگاروں کا متفقہ بیان ہے کہ پیغمبرؐ نے علی کو طلب کیا اور فرمایا کہ معاہدہ صلح کو مندرجہ ذیل انداز میں تحریر فرمائیں:-

پیغمبرؐ نے امیرالمومنین سے فرمایا۔ لکھو:

"بسم الله الرحمٰن الرحيم"۔ علی نے لکھ دیا۔

سہیل نے کہا: "میں اس جملہ سے قطعاً واقف نہیں ہوں۔ میں "رحمان" اور "رحیم" سے ناآشنا ہوں۔ اس جملے کی جگہ پر یہ لکھو۔ "باسمک اللھم" یعنی "اے خداوند! تیرے نام سے۔"

پیغمبرؐ نے موافقت کرتے ہوئے فرمایا "جیسا سہیل کہتے ہیں ویسا ہی لکھ دیا جائے۔ علی نے ویسا ہی لکھ دیا اس کے بعد پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کو یہ لکھنے کا حکم دیا۔

"هذا ماصالح عليه محمد رسول الله"۔ یعنی یہ معاہدہ صلح عمل میں آیا ہے محمد رسول اللہ اور نمائندہ سرداران قریش سہیل کے درمیان۔

سہیل نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ تمہاری رسالت و نبوت کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے۔ اگر ہم لوگ تمہاری رسالت و نبوت کے معتقد ہوتے تو تمہارے خلاف جنگ و نبرد آزمائی ہرگز نہ کرتے۔ تم اس جملہ کی جگہ اپنا اور اپنے والد کا نام لکھو اور اس جملہ کو معاہدہ کے متن سے حذف کردو۔

اس موقع پر بعض مسلمان اس بات پر قطعی راضی نہ تھے کہ پیغمبرؐ اس حد تک سہیل کے مطالبات کو تسلیم کرلیں لیکن پیغمبرؐ نے متعدد اعلیٰ مفاد و مصالح کو نگاہ میں رکھتے ہوئے، جس کی وضاحت آئندہ صفحات میں پیش کی جائے گی، سہیل کی یہ بات بھی مان لی اور علی کو حکم دیا کہ وہ لفظ "رسول اللہ" کو متن سے حذف کردیں۔

حضرت علیؑ نے انتہائی ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا کہ "میں ایسی جسارت نہیں کرسکتا ہوں کہ آپ کی رسالت و نبوت کو آپ کے اسم مبارک سے الگ کردوں۔" پیغمبرؐ نے علی سے کہا کہ لاؤ میں خود اس لفظ کو متن سے حذف کردوں۔ علی نے پیغمبرؐ کو اس لفظ کی نشاندہی کی اور پیغمبر نے اپنے ہاتھوں سے "رسول اللہ" کے لقب کو متن سے پاک کردیا۔[1]

اسلام کے رہبر عالی قدر نے اس معاہدہ صلح کی ترتیب و تنظیم کے سلسلے میں جس عاجزی و

۱- "ارشاد و مفید" ص۔ ۱۶۰ / "اعلام الوریٰ" ص ۱۰۶ / "بحار" جلد ۲۰ ص۔ ۳۶۸ / طبری نے اس سلسلے میں غلطی سے یہ لکھا ہے کہ خود پیغمبر نے اس جگہ اپنا نام لکھ دیا۔ ہم اس سلسلے میں "کتب وحی" نامی کتاب میں تفصیلی تجزیہ پیش کرچکے ہیں۔

انکساری اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا، وہ پوری دنیا میں عدیم المثال ہے کیونکہ ان کی فکر مادی افکار اور نفسانی احساسات سے قطعی متاثر نہ تھی۔ ان کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ کسی لفظ کے لکھنے یا حذف کردینے سے حقائق اور واقعیت میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی ہے۔ اسی وجہ سے صلح کی بنیادوں کی حفاظت کی خاطر انہوں نے سہیل کی جملہ سخت گیری کے مقابلے میں نرمی سے کام لیتے ہوئے ان کی ہر بات تسلیم کرلی۔

تاریخ دہرائی جاتی ہے: مکتب پیغمبرؐ کے پہلے ممتاز شاگرد حضرت علی علیہ السلام کو بھی ایسی ہی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ دونوں حوادث کے درمیان غیر معمولی مطابقت دکھائی دیتی ہے۔ پہلے موقع پر جب امیرالمومنین علیہ السلام نے لفظ ''رسول اللہ'' کو صلح نامہ سے حذف کرنے سے انکار کردیا تھا تو پیغمبر اکرمؐ نے علی کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے چچا زاد بھائی کو مستقبل میں رونما ہونے والے ایسے ہی ایک حادثہ سے باخبر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''علی! ان لوگوں کی اولاد تمہیں ایسے ہی عمل کو انجام دینے کی دعوت دیں گے اور تم بڑی مظلومیت کے ساتھ اس کام کو انجام دینے کے لئے راضی ہوجاؤ گے''۔[۱]

یہ بات حضرت علی کے ذہن میں محفوظ تھی یہاں تک کہ جنگ صفین کا حادثہ رونما ہوا اور ان کے سادہ لوح ساتھی سپاہیان شام کے فریب آمیز مظاہروں سے متاثر ہوگئے۔ واضح رہے کہ جنگ صفین کے دوران معاویہ اور عمر وعاص کی سپہ سالاری میں سپاہیان شام حضرت علیؑ کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ شامی فوج کی مکاری نے علی کے ساتھیوں کو اس درجہ متاثر کردیا کہ ان لوگوں نے علی کو جنگ روکنے اور صلح کی تجویز کو قبول کرنے پر مجبور کردیا۔

صلح نامہ لکھنے کے لئے ایک جماعت کی تشکیل عمل میں آ گئی۔

امیرالمومنین نے ''عبیداللہ بن ابی رافع'' کو مقرر کیا کہ وہ صلح نامہ کی عبارت اس طرح لکھیں۔

''هذا ما تقاضى عليه اميرالمومنين علي''۔ اس موقع پر فوج شام اور معاویہ کے سرکاری نمائندہ ''عمرو عاص'' نے حضرت علی کے کاتب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''علی اور ان کے والد کا نام لکھو کیونکہ اگر ہم لوگوں نے انہیں سرکاری طور پر امیرالمومنین تسلیم کرلیا ہوتا تو ان کے خلاف جنگ ہرگز نہ کرتے۔ اس سلسلے میں بحث طولانی ہوتی گئی۔ امیرالمومنین اس بات کے لئے ہرگز آمادہ نہ تھے

۱- کامل'' جلد ۲ ص ۱۳۸ ''بحار'' جلد ۲۰ ص ۳۵۳۔

کہ ان کے سادہ لوح ساتھیوں کو کوئی بہانہ مل جائے۔ باہمی کشمکش میں کافی وقت گزر گیا یہاں تک کہ اپنے ایک فوجی افسر کے اصرار پر انہوں نے یہ بات مان لی کہ لفظ امیرالمومنین کو صلح نامہ سے حذف کردیا جائے۔اس کے بعد انہوں نے ارشاد فرمایا۔

"الله اکبر سنّة بسنّة"۔ یہ روش پیغمبرؐ کی روش کے مطابق ہے۔" اس کے بعد انہوں نے لوگوں کو حدیبیہ کی داستان اور پیغمبرؐ کے ارشادات سنائے۔[۱]

(باقی آئندہ شمارہ میں)

۱۔" کامل" جلد ۳ ص ۱۶۲

ادبیات

مشاہیر ادب کے کلام میں ذکر بے ثباتی

(از انیسویں صدی عیسوی تا بیسویں صدی عیسوی)

وسیم حیدر ہاشمی

دنیا کا کوئی بھی بشر کبھی بے ثباتی عالم سے انکار نہیں کرسکا۔ دنیا کے سرائے فانی ہونے کا ذکر جہاں کبھی مذہبی کتابوں میں ملتا ہے وہیں اس حقیقت کو انبیاء، صوفیا، پیروں، فقیروں اور اولیائے کرام سے لے کر عام انسانوں نے بھی صدق دل سے مانا اور قبول کیا ہے۔ خداوند کریم کی وحدانیت پر اکثر لوگوں میں تضاد وشبہ دیکھا گیا ہے مگر فنا چونکہ ہر کس وناکس نے دیکھی ہے اس لیے اس کے تئیں کوئی بشر کبھی شک وشبہ میں مبتلا نظر نہیں آیا۔ بس فنا کے وقت کو جاننا کسی کے بس کی بات نہیں۔ کسی کو دیر سے فنا ہونا ہے تو کوئی شے زود فنا ہوجاتی ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال کہ" اخلاقی مضامین صوفیانہ شاعری میں ہی ملتے ہیں" لیکن یہ بات درست نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری میں اخلاقیات کی علمبرداری میر انیسؔ کا حصہ ہے۔ چونکہ فلسفۂ بے ثباتی عالم بھی درس اخلاق کا اہم جز ہے اس لئے اس کا ذکر بھی یہاں ناگزیر ہے۔ صنف شاعری کے سلسلہ میں گوئٹے کا یہ قول ہے کہ" ادب میں کوئی صنف اس وقت تک عظیم نہیں بن سکتی جب تک اس کا موضوع عظیم نہ ہو۔" اس قول کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری کے عام موضوعات میں صرف واقعہ کربلا ہی وہ موضوع ہے جسے ہر نظر سے عظیم کہا جاسکتا ہے اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت بھی ہے کہ اردو میں اخلاقی شاعری کا جب تذکرہ ہوگا اس کا سب سے درخشاں باب کربلا کے عنوان سے کی گئی شاعری ہی میں بڑے حسن وخوبی سے نظر آئے گا۔ اور اس میں کسی ایک مسلک کے شاعر کی قید نہیں۔ اس موضوع کے تحت اقبالؔ، غالبؔ، میر انیسؔ، جوشؔ اور اسی پائے کے دوسرے شعراء کے کلام میں اعلیٰ پیمانے کا درس تصوف نظر آئے گا۔ چونکہ کربلا میں حضرت امام حسینؑ کا مقصد عظیم تھا اس لیے شعراء کے یہاں احساسات کے ضمن میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے وہ عظمتوں کے اونچے درجہ پر فائز ملے گا۔ اخلاقیات کے سلسلہ میں اپنے ایک مقالے" کلام انیس اور اخلاقی قدریں" میں بیگم صالحہ عابد حسین رقم طراز ہیں:

''یہ قدریں ہیں خدا شناسی و خدا پرستی، عقیدہ و ایمان، دیانت و شرافت، حق پرستی و عفو و کرم، ایثار و قربانی، شجاعت و جاں بازی، وفا و جاں نثاری، صبر اور استقلال، راضی بہ رضا رہنے کا حوصلہ رشتوں کی پاس داری اور انسانیت کا درس، خلوص و محبت اور پھر حق کی راہ میں جان قربان کر دینے کا وہ جذبہ جو شہادت کی منزل تک پہونچا سکتا ہے۔ شہادت یعنی سر دار بھی صرف حق کا نام لینا اور حق کے لیے جان تک قربان کر دینا۔ یہ وہ قدریں ہیں جن کو فنا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جو دب دب کر ابھرتی ہیں اور اپنی سچائی منوالیتی ہیں، جس کو انیسؔ نے زیادہ تر بالواسطہ یعنی اپنے کرداروں کی سیرت اور اخلاق میں اجاگر کر کے اور کہیں کہیں بلا واسطہ پیش کیا ہے''۔[۱]

اخلاقی قدروں میں عجز و انکساری کا بالواسطہ نمونہ میر انیسؔ کے یہاں ملتا ہے جس کی مثال ہندوستان تو کیا عالمی ادب میں بھی مشکل ہے۔ مثال کے طور پر وہ موقع جب میدان کربلا میں حضرت امام حسینؑ کی ملاقات اس غریب الوطن مسافر سے ہو جاتی ہے جو زیارت نجف اشرف اور قدم بوسی آستانہ حسینی کی غرض سے گھر سے نکلا تھا اور راہ بھول کر کربلا کی طرف آنکلا تھا۔ وہ حسینؑ کو پہچانتا نہ تھا۔ حسینؑ نے اس شخص سے اپنا تعارف کچھ اس طرح کرایا کہ عجز و انکساری کی اس سے بہتر مثال ناممکن ہوگی۔ نہ سلاست میں کمی نہ بلاغت میں اور روانی ایسی کہ ہر لفظ کی ترکیب سے خالص انسیت جھلکے ملاحظہ ہو:

یہ تو نہیں کہا کہ شہہ مشرقین ہوں
مولیٰ نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

ٹھیک اسی طرح جب انیسؔ کا مقصد بلا واسطہ کہنا ہو تو بھی انداز بیان میں وہی حسن و خوبی اور عجز و انکسار نظر آئے گا جو اخلاقی شاعری کی عالمی مثال ثابت ہوتا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

کبھی برا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا ہر یک ذرے کو ہم آفتاب سمجھے ہیں

خاکساری نے دکھائی رفعتوں پر رفعتیں اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ادیب یا شاعر گزرا ہو جس نے بے ثباتی کو اپنا موضوع نہ بنایا ہو۔ بیشتر شاعروں اور ادیبوں نے اپنے اپنے انداز سے اس مضمون کو قلم بند کیا ہے۔ ویسے بھی شاعری تو

۱۔ انیس شناسی، گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی بار دوم، ۲۰۰۰ء، ص ۴۶

جذبات کے اظہار کا وسیلہ ہے جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی نے موازنہ انیس و دبیر میں لکھا ہے کہ:

''شاعری کس چیز کا نام ہے؟ کسی چیز، کسی واقعہ، کسی حالت، کسی کیفیت کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ دریا کی روانی، جنگل کی ویرانی، باغ کی شادابی، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی سختی، گرمی کی تپش، جاڑوں کی ٹھنڈک، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، یا رنج وغم، غیظ وغضب، خوشی ومحبت، افسوس وحسرت، عیش وطرب، استعجاب وحیرت، ان چیزوں کا اس طرح بیان کرنا کہ وہ کیفیت دلوں پر چھا جائے، اسی کا نام شاعری ہے''۔[۱]

شبلی نعمانی نے شاعری کی جو تعریف پیش کی ہے اسے میر انیس کی شاعری کا نثری ماخذ کہا جاسکتا ہے اور بے شک وہ مکمل ہے مگر اس مقالے کے عنوان کے تحت صرف ویرانی، سختی، رنج وغم اور استعجاب وحسرت ہی زیر غور ہیں۔

دیگر ہندوستانی زبانوں کے مدمقابل یوں تو اردو کی عمر بہت کم ہے مگر اس کے باوجود بے ثباتی عالم پر جتنا کچھ اردو میں ملتا ہے وہ اس کی عمر کے لحاظ سے بہت وقیع ہے خاص کر اردو نثر کے مقابلے نظم میں۔ اردو شاعری میں اس مضمون پر تو کئی شعراء نے ایک دو شعر ایسے کہہ دیئے ہیں کہ عالمی ادب بھی اس کا جواب پیش نہیں کرسکتا۔ مثلاً استاد ذوق کا یہ شعر:

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ذوق کے اس شعر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بے ثباتی کے ہمراہ شروع سے آخر تک انسان مجبور اور محض بے چارگی کا پیکر نظر آتا ہے۔ مسئلہ جبر واختیار پر اس سے بہتر شعر ملنا مشکل ہے۔

بہادر شاہ ظفر نے جب بے ثباتی عالم کا ذکر کیا تو سب سے پہلے انسان کی لمبی زندگی کی ایک خاص حد مقرر کرتے ہوئے ہندوستانی محاورے کی ضمن میں ایک شعر یوں پیش کیا کہ اس نے ذہن کے لاشعور میں ایک مستقل مسکن بنالیا۔

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

۱۔ موازنہ انیس و دبیر۔ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ۔ بار سوم۔ ۲۰۰۳ء، ص ۷۔۲۳۶

جہاں ظفر نے انسانی زندگی کے طول وعرض کو چار روز میں سمیٹتے ہوئے یہ کہا کہ اس کا نصف خواہشات و آرزوؤں کی نذر ہوجاتا ہے وہیں باقی کا نصف ان خواہشات کے پورا ہونے کے انتظار میں ختم ہوجاتا ہے ظفر کے بعد درگا سہائے سرور جہان آبادی نے بے ثباتی عالم کا ذکر کرتے ہوئے انسان کی لمبی زندگی کو دو روزہ کہا اور بہت خوب کہا:

کرے نہ عمر دو روزہ یہ سرکشی کہہ دو
کہ خاک کا ہے یہ پتلا بشر نہیں ناری

ہر چند کہ ظفر اور سرور نے ایک ہندوستانی محاورے کی ترجمانی کرتے ہوئے زندگی کو دو روزہ اور چہار روزہ کہہ کر بڑے حسن خوبی سے اپنا نظریہ پیش کیا مگر اس نہج سے ہٹ کر بابائے سخن میر انیس نے زندگی کو دو یا چہار روزہ کہنے کے بجائے حیرت انگیز طور پر تین روزہ کہا، جبکہ انیس سے قبل یا آج تک کسی شاعر یا ادیب نے زندگی کو سہ روزہ نہیں کہا تھا۔ انیس نے ہر تین دن کا حساب ایسی خوبصورتی سے پیش کیا کہ عقل دنگ رہ گئی۔ فصاحت، بلاغت، روانی، ترکیب اور شعریت ایسی بھرپور کہ سامع داد دینا بھول کر عرصہ تک غور کرتا رہے۔

تین دن کی زندگانی دیکھ لی
بچپنا، پیری، جوانی، دیکھ لی

جتنے بھی مشاہیر شعرا ہیں ان میں اکثر وبیشتر غزل گو ہیں اور چونکہ بے ثباتی بھی غزل کا عنوان ہے اس لیے ان لوگوں کے یہاں اس عنوان کے اشعار خوب مل جاتے ہیں ۔ بے ثباتی عالم پر میر تقی میر نے اتنے اچھے اشعار کہے ہیں کہ جو از خود زباں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ مثلاً

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا — کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت — اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا
تک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے — کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

یا پھر انہیں کے چند دوسرے اشعار:

ہر صبح مرے سر پر اک حادثہ نیا ہے
پیوند ہو زمیں کا، شیوا ہے آسماں کا

اُگتے تھے دشت بلبل و دامان گل بہم
صحن چمن نمونہ یوم الحساب تھا

اتنے منعم جہاں میں گزرے ہیں
وقت رحلت کے کس لئے زر تھا

آیا جو واقعہ میں درپیش عالم مرگ
یہ جاگتا ہمارا دیکھا تو خواب نکلا

میرؔ کا یہ تصور کہ ان کا گزر کسی ویرانے یا قبرستان سے ہونا اور کسی کے کاسۂ سر کا ان کے پیر سے ٹکرا جانا، بے ثباتی عالم کا بے مثل نمونہ ہے:

کل پانوں ایک کاسۂ سر پہ جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر!
میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

میرؔ کی زندگی ایسی پر آشوب تھی کہ قدم قدم پر حادثات زمانہ سے دوچار ہوئی اور انہوں نے اپنی شاعری میں انہیں تجربات کو عبرت کا نمونہ بنا کر پیش کیا۔

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انہوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیر نگیں تھا
کہا میں نے گل سے ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لی آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

اسی طرح انہوں نے مسئلہ جبر و اختیار کو نمونۂ عبرت بنا کر پیش کیا ہے:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

کل چمن میں گل و سمن دیکھا
آج دیکھا تو باغ بن دیکھا

اس موج خیز دہر میں ہم کو قضا نے آہ
پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

بہت نا آشنا تھے لوگ یاں کے
چلے ہم چار دن رہ کر جہاں میں

سب سرگزشت سن چکے اب چپکے سو رہو
آخر ہوئی کہانی مری، تم بھی سو رہو

درج بالا اشعار کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرؔ کی غزلوں میں صرف اعلیٰ درجہ کا تغزل نہیں بلکہ دوسرے رنگ بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور بے شک، ان تمام رنگوں میں حسن تغزل کے بعد بے ثباتی کو ہی اولیت حاصل ہے۔

طنز و مزاح، غم اور خوشی کا اظہار، حب الوطنی، جام و مینا حسن تغزل اور بے ثباتی عالم، فلسفہ رنج و ملال، تفکر و تصوف منظر نگاری وغیرہ اردو شاعری کے عام رنگ ہیں۔ مشاہیر شعراء میں ایسے کم ہی ملیں گے جنہوں نے اپنی شاعری کا عنوان درج بالا میں سے صرف ایک یا دو کو بنایا ہو۔ اب حکیم مومن خاں مومنؔ کو ہی لے لیجئے۔ ان کا کلام حسن و عشق اور لذت دنیا سے عبارت ہے تاہم وہ بے ثباتی

عالم جیسے اہم موضوع سے صرف نظر نہ کر سکے۔ بے ثباتی پر انہوں نے بہت کم اشعار کہے ہیں۔ جن میں کچھ درج ذیل ہیں:

اس چمن زار کا حسرت سے نظارہ کر لے
اے نگہ دیدۂ ہر سو نگراں ہونے تک

آسماں فتنہ کچھ ایسا نہیں اے اہل جہاں
کوئی باقی نہیں رہنے کا اماں ہونے تک

کیسی حسرت سے اے سبک روحی
دیکھے ہے دیدہ حیات ہمیں

ہر ادیب اور شاعر کا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے، جسے اس کی تحریر اور کلام سے پہچانا جاتا ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اشعار کی کیفیت شاعر کے حقیقی مزاج کا آئینہ ہوتی ہے۔ لیکن ان میں چند ایسے بھی ہیں جن کی شخصیت ہشت پہلو ہوتی ہے۔ انہوں نے زندگی کے بیشتر پہلوؤں کو اپنی نوک قلم سے مختلف طریقہ سے سجایا سنوارا ہے۔ ان لوگوں میں ڈاکٹر اقبالؔ، مرزا غالبؔ اور نظیرؔ اکبر آبادی بڑی اہمیت کے حامل ہیں جنہوں نے شاعری کے مختلف عنوانات کے ساتھ بے ثباتی دنیا پر بھی قلم اٹھایا اور جو کچھ بھی کہا، بہت خوب کہا۔ ان لوگوں میں نظیرؔ اکبر آبادی کا انداز ان کے ہمعصروں اور دوسرے شعرا سے الگ اور نیا ہے۔ نظیرؔ نے اپنی بیشتر نظمیں مختلف عنوانات پر لکھی ہیں اور اپنے انوکھے انداز میں عام بیان میں، لکھنوی نزاکت اور تکلفات سے پاک اور متروک لفظوں کے استعمال کی وجہ سے پہلے تو انہیں اردو میں نمایاں مقام رکھنے والوں نے قبول ہی نہیں کیا۔ یہ لوگ نظیرؔ کی زبان کو بازاری زبان کہا کرتے تھے۔ نظیرؔ کے بارے میں اس طرح کا خیال رکھنے والوں میں حالیؔ، آرزو اور شیفتہؔ جیسے بڑے شاعر بھی شامل تھے۔ اس کے باوجود نظیرؔ کی نظمیں انہیں کے زمانے میں عام لوگوں میں کافی مقبول ہو چکی تھیں اور بعد میں اردو ادب اور نقد شاعری میں بھی ان کے کلام کی بھرپور پذیرائی ہوئی۔ پروفیسر کلیم الدین احمد جیسے نقاد نے بھی کلام نظیرؔ پر تبصرہ کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ ''نظیرؔ ادب کے آسمان کا درخشاں ستارہ ہے''۔

نظیر کی مقبول ترین نظموں میں "شب برأت، عید بسنت، ہولی بلدیو جی کا میلا اور راکھی کے ساتھ مفلسی، موت، روٹیاں اور بنجارہ نامہ" بھی خوب سراہی گئیں۔ اب ان نظموں میں سے چند اشعار پیش ہیں جن میں بے ثباتی کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے:

جب آ کر قضا نے کھلایا اجل کا گل
کام آئی تب کسی کی خوشی نہ شور و غل

وہ شخص جو تھے سات ولایت کے بادشاہ کی
حشمت میں جن عرش سے اونچی تھی بارگاہ
مرتے ہی ان کے تن ہوئے گلیوں کی خاک راہ
اب ان کے حال پر بھی یہی بات ہے گواہ
جو خاک سے بنا ہے، وہ آخر کو خاک ہے

گر ایک کو ہزار روپیہ کا ملا کفن
اور اک یونہی پڑا رہا بے کس برہنہ تن
کیڑے مکوڑے کھا گئے دونوں کے تن بدن
دیکھا جو میں نے آن تو سچ ہے یہی چلن
جو خاک سے بنا ہے، وہ آخر کو خاک ہے

جتنے درخت دیکھو ہو بوٹے سے تابہ جھاڑ
بڑ، پیپل، آم، نیب، چھوارا، کھجور، تاڑ
سب خاک ہوں گے جب کہ فنا ڈالے گی اکھاڑ
کیا بوٹے ڈیڑھ ہاتھ کے کیا جھاڑ کیا پہاڑ
جو خاک سے بنا ہے، وہ آخر کو خاک ہے

"بنجارہ نامہ" بذاتِ خود ایک لافانی نظم ہے۔ جس کا ایک ایک مصرعہ عبرت دنیا اور فنا کا ایسا مرقع

ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ صرف پہلا بند ملاحظہ ہو:

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرا مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا، بھینسا بیل، شتر، کیا گوئیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں، چاول، موٹھ، مٹر، کیا آگ دھواں کیا انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا، جب لاد چلے گا بنجارا

بے ثباتی کے عنوان پر تھوڑے بہت اشعار قریب قریب سب کے یہاں مل جاتے ہیں مگر تسلسل سے ۳۰، ۴۰ اشعار بہت کم شاعروں کے یہاں ملتے ہیں۔ قانی، انیس اور شوق کی ہی مانند سرور جہاں آبادی بھی اس میدان میں وہ نام ہے کہ اگر بے ثباتی عالم پر کوئی مضمون یا مقالہ لکھا جائے اور سرور جیسے عالی قدر شاعر کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ نہ صرف سرور کے ساتھ ناانصافی ہوگی بلکہ مقالے میں بھی ایک خلاء سا محسوس ہوگا کیونکہ ان کی ایک مکمل نظم ہی "بے ثباتی" دنیا ہے، یہ نظم انہوں نے اسی محبت کرنے والی بیوی کی نا وقت موت سے متاثر ہو کر کہی ہے جو صرف ۲۶ سال کی عمر میں انہیں داغ مفارقت دے گئی تھی۔ نظم کا ایک ایک مصرعہ سرور کی تڑپ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور مطلع ہی اس طرف متوجہ کرتا ہے۔

جگر کے داغ نے کی ہے چمن کی تیاری
کہو کہ دیدۂ تر جوئے خوں کرے جاری

۳۷ اشعار کی اس نظم کو جوں کا توں پیش کرنے کا موقع نہیں ہے اور اشعار کا انتخاب بھی مشکل ہے۔ بہر حال مندرجہ ذیل اشعار دل خیز، بردل ریز، کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

زمیں نے نور کے پتلے چھپا لیے کیا کیا — کہ سو رہے ہیں لحد میں بتان زنگاری
زمانہ صید تھا جن کے خدنگ غمزہ سے — ہوئے شکار اجل وہ غزال تاتاری
وہ مہ جمال جو بالائے بام سوتے تھے — اب ان پہ خواب اجل زیر خاک ہے طاری
بنا کے نقش فلک نے مٹا دیے لاکھوں؛ — عجیب طرح کا ہے کچھ طلسم زنگاری
عدم سے مرگ کا سودا چکانے آئے ہیں — سرا میں ٹھہرے ہوئے کچھ جو ہیں یہ بیوپاری
کہاں سے آئے ہیں ہم اور کہاں کو جاتے ہیں — رہی نہ غفلت دنیا میں اتنی خودداری

رہا نہ کچھ زن و فرزند و مال و زر کا خیال قضا کے آتے ہی نیند ایسی ہوگئی طاری
اجل کمیں میں زمانہ عدو فلک دشمن کرے مقابلہ کس کس سے جان بیچاری
زمانہ آنکھ جھپکتے ہی ہوگیا تاریک وہ شب کا خواب ہوا دن کی جو تھی بیداری
گڑھے میں گور کے جاگیردار سوتے ہیں فلک نے چھین لیا منصب جہاں داری
یہی ہے راہ فنا جس میں روز و شب غافل نفس کی آمد و شد کا ہے قافلہ جاری
بہت غریب لٹے شاہراہِ ہستی میں سنی اجل نے کسی کی نہ گریہ و زاری
دیا نہ ان کو کفن پیر زال دنیا نے قبائے زر تھی کبھی جن کے دوش پر بھاری
کہاں وہ مسند جم ہے کہاں وہ بزم نشاط کہاں ہے قصر فریدوں کی اب وہ تیاری
پتہ نہیں ہے کہ رستم کی ہڈیاں ہیں کدھر رہی نہ سام و نریماں کی اب وہ خودداری
کہاں ہے خسرو و بہمن کی بارگاہ رفیع کہاں قباد کی، ہوشنگ کی جہاں داری
اڑا کے تخت سلیماں کو لے گئے دم میں قضا کے جھونکوں میں تھی اتنی تیز رفتاری
تمام عمر رہا سامنا قضا کا سرور گئی نہ وہ جو کلیجے پہ چوٹ تھی کاری

میر تقی میر، میر انیس، شوق، مرزا دبیر اور دوسرے سر فہرست شعرا کی مانند یہاں پر سرور نے بھی اپنی بات منوانے کی خاطر حسینوں، جاگیرداروں، مسافروں، غریب الوطن، عالی منصب امراء، جمشید، دارا، رستم، سام خسرو، حضرت سلیمانؑ وغیرہ کے اوج و طنطنہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی بھی آخری منزل قبر بتائی ہے۔ یہاں صرف عام گنہگاروں کا ذکر نہیں بلکہ ان کی طرف بھی اشارہ ہے جو پیکر نور یعنی رسولؐ نبیؑ اور امامؑ تھے، انہیں بھی موت اور قبر کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے علاوہ یہاں وہ صاحب کمالات بھی فنا کی نذر ہوگئے۔ جو یوسف لقا تھے، حسین و جمیل تھے، بادشاہ تھے منصب دار اور جانے کن کن دنیاوی خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ زندگی کے حقیقی انجام سے واقفیت کے باوجود انسان حقیقت کی طرف سے چشم پوشی ہی اختیار کئے رہتا ہے۔

اس پوری نظم میں طرح طرح کی تشبیہات و تلمیحات کے ذریعے بے ثباتی کی طرف بڑی خوبصورتی سے اشارہ کیا گیا ہے لفظوں کی بندش، تراکیب کا استعمال سلاست اور روانی اس نظم کو بلند درجہ پر فائز کرتی ہیں۔ یہ نظم اپنے موضوع، پیش کش اور زبان وبیان کے اعتبار سے اردو ادب میں ناقابل فراموش ہے۔

ان مشاہیر کے بعد ذہن بے اختیار ان شعرا کی طرف از خود مبذول ہوجاتا ہے جو ایک خاص عنوان کے لحاظ سے اس میدان میں سدرۃ المنتہیٰ پر ہی نظر آئے ہیں۔ شاعری کے اس خاص میدان میں نہ تو ان سے قبل کوئی اس مقام پر تھا اور نہ ہی آج تک کوئی ان کی خاک کو بھی پہونچ سکا۔

میری قدر کر اے زمین سخن
تجھے خاک سے آسمان کردیا
سبک ہوچکی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلہ گراں کردیا

یہ قطع صرف شاعرانہ تعلّی نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اردو شاعری میں ان کے وقیع اضافے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے دریا کو کوزے میں بند کردیا۔ وہ کہتے ہیں کہ: ''مرثیہ، اردو شاعری کی سب سے شریفانہ صنف ہے''۔اور میر انیسؔ کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی جیسے صاحب نظر اور تنقید نگار کو بھی یہ کہنا پڑا کہ:

''میر انیسؔ کے کمال کا اگر چہ جس قدر مجھے اعتراف ہے شاید ہی کسی اور کو ہوگا''۔[۱]

مرثیہ سے چونکہ زیر بحث عنوان کا گہرا تعلق ہے۔ اس لیے کسی بھی مرثیہ گوشاعر کے یہاں اس موضوع کے اشعار کی تعداد زیادہ اور بہت زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ ہاشم علی سے لے کر میرؔ، سوداؔ اور میر انیسؔ تک کے کلام میں اس عنوان کے اشعار کی کثرت ہے۔ میر انیسؔ کی چند رباعیاں پیش خدمت ہیں:

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے، وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی
آغوش لحد میں جبکہ سونا ہوگا
جز خاک، نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیسؔ
ہم ہوں گے اور قبر کا کونا ہوگا

۱- موازنہ انیس ودبیر، ص ۲۶۷

جس دن کہ فرق روح و تن میں ہوگا
آنا مشکل اس انجمن میں ہوگا
نازاں نہ ہو رخت نو پہن کر غافل
اک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

غافل تجھے کیوں خواہش دنیا و دنی ہے
پیوند کفن ہر کوئی درویش و غنی ہے
جو قاقم و سنجاب پہنتے تھے ہمیشہ
سوتے ہیں تہہ خاک، گلے میں کفنی ہے

اب گرم خبر موت کے آنے کی ہے
غافل تجھے فکر آب و دانے کی ہے
ہستی کے لئے ضرور اک دن ہے فنا
آنا ترا دلیل جانے کی ہے

ہے عالم فانی کی عجب صبح عجب شام
کہ غم کبھی شادی کبھی ایذا کبھی آرام

شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا
رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

برسوں سے یہی رنگ گلستان جہاں ہے
جس گل پہ بہار آج ہے کل اس پہ خزاں ہے

بے ثباتی کے سلسلہ میں سلام اور رباعیات کے ساتھ مرثیہ کا ذکر ناگزیر ہے ورنہ مضمون ادھورا رہ جائے گا، انیس کے مرثیہ کے چند یادگار بند پیش خدمت ہیں:

آیا بناہ ہستی انساں میں جب خلل　　رونا ہے بے فضول کہ ہے سعی بے محل
جاتا ہے کوئی آج جہاں سے تو کوئی کل　　روؤ کہ خاک اڑاد نہیں چھوڑتی اجل
نے فاطمہؓ رہیں نہ امیرؓ عرب رہے
ہمشکل جن کے یہ ہیں وہ دنیا میں کب رہے

جو خلق میں تھے صاحب تخت و علم و تاج　　نوبت یہ ہوئی ہے کہ نشاں ان کے نہیں آج
شاہان جہاں فخر سے دیتے تھے جنہیں باج　　وہ قبر میں ہیں سورۂ الحمد کے محتاج
سکہ ہے نہ وہ اور نہ وہ تاج نگیں ہیں
دولت تو خزانے میں ہے خود زیر زمیں ہیں

اولاد کا گلشن نہ عزیزوں کا چمن ساتھ　　یاور نہ مصاحب، نہ محبان وطن ساتھ
نے ماں ہے نہ فرزند نہ بھائی نہ بہن ساتھ　　دنیا کے کل اسباب سے ہوتا ہے کفن ساتھ
آجاتی وہاں موت جہاں گھر نہیں ہوتا
بہتوں کو کفن تک بھی میسر نہیں ہوتا

بھائی نہ تو کام آئے گا اس وقت نہ فرزند　　عرصہ نہیں کھل جائے گا جب آنکھ ہوئی بند
وہ کام کرو جس سے خدا ہوئے رضامند　　ہشیار کہ ہونا ہے تمہیں خاک کا پیوند
پیری کی بھی مدت ہے جوانی کی بھی حد ہے
آرام گہ شاہ و گدا کنج لحد ہے

خداوند کریم کی ہر تخلیق کا انجام مقرر ہے۔ وہ انسان ہو یا حیوان، شجر و حجر و جبل ہو یا سمندر و دریا، زمین ہو یا آسمان، کسی کو بقاء نہیں۔ ہاں وقت و حالات کا علم صرف اللہ کو ہے۔ دوسروں کا بد سے بدتر انجام دیکھنے کے بعد بھی انسان اپنی موت سے بے خبر رہتا ہے اور اکثر سگ دنیا بن کر جیتا ہے۔ قرآن شریف میں بھی خدائے بزرگ و برتر نے صاف لفظوں میں اعلان فرمایا ہے کہ:

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ پھر بھی ہر کس و ناکس صرف اس لیے غفلت کی زندگی گذار رہا

ہے کہ جتنا یقین اسے اپنی موت کا ہے اس سے زیادہ بھروسہ اس بات کا ہے کہ ابھی اس کا انجام حقیقی دور اور بہت دور ہے جبکہ نبیوںؑ اور اولیائے کرام سے لے کر صوفیوں تک نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انیسؔ فرماتے ہیں:

کیا سخت گھڑی ہوگی اجل آئے گی جس دم — کھنچ کھنچ کے ہر ایک رگ سے نکلنے لگے گا دم
کیا دیکھیں گے اک ایک کو حسرت سے بصد غم — اتنی بھی زباں ہل نہ سکے گی کہ چلے ہم
سب کیلئے اک روز یہ تکلیف دھری ہے
اس پر بھی یہ غفلت ہے عجب بے خبری ہے

بھائی نہیں اپنے ہیں، نہ ہی ہے پسر اپنا — بے گانے ہیں سب ہوئے گا جس دم سفر اپنا
نے مال، نہ اسباب، نہ زیور، نہ زر اپنا — دو گز ہے کفن، قبر کا کونا ہے گھر اپنا
کچھ ساتھ بجز بے کسی و یاس نہ ہوگا
رہ جائیں گے سب دور کوئی پاس نہ ہوگا

اس زیست پہ پھولو نہ اجل کو بھی کرو یاد — گھر سیکڑوں یاں سیل فنا نے کیے برباد
دنیا میں عمارت نہ بنا کر ہو کوئی شاد — اس قالب خاکی کی عجب سخت ہے روداد
کل اوج پہ جو لوگ تھے، وہ زیر زمیں ہیں
ہے خاک کا ڈھیرا، نہ مکاں ہیں نہ مکیں ہیں

کس کس گل رنگیں کی نہ اس باغ میں تھی دھوم — اک آن میں شبنم کی طرح ہوگئے معدوم
دکھلا رہی ہے رنگ عجب ہستی موہوم — کیا قصد ہے گلچین اجل کا نہیں معلوم
اس باغ میں جس سرو کو دیکھا تو رواں ہے
جس گل پہ بہار آج ہے کل اس پہ خزاں ہے

جب کبھی بے ثباتی کے عنوان سے دبستان لکھنؤ کا ذکر ہوگا تو پنڈت برج نارائن چکبست کا نام از خود ذہن میں آجائے گا۔ جنہوں نے اس عنوان پر اپنے ایک بھرپور شعر کے ذریعے زندگی اور موت

کے ہفت خواں کو نہایت منطقی استدلال کے ساتھ چند لفظوں میں حل کر دیا ہے۔

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

یہ شعر زندگی اور موت کی ایسی تعریف ہے جسے کافی حد تک ''سائنٹفک'' بھی کہا جاسکتا ہے اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے لئے بھی قابل قبول ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس شعر کے دونوں مصرعے ہندی کے مندرجہ ذیل دوہوں سے استفادہ کا نتیجہ ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

پہلا دوہا: شتی۱، جل۲، پاوک۳، گگن۴، سمیرا۵
پانچ تتو۶، یہ ادھم ے، سریرا۸ زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب

دوسرا دوہا: یہ پنچ بھوت۹، میں نشورتن۱۰
نشور بھوتوں میں لین ۱۱ ہوا موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

ہندی کے پہلے دوہے میں عناصر کے اجزاء ترکیبی کے ظہور پذیر ہونے اور دوسرے میں ان کے انتشار کا ذکر کرکے ازل سے ابد تک کی ترجمانی چکبستؔ نے جس حسن خوبی سے کی ہے وہ لاجواب ہے۔

دبستان لکھنؤ کے شعرا میں میر انیسؔ بے مثل ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بے ثباتی عالم پر انیسؔ کے سکیڑوں تو کیا ہزاروں شعر ملتے ہیں جن میں اکثر بے مثل ولاجواب ہیں لیکن ان سب سے ہٹ کر اب میں اسی دبستان کے ایک ایسے شاعر کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جس کی شاعری کے رنگ میں نہ تو یاسیت وقنوطیت ہے اور نہ بے ثباتی دنیا۔ میرا اشارہ مرزا شوقؔ لکھنوی کی طرف ہے۔ شوقؔ نے دوسرے مشاہیر شعرا کے مقابلے بہت کم لکھا۔ شاید دامقؔ جونپوری نے ایسے ہی شعرا کے لئے یہ شعر کہا تھا:

کیا ضروری ہے کہ دیوان کا دیوان لکھیں
ایک شعر ایسا کہو، زندہ جاوید رہے

مرزا شوقؔ اپنی تمام تر شاعری کے باوجود شہرت کی ان بلندیوں تک ہرگز نہ پہونچتے اگر انہوں نے

۱-زمین ۲-پانی ۳-آگ ۴-آسمان ۵-ہوا ۶-عناصر ۷-تخلیق ۸-جسم ۹-اجزا عناصر
۱۰-مدغم یا خلاصہ می شوم ۱۱-اردو مرثیہ نگاری، ام ہانی اشرف، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۲ء

"مثنوی زہرِ عشق" نہ لکھی ہوتی۔ یا اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اگر شوق کے مجموعہ کلام سے اس مثنوی کو ہٹا دیا جائے تو ان کا شمار بھی اس دور کے عام شعرا میں سمٹ کر رہ جائے گا اب زہرِ عشق کا وہ مقام ملاحظہ فرمایئے جب ہیرؤن آخری بار ہیرو سے ملنے آتی ہے اور رات بھر اس کے ساتھ رہ کر خودکشی کے ارادے کا اظہار کرتی ہے اور ہیرو کو صبر کی تلقین کرتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب زندگی کی تمام لذتیں اپنا حسن کھو چکی ہیں۔ اسے دنیا کے تمام مسائل کا حل موت کی آغوش میں نظر آتا ہے۔ یہ داستان صدیوں سے دہرائی جارہی ہے جو آج بھی محبت کرنے والے اسے دہراتے رہتے ہیں۔ مرزا شوق نے شاعرانہ فنکاری کے ساتھ بے ثباتی دنیا کا ذکر بڑے موثر انداز میں کیا:

جائے عبرت سرائے فانی ہے — مورد مرگ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانہ بوم
بات کل کی ہے نوجواں تھے جو — صاحب نوبت و نشاں تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی — نام کو بھی نہیں نشاں باقی
غیرت حور منہیں نہ رہے — ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم — ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم
کوئی لیتا نہیں اب اس کا نام — کون سی گور میں گیا بہرام
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے — اک فقط نام نام باقی ہے
کل جو رکھتے تھے اپنے سر پہ تاج — آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج
تھے جو خودسر جہان میں مشہور — خاک میں مل گیا سب ان کا غرور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے
تھے جو مشہور قیصر و مغفور — باقی ان کے نہیں نشان قبور
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر — ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
رشکِ یوسف تھے جو جہاں میں حسین — کھاگئے ان کو آسمان و زمیں

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے — یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتہ — نہ کسی جا ہے تل دمن کا پتہ
بوئے الفت تمام پھیلی ہے — باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
صبح کو طائران خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیھا فان
موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے
زندگی بے ثبات ہے اس میں — موت عین حیات ہے اس میں

اردو شاعری میں جب بھی اخلاقی قدروں کا ذکر ہوتا ہے تو متعدد شعراء کے نام سامنے آجاتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ کس شاعر نے اس موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اخلاقی قدروں کو برتنے کے سلسلے میں ہر ناقد اور مبصر کے سوچنے کا طریقہ جدا ہے۔ عبدالقادر سروری نے جدید اردو شاعری میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''فارسی کے اتباع میں اردو نے بھی بہت سے اخلاقی شاعر پیدا کیے لیکن میر درد کے سوا کسی کو اختصاصی درجہ نصیب نہ ہوسکا... میر درد کی پوری شاعری اعلیٰ تصوف کے نکات سے بھری ہوئی ہے''۔[۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ درد کے کلام میں جابہ جا اخلاقی شاعری کے بہترین نمونے ملتے ہیں مگر یہ کہنا کہ اخلاقی شاعری کے سلسلے میں درد کے سوا کسی کو اختصامی درجہ نصیب نہ ہوسکا'' میری دانست میں درست نہیں''۔

ہر چند کہ خواجہ میر درد کا شمار ان خاص شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے بہت کم لکھا۔ بمشکل تمام ڈھائی ہزار اشعار اردو میں اور تقریبا اتنے ہی فارسی میں۔ اپنے کلام کے آئینہ میں وہ ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے جو کچھ بھی لکھا معیاری لکھا۔ ان کی چھوٹی سے چھوٹی یا بڑی سے بڑی غزل کا ایک بھی شعر کمتر درجہ کا نہیں ملے گا۔ یہ بہت بڑی بات ہے کیونکہ عام طور پر بڑے شعراء کے یہاں بھی ہلکے اور غیر معیاری اشعار مل ہی جایا کرتے ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا یا تو درد نے غیر معیاری اشعار کہے ہی نہیں یا انہیں اپنے دیوان میں شامل نہ ہونے دیا۔ درد کے برعکس ایسے بہت سے شعرا ہیں جنہوں نے کمتر درجہ کے اشعار کہے اور اعتراض کے باوجود اسے اپنے دیوان سے خارج نہ کیا۔ مثال کے طور پر فانی بدایونی کو ہی لے لیجئے جنہوں نے نشان دہی و اعتراض کے باوجود ایسے اشعار اپنے دیوان سے نہ

۱- اردو مرثیہ نگاری، ام ہانی اشرف، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۵، ۱۹۹۲ء

نکالے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل بیان بہت اہمیت رکھتا ہے۔

''اس دیوان میں بہت سے ایسے اشعار بھی ملیں گے جو فانی جیسے سخنور کے شایان شان نہیں ہیں۔ راقم الحروف نے اس کی باضابطہ اطلاع فانی کو دے دی تھی لیکن موصوف نے اسے ''غیر متعلق'' قرار دے کر اپنا فیصلہ برقرار رکھا۔[۱]

مندرجہ بالا بیان کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اشعار کی تعداد کو فوقیت دینے کے بجائے میر درد نے معیار کو فوقیت دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا دیوان معیاری اشعار کا دیوان بنا پھر بھی کسی کا یہ کہنا کہ ''اخلاقی شاعری میں میر درد کے سوا کسی کو اختصاصی درجہ نصیب نہ ہو سکا'' قطعی جانب دارانہ خیال ہے۔

ہر چند کہ مولانا الطاف حسین حالی کو مرثیہ کے بعض اجزا پر اعتراض ہے اور انہوں نے مرثیہ پر بھی سخت تنقید کی ہے پھر بھی میر انیس کی اخلاقی شاعری پر نقد کرتے ہوئے انہوں نے ایک ایماندار اور صاف گو ناقد ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے پوری ادبی دیانت داری کے ساتھ لکھا ہے کہ:

''اسی خاص طرز کے مرثیہ کو اگر اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہمارے نزدیک اردو شاعری میں اخلاقی نظم کہلانے کا مستحق صرف انہیں لوگوں کا کام ٹھہر سکتا ہے۔ بلکہ جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیہ میں بیان کیے ہیں ان کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی مشکل سے ملے گی...[۲]

خواجہ الطاف حسین حالی کے علاوہ جن دیگر محققین نے میر انیس پر تحقیق کی ہے بے شک ان میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کا نام بھی سرفہرست ہے اور ان کی رائے میر انیس کی معاملے میں بہر حال مستند سمجھی جاتی ہے۔ میر انیس کی اخلاقی شاعری کے بارے میں وہ ''روح انیس'' میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''اخلاقی شاعری کے اعتبار سے انیس کے مرثیوں کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان کے تمام کلام میں بلند اخلاق کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے۔ جن اخلاق فاضلہ کی تعلیم انیس کے مرثیوں سے ہوتی ہے وہ اخلاق و نصائح کی کسی کتاب سے یا وعظ و پند کے ذریعے ممکن نہیں۔ نفس انسانی کی انتہائی شرافت کے نقشے جن موثر پیرایوں میں کھینچے ہیں ان کا جواب ممکن نہیں''۔[۳]

۱۔ مقدمہ دیوان فانی اردو شاعری پر ایک نظر، رشید احمد صدیقی، ص ۵۵، ۵۴، باقیات فانی بدایونی، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲۰۰۳ء

۲۔ مقدمہ شعر و شاعری خواجہ الطاف حسین حالی ۳۔ کلام انیس پر مختصر تبصرہ، سید مسعود حسن رضوی ادیب اردو مرثیہ نگاری ام ہانی اشرف، ص ۱۸۰، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ ۱۹۹۲ء

مختصر یہ کہ جو لوگ مراثی انیسؔ کو صرف اس نظریہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ محض حضرت امام حسینؑ سے مذہبی عقیدت رکھنے والوں کے لئے ہیں انہیں اس قسم کی عینک اتار کر انیسؔ کے کلام پر دوبارہ غور کرنا پڑے گا تب کہیں جا کر ایسے لوگ ایک خاص نتیجہ پر ضرور پہونچیں گے اور انیس کو صرف مرثیہ گو نہ کہہ کر حقیقتاً اردو شاعری کا روشن منارہ کہیں گے۔

درج بالا اقتباسات اور مثالوں پر غور کیا جائے تو عبدالقادر سروری کا میر دردؔ کے سلسلہ میں یہ دعوی کہ ''میر دردؔ کے سوا کسی کو اختصاصی درجہ نصیب نہ ہوسکا'' پوری طرح باطل ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر سروری صاحب نے درد کے لئے یہ جملہ ان کے ہمعصروں کے سلسلہ میں کہا ہوتو اسے درست مانا جا سکتا ہے مگر ایسا نہیں بلکہ یہ جملہ پوری اردو شاعری کے لئے کہا گیا ہے۔

اس سے قبل ہم فانی کی شاعری پر بات کر رہے تھے جو درد کے کلام سے سروری کے خیالات تک پہونچ گئی۔ میں پھر واپس اپنی خاص گفتگو کی طرف پلٹتا ہوں...!

میر تقی میر سے کچھ ہٹ کر فانی بدایونی کی غزل گوئی ہے۔ وہ زندگی کی ہر سانس کو عالم نزع میں جیتے ہیں، جس نے ان کی شاعری کو عبرت سے زیادہ قنوطیت کا مرقع بنادیا ہے۔ ان کی بیشتر شاعری موت کفن، میت، قبر اور فنا سے عبارت ہے۔ جس طرح میرؔ نے ''آپ بیتی کو جگ بیتی'' بنا کر پیش کیا، کم وبیش اسی طرح فانیؔ کی شاعری بھی زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گزرتی نظر آتی ہے جس شاعر نے زندگی کو جتنے قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہوگا، اس کے کلام میں زندگی کی اتنی ہی بھرپور جھلک نظر آئے گی۔ پھر بھلا ایسے شاعر سے بے ثباتی کا عنوان کیسے چھوٹ سکتا تھا جس نے اپنا تخلص ہی فانیؔ اختیار کیا ہو۔ ''کلیات فانی'' کا دیباچہ لکھتے ہوئے قاضی عبد الغفار نے ان کی شاعری پر اپنے جذبات کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے:

''زندگی شعر ہے مگر زندگی کا ہر جذبہ شعر نہیں۔ صرف غم شعر ہے۔ تازہ پھولوں کا حسن شعر کا ادنیٰ مقام ہے مگر مرجھائے ہوئے پھول کی گزری ہوئی رعنائی اور مٹا ہوا رنگ حقیقی شعریت کا ارفع ترین مقام ہے'' [1]

درج بالا بیان کو نظر میں رکھ کر فانیؔ کے اس زبان زد قطع پر غور کیجئے تو ایک الگ لطف محسوس ہوگا:

۱- دیباچہ کلیات فانی، قاضی عبد الغفار، ص ۵

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا
ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

یا درج ذیل شعر:

بنیاد جہاں کیا ہے؟ مجبور فنا ہونا
سرمایہ ہستی ہے محروم بقا ہونا

اسی عنوان کے تحت فانیؔ نے چھوٹی بحر میں ایک مکمل نظم ''دار فانی'' کے نام سے کہی ہے۔ نظم کے چند اشعار بطور مثال پیش خدمت ہیں:

روتے آئے دنیا والے ۔۔۔ دولت مال خزانے والے
دارا، جمؔ، اسکندر کیا تھے ۔۔۔ آنے والے جانے والے
کھو بیٹھے اب نام ونشاں تک ۔۔۔ شوکت شان دکھانے والے
ہوگئے اب روباہ سے کمتر ۔۔۔ شیر سے آنکھ ملانے والے
کوئی نہ ٹھہرا وقت جب آیا ۔۔۔ چل دیے آخر جانے والے
جو نہ گئے سو آکے رہیں گے ۔۔۔ سب ہیں مسافر خانے والے
دولت، ثروت، عزت، حشمت ۔۔۔ چھوڑ گئے سب جانے والے
تج بیٹھے جو عمر کی دولت ۔۔۔ اب نہیں ہرگز پانے والے
دار فنا ہے دنیا فانیؔ ۔۔۔ آنے والے ہیں جانے والے

اس کے علاوہ بھی فانیؔ نے اس عنوان کے تحت بہت سے اشعار کہے ہیں جن میں سے چند پیش خدمت ہیں:

ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانیؔ ۔۔۔ ہم نہ ہوں گے، وہ دن بھی دور نہیں

چمن میں آئے شب گزری صبح چل نکلے ۔۔۔ ملی تھی کیا ازل میں زندگانی ہم کو شبنم کی

قطرہ قطرہ رہتا ہے، دریا سے جدا رہ سکنے تک جو تاب جدائی لا نہ سکے وہ قطرہ فنا ہو جاتا ہے

درج بالا مضمون کو آخر تک پڑھ لینے کی بعد ایک بات تو ایک دم صاف ہو گئی کہ اس عنوان کے تحت اردو میں بہت کچھ لکھا گیا۔ خاص کر میر انیس نے اس عنوان پر خوب شعر کہے کیونکہ ان کا تو میدان ہی مرثیہ ہے مگر ایک ایسا شاعر جس نے اپنی تمام زندگی میں بہت کم لکھا ہو، شوق کے محض ۲۳ مسلسل اشعار ہی کافی ہیں، جس کا ہر شعر بے ثباتی عالم کے لحاظ سے دعوت فکر دیتا ہے اور اس عنوان پر موازنے کے لئے کسی بھی عالمی ادب پر تنہا بھاری ہے۔

معرفی کتاب

(تازہ ترین کتابوں کا تعارف)

کتاب کا نام : تاریخ فیروز شاہی

تصنیف : ضیاء الدین برنی

تصحیح : سرسید احمد خاں ۔ کلکتہ ۱۸۶۲ء

صفحات : ۶۶۱

قیمت : ۷۲۰ روپے

ناشر : سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ ۲۰۰۵ء

تبصرہ نگار : پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی

قدیم ہندوستان میں تاریخ نگاری کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ کشمیر کے ایک دانشور کلھن نے کشمیر کی ایک تاریخ لکھی جس کو ۱۱۴۸-۴۹ء میں اس نے مکمل کیا تھا۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں تاریخ نگاری کی روایت کا احیاء ہوا اور اس کے بعد کی صدیوں میں مسلمانوں نے فن تاریخ نگاری میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ جس کا ذکر سرسید نے بھی تاریخ فیروز شاہی کے دیباچہ میں کیا ہے۔ مسلمان تاریخ نگاری کی صحت مند روایت اپنے ساتھ لائے۔ جن میں نظامی کی تاج المآثر، فخر مدبر کی آداب الحرب والشجاعہ، منہاج السراج کی طبقات ناصری اور برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

یوں تو بارہویں صدی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک ہندوستان میں فارسی زبان میں بہت سی تاریخیں لکھی گئیں لیکن ان میں دو تاریخوں کو خاص مقام حاصل ہے۔ ایک تو برنی کی تاریخ فیروز شاہی اور دوسرے ابو الفضل علامی کا اکبر نامہ اور آئین اکبری، فارسی تاریخ نگاری اس حد تک

اثر انداز ہوئی کہ سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں ایشور داس ناگر نے فتوحات عالمگیری، بھیم سین نے نسخہ دلکشا اور سجان رائے بھنڈاری نے خلاصہ التواریخ وغیرہ لکھیں۔

برنی نے اپنی تاریخ سلطان غیاث الدین بلبن (87-1266) کے عہد سے شروع کی جس کا اختتام سلطان فیروز شاہ تغلق (88-1351) کے عہد پر کیا۔ اور اس نے یہ کتاب اسی کے نام معنون کی ہے۔ اس طرح برنی کی تاریخ تیرھویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی عیسوی کے واقعات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ لیکن اپنے دیباچہ میں سرسید لکھتے ہیں کہ ''مولانا ضیاء الدین برنی نے یہ کتاب لکھی۔ اس کتاب میں سلطان ناصر الدین محمود کے بعد سے جو بادشاہ ہوئے ہیں اور جو واقعات سال ششم جلوس فیروز شاہ تک گذرے ہیں وہ مندرج ہیں۔ حقیقت میں یہ کتاب تتمہ ہے طبقات ناصری کا اور ان دو کتابوں کو ملا کر ایک کتاب سمجھنا چاہئے''۔ سرسید کی اس بات سے اس لئے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ طبقات ناصری اور تاریخ فیروز شاہی میں بین فرق ہے۔ جو معلومات اور جس طرح کا تجزیہ ہمیں برنی کی تاریخ میں ملتا ہے وہ منہاج کے یہاں نہیں ہے لہٰذا نہ تو تاریخ فیروز شاہی طبقات ناصری کا تتمہ ہے اور نہ ہی دونوں کو ایک تصور کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

سرسید اپنی نظروں سے ۱۸۱۸ء کے بعد سے مغل حکومت کا زوال اور برٹش راج کا عروج دیکھ رہے تھے اسی کے نتیجے میں انہیں اپنی ثقافت کا زوال بھی نظر آرہا تھا۔ اور خاص طور سے اپنی تاریخ اس لئے کہ انگریزوں نے تاریخ کو نشانہ بنایا۔ لہٰذا سرسید نے یہ پروجیکٹ بنایا کہ تاریخ ہندوستان کے جو فارسی ماخذ ہیں ان کے نسخے جمع کرکے ان کی تصحیح کرکے شائع کردیا جائے اس لئے کہ اب صرف سیاسی زوال ہی نہ تھا بلکہ فارسی تاریخ نگاری کا بھی زوال شروع ہوگیا تھا۔ سرسید نے تاریخ فیروز شاہی کے نسخے کس طرح جمع کئے وہ لکھتے ہیں۔ ''تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی بہت کم یاب کتاب ہے۔ بہت تلاش اور تجسس سے مجھ کو ایک نسخہ بہم پہونچا تھا۔ اس کے مقابلے اور صحت میں مجھ کو بہت دقت اٹھانی پڑی ایک ناقص نسخہ کتب خانہ شاہ دہلی سے مجھے میسر ہوا تھا اور ایک نسخہ جو مسٹر ایلیٹ صاحب بہادر نے بہم پہونچا دیا تھا وہ میں نے لے لیا اور ایک نسخہ ایڈورڈ تھامس صاحب بہادر کے پاس تھا وہ بھی میں نے لے لیا اور ایک نسخہ بنارس سے ہاتھ آیا ان چاروں نسخوں سے میں نے اپنی کتاب کا مقابلہ کیا اور جہاں تک ممکن تھا اس کے صحیح کرنے پر کوشش کی'' لیکن برنی نے تاریخ فیروز شاہی کے دو مسودے تیار کئے۔ پہلا مسودہ فیروز شاہ تغلق کے پانچویں جلوس میں تیار کیا اور دوسرا

مسودہ اس کے دو سال بعد تیار کیا۔ اس دوسرے مسودہ کی سرسید نے تصحیح کی جو کلکتہ سے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔ ان دونوں مسودوں میں فرق ہے۔ سرسید کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں تاریخ فیروز شاہی کے دونوں مسودے نہیں مل سکے۔ اس لئے کہ سرسید نے اس کا کوئی ذکر اپنے دیباچہ میں نہیں کیا ہے۔ مغل عہد کے ایک اور ماخذ آئین اکبری کی بھی سرسید نے تدوین کی تھی اور انہوں نے غالبؔ سے کہا کہ اس پر مقدمہ لکھدیں اس کے جواب میں غالب نے لکھا کہ وہ اب ماضی کی طرف نہ دیکھیں اور اب مستقبل کی طرف اپنی توجہ کریں اور وہ اس کے لئے انگلینڈ کے صاحبوں کو دیکھیں۔ غالبؔ نے نتیجتاً مقدمہ نہیں لکھا لیکن غالبؔ کی اس رائے سے قطعی اتفاق نہیں کیا جاسکتا چاہے وہ اندسٹریل انقلاب ہو یا اکیسویں صدی کے نئے چیلنجز ہوں وہ علیحدہ ہیں لیکن ہم کو ماضی کو بھی نہیں بھولنا چاہئیے۔ صرف اکیلے غالب ہی کی یہ رائے نہیں برنی تاریخ فیروز شاہی کے دیباچہ میں مسلمانوں کی تاریخ سے بے توجہی کی شکایت چودھویں صدی عیسوی میں کررہے ہیں انگلینڈ اور یوروپ کی ان تمام کامیابیوں کے باوجود انہوں نے ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا فارسی تاریخی ماخذوں کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا اور ۱۹۶۶ء میں فارسی تاریخ نگاری پر پہلا سمینار لندن یونیورسٹی میں ہوا۔ پیٹر ہارڈی نے مورخین عہد وسطی پر کتاب لکھی ویسے تو ہم بہت دعوے کرتے ہیں لیکن برنی کے پہلے مسودہ کو منظر عام پر سب سے پہلے یوروپین مورخ سائمن ڈگبی ۱۹۷۱ء میں لے کر آئے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ اپنے مضمون War- Horse and Elephant in the Sultanat of Delhi (1971) میں واضح طور پر لکھا۔ بقول غالبؔ ہم کو تو تاریخ میں انیسویں صدی میں ہی کمال حاصل ہوگیا تھا لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہندوستان کی فارسی تاریخ نگاری کے میدان میں بھی اہم کارنامے عہد وسطی کے جدید مورخین اور فارسی دانشوروں جو ہندوستان میں کام کررہے تھے ان کے بجائے انگلینڈ اور یوروپ میں عہد وسطی پر کام کررہے عیسائی مورخین نے انیسویں صدی میں انجام دئے۔ آج جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی، جواہرلال یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تاریخ کے میدان میں جو ریسرچ ہورہی ہے اگر انگریز بابر نامہ، اکبرنامہ، آئین اکبری، منتخب التواریخ، طبقات اکبری، تزک جہانگیری وغیرہ کا انگریزی زبان میں ترجمہ نہ کرجاتے تو یہ ریسرچ صرف بیس فیصد رہ جاتی۔ آزاد ہندوستان میں ہم نے کتنے فارسی ماخذ کی تدوین وتراجم کئے ہیں۔ آج ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش عہد وسطی کی تاریخ کے شعبوں سے جڑے ہوئے مورخین میں فارسی جاننے

والوں کی تعداد ایک فیصد سے زیادہ نہ ہوگی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں تو اس سے بھی کم ہے۔ پروفیسر سید اصغر عباس صاحب نے بھی تاریخ فیروز شاہی کے پہلے نسخے کا کوئی ذکر ''اپنی شروع کی بات'' میں بھی نہیں کیا۔ اچھا ہوتا اگر دونوں متن کی تدوین کرنے کے نعد اشاعت ہوتی اور اس طرح سے اس روایت کا احیاء بھی ہوتا جس کی بنیاد سرسید نے انیسویں صدی میں ڈالی تھی اس لئے کہ انیسویں صدی اور اکیسویں صدی کے کام میں فرق ہونا چاہئے۔ سرسید کی مجبوری قابل قبول کہ ان کو وہ مسودہ دستیاب نہ ہوسکا لیکن اب تو ہمیں معلوم ہے کہ اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ دو نسخے ہندوستان سے باہر آکسفورڈ اور خود سائمن ڈگبی کے اپنے ذاتی گلشن میں ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ تاریخ فیروز شاہی کے دونوں مسودوں کو سامنیر کھ کر ایک متن تیار کیا جاتا۔

سرسید کے دور میں تو خطرہ یہ تھا کہ کہیں یہ فارسی ماخذ برباد نہ ہوجائیں اس لئے کہ سب کے سب مخطوطات کی شکل میں تھے، شائع ہونے سے ان کو زندگی مل جائے گی۔ انیسویں صدی میں خطرہ اور تھا اور اکیسویں صدی عیسوی میں خطرہ یہ ہے کہ اب فارسی زبان جاننے والے مورخین عہد وسطیٰ کی روز بہ روز کمی ہوتی جارہی ہے۔ اور جو ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ ایک فارسی زبان و ادب کے دانشور نے اکیسویں صدی عیسوی میں اورنگزیب کا 'وصیت نامہ' جسکا مخطوطہ ۱۹۳۱ء کا ہے، بغیر دوسرے نسخوں سے مقابلہ کئے اسکا متن شائع کر دیا۔ جب کہ اسکے قدیم نسخہ خود رضا لائبریری، رام پور اور آزاد لائبریری، علی گڑھ میں موجود ہیں۔ جو فارسی داں مورخ انتقال کرجاتا ہے اسکی جگہ خالی؟ لہٰذا آئندہ تاریخ فیروز شاہی کا متن جب بھی شائع ہو تو اس میں دونوں مسودوں کو شامل کیا جائے۔ پروفیسر سید اصغر عباس، ڈائریکٹر سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، لائق مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اس کا متن دوبارہ شائع کرادیا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ تاریخ فیروز شاہی کے فارسی متن کا مطالعہ کرسکیں اس لئے کہ ہندوستان میں اس کے قلمی نسخے بہت کم ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ برنی کی تاریخ فیروز شاہی کی اشاعت سے زیادہ سے زیادہ ریسرچ اسکالرس اور اساتذہ مستفید ہوسکیں گے۔

نام کتاب : Political Representation of Muslims in India:1952-2004

تالیف : پروفیسر اقبال احمد انصاری

قیمت : لائبریری ایڈیشن ۹۰۰ روپیہ

پیپر بیک ایڈیشن ۳۵۰ روپیہ

صفحات : (XIX)+418

ملنے کا پتہ : Manak Publications,
B-7, Saraswati Complex,
Subhash Chowk, New Delhi, 110092
Email: manak_publications@hotmail.com,Ph.22453894, 22453894

تبصرہ نگار : پروفیسر مسعود الحسن

پروفیسر اقبال احمد انصاری ملک و بیرون ملک بہ حیثیت اسکالر اور حقوقِ انسانی کی تحریک کے فعال کارکن اور Human Rights Today نامی سہ ماہی کے مدیر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ اقلیتوں کے معاملات و وسائل پر لکھی گئی ان کی کتابوں کی تین جلدیں ماہرین کی نظر میں اس موضوع پر ایک اہم اضافہ ہیں۔ چوتھی جلد شائع ہونے والی ہے۔ ان کتابوں کی رسم اجرا کے موقع پر ممتاز ماہر قانون سولی سورابجی نے کہا تھا کہ ان کتابوں کا درجہ ہندوستانی کلاسیکل قانونی ادب کا ہے۔ موصوف فسادات پر اپنی نوعیت کی واحد کتاب "Communal Riots, The State and Law in India" کی ۱۹۹۷ء میں تدوین کے علاوہ اقلیتی کمیشن کے لئے ایک رپورٹ "Communal Riots: Prevention and Control 1999 A.D." میں پیش کر چکے ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں ان کی مرتب کردہ ہندوستانی مسلمانوں کی صورتِ حال نامی کتاب "Muslim Situation in India" شائع ہوئی تھی۔ زیرِ تبصرہ کتاب پارلیمنٹ و اسمبلیوں میں مسلم نمائندگی پر ۱۹۵۲ء سے ۲۰۰۴ء تک کے انتخابی اعداد و شمار پر پہلی جامع تصنیف ہے۔ جو ملکی و عالمی تاریخی و نظری بحثوں کے علاوہ اعداد و شمار کے ڈھائی سو سے زائد ٹیبلوں اور

چارٹوں پر مشتمل ہے۔

پروفیسر اقبال انصاری کی محققانہ کتاب نہ صرف قانون ساز اسمبلی کے مختلف ادوار کا مفصل جائزہ پیش کرتی ہے بلکہ عالمی تناظر میں اقلیتوں کی سیاسی نمائندگی پر بھی جامعیت سے نظر ڈالتے ہوئے ہندوستان کے انتخابی اعداد و شمار کی روشنی میں ان اسباب و عوامل کا تعین کرتی ہے جو مسلمانوں سے کئے گئے وعدوں کی تکمیل میں حارج ہوئے۔

آزادی کی تحریک کے دوران کانگریس نے اقلیتوں کے حقوق کے قانونی تحفظ کے جو وعدے کئے تھے اور قرارداد یں منظور کی تھیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے، تقسیم ملک کے باوجود ۲۷- ۲۸/اگست ۱۹۴۷ء کو اقلیتی حقوق سے متعلق قانون ساز اسمبلی نے تعلیمی، لسانی و تہذیبی حقوق کے تحفظ کے علاوہ پارلیمنٹ و اسمبلیوں میں اقلیتوں کے لئے ان کی آبادی کے تناسب سے سیٹوں کے ریزرویشن کی ضمانت دی۔ جو آئین کے مسودہ Draft Constitution کی دفعہ ۲۹۲، ۲۹۴ کی شکل میں ضبط تحریر میں آ گیا۔ دسمبر ۱۹۴۸ میں اس مسئلہ کو دوبارہ موضوع گفتگو بنا کر ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ مئی ۱۹۴۹ میں سیٹوں کے رزرویشن کی ضمانت اقلیتوں کے لئے ختم کر دی گئی۔ یہ ضمانت صرف شیڈ ولڈ کاسٹ و ٹرائب کے لئے باقی رہی۔ لیکن قانون ساز اسمبلی میں مسئلہ کے ہر پہلو پر جو بحث ہوئی اس میں کسی ممتاز ہندو قائد نے یہ نہیں کہا کہ سکولر جمہوریت میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے مرکزی و ریاستی قانون ساز اداروں میں ان کی مناسب نمائندگی کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اسکے برعکس اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ آئینی ضمانت کی عدم موجودگی کے باوجود ان کے ساتھ نہ صرف منصفانہ بلکہ فراخدلانہ سلوک کیا جائے گا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے جو اختتامی تقریر کی اسکے الفاظ یہ ہیں کہ'' اب (سیاسی آئینی تحفظ کے خاتمہ کے بعد) ہمارے لئے یہ ایمان کا مسئلہ ہے۔ خصوصاً اکثریتی طبقہ کے لئے اس عہد کی آزمائش ہوگی کیونکہ انہیں اپنے رویہ سے یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ وہ دوسروں کے ساتھ عادلانہ و فراخدلی کا سلوک کر سکتے ہیں۔'' (آئین ساز اسمبلی مباحثے، ج ۸، ص ۳۳۲)

۱۹۵۲ء سے ۲۰۰۴ء تک لوک سبھا اور بارہ ریاستی اسمبلیوں کے لئے سیاسی جماعتوں کی جانب سے مسلمانوں کی نامزدگی اور انتخابی کامیابی کے جائزہ سے صورت حال یہ نظر آتی ہے کہ اس پورے عرصہ میں مسلمانوں کی آبادی کے متناسب و متوقع نمائندگی سے محرومی کا تناسب لوک سبھا میں تقریباً اڑتالیس فیصد اور ۱۲ ریاستی اسمبلیوں میں پچاس فیصد رہا ہے۔ جس میں مختلف ادوار اور علاقوں

میں تناسب میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے۔ مثلاً لوک سبھا کے پہلے تین انتخابات میں محرومی کا تناسب ۵۵ فیصد اور ۱۹۸۹ء سے ۲۰۰۴ء تک یہ تناسب ۵۲ فیصد رہا جب کہ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۷ء تک محرومی ۴۷ فیصد اور ۱۹۸۰ء - ۱۹۸۴ء میں محرومی سب سے کم یعنی ۲۲ فیصد رہی۔ علاقائی طور پر لوک سبھا میں گجرات، راجستھان اور دلّی کے مسلمانوں کی محرومی کا تناسب سب سے زیادہ رہا اور کشمیر کے علاوہ، کرناٹک اور آسام میں مسلم نمائندگی سب سے اچھی رہی۔ ریاستی اسمبلیوں میں گجرات ہی سب سے زیادہ محرومی کا ریکارڈ پیش کرتا ہے جو ۷۹ فیصد ہے اس کے بعد کرناٹک میں محرومی کا تناسب تقریباً ۷۱ فیصد رہا ہے۔ کیرالہ کے علاوہ دلی اسمبلی میں بھی مسلم نمائندگی قدرے بہتر رہی۔ ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۸ء کی مدھیہ پردیش ریاستی اسمبلی میں مسلم نمائندگی صفر رہی۔

پروفیسر اقبال انصاری کے تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں مسلمانوں کی متناسب نمائندگی سے محرومی کے اسباب حسب ذیل رہے ہیں:

الف: سیاسی پارٹیوں کی جانب سے خصوصاً کانگریس کی طرف سے مسلم امیدواروں کی کم نامزدگی اگرچہ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے بعد کچھ پارٹیاں مسلم نامزدگی فراخدلی سے کرنے لگیں جو زیادہ نتیجہ خیز نہیں رہیں۔

ب: برٹش طریقہ انتخاب یعنی واحد رکنی حلقہ انتخاب اور کامیابی کے لئے محض تعداد کا زیادہ ہونا بغیر اکثریت۔

پ: مسلمانوں کی آبادی کا ارضی پھیلاؤ

ت: ایسے حلقہ انتخاب کا شیڈیولڈ کاسٹ و ٹرائب کے لئے ریزرو کیا جانا جس میں مسلم آبادی کا تناسب معتدبہ ہے۔ اس وقت جبکہ حلقہ انتخاب کے تعین کے لئے "Delimitation Commission" کام کر رہا ہے اسے اس مسئلہ کی جانب توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ شیڈولڈ کاسٹ کے لئے ریزرویشن ایسے حلقوں میں نہ دیا جائے جہاں مسلمانوں کی آبادی لوک سبھا میں ملکی آبادی کے تناسب اور ریاستوں میں ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ ہو۔ دوسرا حل یہ تجویز کیا گیا ہے کہ دلت طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہر شہری کو بلا لحاظ مذہب امیدواری کا حق ایسے حلقوں میں دیا جائے، کیونکہ ہزاروں سال کی 'دلت' سماجی پسماندگی مذہب کی تبدیلی سے فوراً ختم نہیں ہو جاتی۔ سیکولر ریاست میں اندرون ملک و بیرون ملک جنم لینے والے مذاہب کے ماننے والوں میں تفریق کرنا ہندتوا آئڈیالوجی کی توثیق کے مترادف ہے۔

پروفیسر انصاری کی دوسری قابل توجہ اصلاحی تجویز یہ ہے کہ انتخابی حلقوں کو کثیر رکنی Multi member بنایا جائے اور ووٹروں کو واحد ناقابل انتقال ووٹ Single Non-Transferable vote کا حق دیا جائے اور ووٹ کی کثرت کی صورت میں جمع کرنے cummulative voting کا حق ووٹر کو دیا جائے۔ کثیر رکنی ووٹ کے فوائد صرف مسلم اقلیت کو ہی نہیں بلکہ چھوٹی پارٹیوں اور عورتوں کو بھی پہنچ سکتا ہے۔ ووٹنگ کے دوسرے طریقہ بھی آزمائے جا سکتے ہیں جس میں واحد قابل انتقال ووٹ Single Transferable Vote سسٹم بھی ہے۔

موصوف کی ایک تجویز یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ سیاسی جماعتیں پابند کی جائیں کہ وہ نامزدگی میں مناسب نمائندگی اقلیتوں، پسماندہ طبقوں اور عورتوں کو دیں۔

ان سب اصلاحات پر عمل کے باوجود یہ امر یقینی نہیں ہوسکتا کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ عورتوں اور پسماندہ طبقات کی خاطر خواہ نمائندگی پارلیمنٹ و اسمبلیوں میں ایسی ہوجیسا کہ جمہوریت کو صرف اکثریتی جمہوریت کے بجائے سماجی تنوع کی عکاس بنانے کے موجودہ عالمی رجحان کا تقاضہ ہے۔

اس تناظر میں پروفیسر انصاری کی تحقیقی جستجو کا حاصل یہ ہے کہ دیگر مطلوبہ اصلاحات کے ساتھ ماریشس میں رائج سسٹم ہندوستان میں اپنایا جائے جس کے تحت انتخابی حلقوں اور سیٹوں کے علاوہ کچھ سیٹیں ایسی متعین کی جاتی ہیں جن پر انتخاب کے دوران امید واروں کی نامزدگی نہیں ہوتی۔ الیکشن کا نتیجہ آنے کے بعد ملک میں موجود نسلوں، قومیتوں اور اقلیتوں جن کا استحقاق قانوناً تسلیم شدہ ہو ان کی حاصل کردہ سیٹوں اور ان کے متناسب حق کے درمیان کمی کو ایک حد تک پورا کرنے کے لئے ان تسلیم شدہ گروہوں کے سب سے اچھے ہارنے والے Best Losers امید واروں کو آزاد سیٹیں الاٹ کر دی جاتی ہیں۔

ہندستان میں اس طریقہ کو اپنانے میں یہ خوبی نظر آتی ہے کہ ایک طرف اس سے عورتوں واقلیتوں کی مطلوبہ حد تک نمائندگی یقینی بنائی جا سکے گی، دوسری جانب یہ بھی یقینی ہوسکے گا کہ عورتوں میں ہر فرقہ و مذہب و ذات و علاقہ کی موزوں نمائندگی ہوگی۔ اسی طرح اقلیتوں کے حق کے تحفظ کے ساتھ یہ بھی یقینی بنایا جا سکے گا کہ ان کے درمیان خواتین، اور پسماندہ طبقات اور علاقوں کی موزوں نمائندگی بھی ہوگی۔

کتاب کے اندراجات، نتائج و سفارشات کو ہندوستان میں نہ صرف مسلم اقلیت بلکہ دیگر ایسے طبقات جن کی خاطر خواہ نمائندگی نہیں ہوسکی ہے مثلاً خواتین وغیرہ کو مناسب نمائندگی کا حق دینے کے لئے ان مسائل و معاملات کو موضوع بحث بنانے کی ضرورت ہے۔

کتاب کا نام : ساتھ رہتے ہوئے علیحدہ رہنا
تاریخ وسیاست میں ثقافتی ہندوستان

مرتبین : پروفیسر مشیر الحسن و پروفیسر اسیم رائے

شائع کردہ : آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی ۲۰۰۵ء

صفحات : ۴۲۷

قیمت : ۷۵۰ روپے

تبصرہ نگار: پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی

اس موضوع پر ایک انٹرنیشنل سمینار کا انعقاد ۱۸۔۲۱ دسمبر ۲۰۰۲ء میں پروفیسر مشیر الحسن نے کیا جو اس وقت اکیڈمی آف تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز کے ڈائرکٹر تھے ۔ اس سمینار میں ملک وبیرون ملک کے دانشوروں نے شرکت کی اور مقالات پیش کئے۔ ان میں شیل مایا رام، اسیم رائے، مشیر الحسن ، فرانس روہنس ، باربرا میٹکاف کے مقالات خصوصیت کے حامل ہیں۔سمینار کے بعد پروفیسر مشیر الحسن اور اسیم رائے نے ان مقالات کا مجموعہ ایڈٹ کرکے ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا۔

اس کتاب کے دیباچہ میں بانیان جامعہ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کی انسان دوستی کا ذکر بڑی اہمیت کا حامل ہے پھر اس روایت کو تقسیم ہند کے بعد جامعہ کے دانشوروں محمد مجیب اور سید عابد حسین نے اپنی کوششوں سے جاری رکھا اور ایک صحت مند بحث کی بنیاد ڈالی۔ آج ان کے سیکولونظریات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ جامعہ کی انہیں تمام قدروں کو سراہتے ہوئے اس سمینار کا انعقاد جامعہ میں کیا گیا۔ پروفیسر مشیر الحسن نے اس موضوع پر کئی اور کتابیں بھی لکھ کر شائع کی ہیں۔ اس کتاب کا مقدمہ پروفیسر اسیم رائے نے تحریر کیا ہے۔ اپنے افتتاحی کلمات میں ہندوستانی تہذیب کی ان قدروں کا ذکر کیا ہے جن کی بنیاد پر سیکولر ہندوستان قائم ہوا۔ لیکن اس موضوع پر نہ تو اسیم رائے

نے اپنے مقدمہ میں توجہ دی اور نہ ہی کسی دانشور نے کوئی مقالہ مغل عہد پر تحریر کیا تا کہ اس روایت کو اس دور سے دیکھا جائے ۔ اکبر نے ۱۵۷۵ میں عبادت خانہ قائم کیا جہاں لوگوں کو آزادی کے ساتھ مختلف موضوعات پر بات کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ ۱۵۷۶ میں شیعی مسلک سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کو بھی دعوت دی گئی۔ دراصل سولہویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں ''علیحدہ رہتے ہوئے ساتھ رہنے کی'' پہلی مثال ملتی ہے ۔ اکبر نے دار الترجمہ قائم کیا جس میں اس نے سب سے پہلے رامائن ، مہابھارت اور بائبل کے فارسی تراجم کرائے تا کہ مسلمان ہندودھرم اور عیسائی مذہب کے بارے میں اپنی صحیح وصحت مند فکر بنا سکیں۔ ورنداون کے تیرتھ استھان کو اہمیت دی اور یہ اکبر ہی کا کارنامہ تھا کہ سولہویں صدی عیسوی میں ورنداون مغل حکومت کے نقشہ پر نمایاں مقام حاصل کرسکا۔ تمام قدیم مندر اسی دور میں ورنداون میں تعمیر ہوئے۔ مسلمانوں کے لئے مغل حکمرانوں نے درگاہ حضرت معین الدین چشتی میں جو اجمیر میں واقع تھی ذاتی دلچسپی لی اور اس کے احیاء کے لئے اکبر نے اہم کارنامہ انجام دیا۔ دوسری کوشش اکبر ہی کے وارث داراشکوہ نے مجمع البحرین'' لکھ کر کی۔ اس موضوع سے متعلق کوئی مضمون اس کتاب میں موجود نہیں۔ ایم رائے کا مقدمہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس موضوع سے متعلق مختلف موضوعات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اس کتاب کا پہلا مقالہ ایم رائے کا ''ہر دل عزیز اسلام'' کے موضوع پر ہے۔ انہوں نے اپنے مقالہ میں کہا ہے کہ صوفی سید جلال الدین جہانیاں جہاں گشت نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ اللہ کے لئے ہندوستانی نام استعمال نہ کریں ۔ لیکن اس کے حوالہ کے لئے انہوں نے جلال الدین جہانیاں جہاں گشت کے رقعات یا ملفوظات کا حوالہ نہیں دیا بلکہ انہوں نے انامیری شمل کے ایک مقالہ کا حوالہ دیا ہے۔ داراشکوہ نے اپنیشد کا فارسی ترجمہ کیا تو ابتداء ان الفاظ سے کی ہے (ترجمہ) ''اس کو اس نام سے شروع کرتا ہوں جس کو جس نام سے بھی پکارو وہ سنتا ہے۔'' تو ایسی مثالیں بھی ہماری تاریخ میں موجود ہیں۔صفحہ ۳۴ و ۳۵ پر ایم رائے نے مسلم سماج میں ایک دوسرے سے نفرت کی بات کی ہے وہ صرف اس دور کی دین نہ تھی بلکہ اس کا مطالعہ ہمیں ساتویں صدی عیسوی کی دوسری دھائی سے کرنا ہوگا جب مسلمانوں میں ملوکیت کا قیام عمل میں آیا اور اس ملوکیت کے نظام نے مسلمانوں میں سماجی برابری کے اصول کو بری طرح پامال کرڈالا۔ ترک اور مغل جب ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ اسلامی سماج کی قدریں لے کر نہیں آئے تھے بلکہ تقسیم شدہ مسلم سماج کی قدریں لے کر

ہندوستان میں داخل ہوئے اور بنگال میں جو مثالیں اسیم رائے نے دی ہیں یہ اسی کا نتیجہ ہیں، ملک فیروز خاں اور ایوب خاں کے خیالات کی طرف جو اسیم رائے نے اشارہ کیا ہے وہ باتیں تیرہویں صدی سے منہاج الرسول، ضیاء الدین برنی اور عبد القادر بدایونی پہلے ہی کر چکے ہیں۔

شیل مایارام کا مقالہ ''اجمیر'' سے متعلق ہے۔ اپنے اس مقالہ میں اجمیر کی اہمیت اور اس کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ در اصل صوفیاء کا اہم کردار ترائن کی لڑائی کے بعد شروع ہوا۔ ترائن کی جنگ نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت پیدا کی لیکن صوفیاء نے اپنے کردار سے اسلام کی صحیح شناخت ہندوستان میں کرائی۔ انہوں نے ہندوستان میں خانقاہ کی بنیاد ڈالی جس کے دروازے سب کے لئے کھلے رکھے۔ جبکہ ہندوستان میں مندروں میں مندروں کے دروازے نیچی ذات سے تعلق رکھنے والے ہندوؤں کے لئے بھی اس دور میں بند تھے۔ صوفیا نے انہیں اپنے پاس بٹھایا جس میں تبدیلی مذہب کا کوئی سوال نہ تھا۔ یہ صوفیا کا نہایت اہم کارنامہ ہے۔ آج ان کی وفات کے سات سو سال بعد ان کی قبریں درگاہوں کی شکل میں وہی کردار ادا کر رہی ہیں۔ نہ صرف مسلم حکمرانوں نے اجمیر کی درگاہ کے لئے مدد معاش کی زمین دی بلکہ راجپوت اور مرہٹہ راجاؤں نے بھی اس درگاہ کے لئے زمینیں دیں۔ اور یہی ہندوستان کی ایک خصوصیت ہے۔ ایک مقالہ کیرین کا۔ گائے کا محافظ صوفی۔ کے موضوع سے متعلق ہے ایک چشتی صوفی شیخ حمید الدین ناگوری نے گوشت کھانا ترک کر دیا اور ان کی خانقاہ میں گوشت سے متعلق کوئی غذا لانے کی اجازت نہ تھی۔ انہوں نے وصیت بھی کی کہ ان کی وفات کے بعد ان کے عرس پر کوئی غذا ایسی تیار نہیں کی جائے گی جس میں گوشت شامل ہو۔ مدھو ترویدی کا مقالہ مرثیہ نگاری سے متعلق ہے۔ لیکن انہوں نے ہندو مرثیہ گوشعراء کا ذکر نہیں کیا جبکہ اٹھارہویں صدی عیسوی نے کئی ہندو مرثیہ گو شعرا پیدا کئے۔ جن میں چھنو لال دلگیر کا نام سرفہرست ہے۔ مشیر الحسن کے مضمون کا عنوان شریف کلچر اور انگریزی راج سے متعلق ہے۔ دلی روبہ زوال ہوئی اور لکھنو کا عروج لیکن جب میر تقی میر لکھنو گئے تو وہ کہتے ہیں۔

خرابہ دلی کا لکھنو سے بہتر تھا
وہیں اے کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

عبد الحلیم شرر اور الطاف حسین حالی نے اس تہذیبی وثقافتی زوال کا مرثیہ لکھا۔

کامریڈ، کلکتہ عبد العزیز کے انتقال پر تعزیت نامہ شائع کیا۔ لیکن بعد میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسی خاندان عزیزی کے حکماء نے طب کے احیاء میں زبردست کارنامہ انجام دیا۔ مشیر الحسن نے ذکاء اللہ کے علمی کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں ان کے تراجم گلستان وبوستان کا ذکر بھی کیا ہے۔ در اصل یہ وہ وقت ہے جب اخلاقیات کے احیاء کے لئے کام کرنا تھا تو ذکاء اللہ نے اس بات کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے شیخ سعدی کی ان دو کتابوں کے تراجم اردو زبان میں کردئے اس لئے کہ اب مسلمانوں میں فارسی زبان کا علم کم ہوتا جارہا تھا اور مسلمان اپنے اس ذخیرے سے محروم ہورہا تھا تو ان تک اخلاقیات کی قدریں اور تعلیم کس طرح پہونچے۔ اب اس کا واحد ذریعہ ان کے اردو تراجم تھے۔ اور اب اکیسویں صدی میں ذکاء اللہ کے ان اردو تراجم کی حیثیت بھی وہی ہوتی جارہی ہے جو ان کے دور میں فارسی کی تھی۔ آج ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں جہاں فارسی اور اردو کے شعبہ جات ہیں ان میں طلبا کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔

مشیر الحسن کی رائے ہے کہ انگریزی راج کے قیام کے بعد جو ثقافتی نقصان بنگال کو پہونچا انہیں سے دہلی کو بھی دوچار ہونا پڑا۔ مسلم دانشور اس زوال کا زبردست شکار ہوئے۔ لیکن کچھ پرانے خاندانوں کو ان کے شجرے کی اہمیت کی وجہ سے برٹش سرکار نے مراتب سے نوازا نذیر احمد کا ناول ''ابن الوقت'' اس وقت کے معاشرے کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے۔ مشیر الحسن کا کہنا ہے کہ دہلی کے دانشوروں کو برٹش حکومت میں مناصب اس وجہ سے مل سکے کیونکہ ان کی زبان سرکاری زبان رہی۔ لیکن میری اپنی ناقص رائے میں وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ برٹش سرکار، کی سرکاری زبان ۱۸۹۱ تک فارسی رہی اور یہ سب فارسی زبان کے دانشور تھے۔ یہ وہ دور ہے جب غالبؔ اپنے فارسی کلام کو اہمیت دے رہے ہیں دہلی میں فارسی داں مسلم دانشوروں کی تعداد دوسرے شہروں کے مقابلہ میں زیادہ تھی کیونکہ دہلی ،دہلی سلطنت کے دور سے لودیوں اور پھر شاہجہاں کے دور سے بہادر شاہ دوم تک مغل حکومت کا مرکز رہا ہے تو اس کا دوسرا ہی اثر ہوتا ہے۔ دلی کی عظمت کے ضیاء الدین برنی بھی قائل تھے۔ ۱۲۵۸ کی بغداد کی تباہی کے بعد دلی مسلم دنیا کا بغداد بن گئی تھی۔ خوشحال خاں خٹک جو عہد اورنگزیب کا منصبدار اور پشتو کا شاعر تھا دلی کا قصیدہ خواں ہے۔ بہت سے شعراء نے دلی کی تعریف کی اور اسی حقیقت کی عکاسی سرسید کی ۱۸۴۷ء کی شائع شدہ آثار الصنادید میں ملتی ہے۔ مشیر الحسن کا کہنا ہے کہ اردو تاریخ نگاری کا احیاء انیسویں صدی میں ہوا لیکن یہ مورخین عہد وسطیٰ کی تاریخ نگاری

سے بندھے رہے۔ اور انہوں نے جدید یا مغربی تاریخ نگاری کے اصولوں کو بھی نہیں اپنایا۔ لیکن جہاں تک میرا مطالعہ ہے اس بناپر میری اپنی ناقص رائے یہ ہے کہ اردو تاریخ نگاری نے عہد وسطیٰ کی فارسی تاریخ نگاری کی روایت جس کو ضیاء الدین برنی ، ابو الفضل اور علی محمد خان نے قائم کیا تھا نہیں اپنایا اور نہ ہی جدید یا مغربی تاریخ نگاری کے اصولوں کو اپنایا۔ اسی لئے اردو زبان میں تاریخ پر کوئی اہم کام نظر نہیں آتا۔ اس کتاب میں ایک جامع مقدمہ اور سترہ نہایت اہم مضامین ہیں جو ہمارے مطالعہ کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس اہم موضوع پر سمینار اور اس کے بعد اس سمینار میں پیش کردہ مقالات کی اشاعت کا کارنامہ ہمارے ملک کے ممتاز مورخ پروفیسر مشیر الحسن صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ثقافتی سرگرمیاں

ہند و ایران ثقافتی تعلقات کا
طلائی جشن

ہندوستان اور ایران کے درمیان تعلقات کی تاریخ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کی تاریخ کا سرا ماقبل تاریخ سے ملتا ہے چنانچہ آثار قدیمہ کے ماہرین کو اصفہان کے دورافتادہ علاقوں میں بودائی مذہب کی عبادت گاہوں کے کچھ کھنڈرات ملے ہیں جن سے اس حقیقت کی نشاندہی ہوجاتی ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات اس وقت بھی موجود تھے اور بامیان کا علاقہ جہاں قدیم ترین بودائی مجسمے بکثرت موجود رہے ہیں، ایرانی مملکت کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا نیز اوستائی اور سنسکریت زبانوں کے درمیان پائی جانے والی مماثلت بھی دونوں ملکوں کے درمیان قدیمی تعلقات کی نشاندہی کرتی ہے۔

ظہور اسلام کے بعد ان تعلقات کو غیرمعمولی فروغ حاصل ہوا اور ہندوستانی تہذیب پر ایرانی تہذیب کے گہرے نقوش اس حقیقت کی غمازی کر رہے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی تعلیمات کی مقبولیت میں ایرانی دانشوروں نے نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں اور دانشوروں کا یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ اردو زبان اور تاج محل جیسی عظیم الشان یادگار عشق ہندوستانی اور ایرانی تہذیب کی گرانقدر مشترکہ میراث ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانوی سامراج نے ہندوستان کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کے بعد ہندو ایران ثقافتی تعلقات کے شیرازہ کو منتشر کرنے کی بھرپور کوشش کی اور پورے برصغیر میں انگریزی کو فارسی کا جانشین بنادیا۔

برطانوی حکومت کی ظالمانہ راہ و روش کے خلاف ہندوستانی عوام نے آزادی کی جنگ چھیڑدی اور غیرمعمولی جانی و مالی خسارہ برداشت کرنے کے بعد ہندوستان آزاد اور اپنے قدیمی دوست ملک ایران کی طرف دوبارہ متوجہ ہوگیا اور دونوں ملکوں کے درمیان سرکاری سطح پر تعلقات قائم ہوگئے۔

ان ثقافتی تعلقات کے پچاس سال مکمل ہونے پر بروز جمعہ بتاریخ ۲۲/۱۰/۸۵ھ ش بمطابق ۹فروری ۲۰۰۷ء کو خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی میں ایک جشن طلائی کا انعقاد کیا گیا۔

جس میں ہندستان کی عظیم علمی، دینی، سیاسی شخصیتوں اور بڑی تعداد میں فارسی کے اساتذہ نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ ہندستان میں جمہوری اسلامی ایران کے سفیر محترم، مختلف ایرانی اداروں سے وابستہ افراد، اساتذہ اور طالب علموں نے بھی شرکت فرمائی جن کی تعداد ۶۰۰ سے زیادہ تھی۔

اس موقع پر ایران کی دستکاری اور دیگر ہنری نمونوں کی نمایش کا اہتمام کیا گیا۔ اس نمایش کے افتتاح کے بعد جشن طلائی کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے قرآنی آیات کی تلاوت کی گئی۔ اس کے بعد خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی کے مسئول محترم محمد حسین مظفری صاحب نے حاضرین کا استقبال کیا اور کہا کہ آج سے پچاس سال قبل ہند اور ایران کے درمیان ایک کلچرل قرارداد کے تحت نئی دہلی میں خانۂ فرہنگ ایران کی بنیاد ڈالی گئی۔ جس کی بنیاد پر ہند و ایران تہذیبی رشتوں کو ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھنے کی ایک کامیاب کوشش کی تھی۔

آپ نے جناب علی اصغر حکمت صاحب کا خصوصی ذکر کیا۔ جو اس وقت ہندستان میں ایران کے سفیر تھے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ عام طور پر ملکوں کے درمیان پہلے قراردادوں پر دستخط ہوتے ہیں اور پھر ان پر عمل درآمد ہوتا ہے، لیکن ہندستان اور ایران کے درمیان یہ قرارداد اپنی نوعیت کی بے نظیر قرارداد ہے۔ ہند و ایران کے درمیان اس قرارداد سے پہلے بھی تہذیبی و تمدنی میدان میں کام ہو رہا تھا اور ہمارے اسکالرز اور اہم اشخاص دوستانہ ماحول میں اس ضمن میں کام کر رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو آزاد ہندستان کے سب سے پہلے وزیر تعلیم تھے، ہندستان میں خانۂ فرہنگ ایران کے کھلنے پر خوشی کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی کہ یہ ادارہ ہند و ایران رشتوں کو اجاگر کرنے میں نمایاں کوششیں انجام دے گا۔

آپ نے فرمایا کہ خانۂ فرہنگ ایران، نئی دہلی شروع ہی سے ایران و ہند کو ایک دوسرے سے نزدیک سے نزدیک لانے میں انہماک سے مصروف ہے۔

محترم مرتضیٰ شفیعی شکیب صاحب رایزن فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی نے محترم مظفری صاحب کے بعد تقریر کی۔ آپ نے بھی مہمانوں کا استقبال کیا اور فرمایا: ان پچاس برسوں میں ہند ایران کلچرل روابط ہمیشہ استوار رہے ہیں۔ اور دونوں ملکوں کے اسکالرز اور دیگر اہم شخصیتوں نے ہند ایران تہذیبی تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے قابل قدر کوششیں انجام دیں اور ایک دوسرے کی تہذیبی اقدار کو ایران اور ہندستان میں متعارف کرانے میں جد و جہد کی ہے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ اس

جشن کے انعقاد کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہند ایران تہذیبی رشتوں کو مستحکم کرنے میں جن حضرات نے کوششیں کی ہیں ان کا تعارف کرایا جائے اور ان کی قدردانی کی جائے۔ اس طرح ہم ان تہذیبی اقدار کی بھی قدرشناسی کرسکیں گے جو ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان قدیم زمانے ہی سے برقرار رہی ہیں اور جن کا ہمارے روابط میں زیادہ حصہ رہا ہے۔ محترم شفیعی شکیب صاحب نے مزید فرمایا:

یہ طے کیا گیا کہ انقلاب اسلامی ایران کی سالگرہ کے موقع پر جو ہندستان کے یوم آزادی کے صرف ایک ہفتہ کے بعد منائی جاتی ہے، ان حضرات کی خدمت میں لوح سپاس اور ابوریحان البیرونی نام کے انعامات پیش کئے جائیں جنہوں نے ہند ایران تہذیبی رشتوں کو آگے بڑھانے، انہیں مستحکم اور اجاگر کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ یہ جشن ایک ایسا مبارک موقع ہے کہ ہم دوستی اور ہمدلی کے اپنے دیرینہ تعلقات کی تجدید کرسکتے ہیں۔ ان کی تاریخی اہمیت کا اندازہ لگاسکتے ہیں اور ان رشتوں کی جو عظیم اور معنوی اقدار پر مبنی ہیں، قدرشناسی کرسکتے ہیں۔ یہی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے وقتی تاریخی نشیب و فراز اور سیاسی اتار چڑھاؤ ان روابط کو متاثر نہیں کرسکے۔ ہند اور ایران کی تاریخی، تہذیبی اور تمدنی میراث ہمارا ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق معنوی اقدار کے احیا سے ہے۔ خاص طور پر وہ اقدار جن کا تعلق صلح جویانہ اور انصاف پسندانہ پہلوؤں سے ہے اور جو ہماری مشترکہ تہذیب کا ایک لازمی حصہ رہی ہیں۔ ان اقدار کی ضرورت آج پہلے سے زیادہ ہے اس لئے کہ آج کی دنیا کے بعض علاقوں میں جنگ، زور زبردستی اور ظلم نے ناامنی پھیلا رکھی ہے۔ ہمارے دونوں ملکوں کے تعلقات دوستی اور عشق کی بنیادوں پر قائم رہے ہیں۔ اس نوعیت کے تعلقات سے متعلق ہمارے اسلاف اور ہمارے زمانے کے صاحب نظر حضرات نے کہا ہے کہ اس نوعیت کے تعلقات دوسرے ملکوں کے درمیان شاید نظر نہیں آتے۔ ہند ایران تعلقات ہمیشہ برقرار رہیں اور ان دونوں عظیم ملتوں کے درمیان دوستی ہمیشہ قائم رہے۔

مظفری صاحب اور شفیعی شکیب صاحب کی تقاریر کے بعد جمہوری اسلامی ایران کے نئی دہلی میں سفیر محترم جناب سیاوش زرگر یعقوبی صاحب نے مختلف ادوار میں ہندو ایران کے درمیان روابط کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ آپ نے اس سلسلے میں فرمایا:

ہندستان اور ایران کے درمیان نسلی، تمدنی اور تہذیبی رشتوں میں اشتراک کے سب ہی قائل ہیں۔ یہ اشتراک دوسرے ممالک میں مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ یہ دونوں ملک صدیوں سے ایک دوسرے

سے نزدیک رہے ہیں۔ سفیر محترم نے ہند ایران روابط کے روز بروز بہتر ہونے کی تاریخ بھی بیان کی اور اعداد و شمار بھی پیش کئے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ ۲۰۰۶ میں ایران و ہند کے درمیان ۴۰ فرہنگی، سیاسی اور اقتصادی وفد دونوں ملکوں کے درمیان آئے گئے اور ان میں بعض وزارتی سطح پر تھے۔

محترم سفیر ایران نے یہ خوشخبری بھی دی کہ ہند اور ایران کے درمیان ۲۰۰۱ میں تجارت ۶۰۰ ملین ڈالر تھی جو ۲۰۰۵ میں بڑھ کر ۶ میلیارد ڈالر ہوگئی ہے۔

شعبۂ اسلامیات، جامعہ ہمدرد کے سابق صدر محترم اوصاف علی صاحب اسلامی علوم اور ایرانی تہذیب کے معروف اسکالر ہیں۔ آپ کو اس جشن طلایی میں لوح سے نوازا گیا۔ آپ نے اپنی مختصر تقریر میں ایران کی اسلامی، انسانی تہذیب اور ہندستان میں علمی و تمدنی خدمات کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: یہ دونوں ہند اور ایران متمدن ملک ہیں۔ قدیم زمانے سے ان کے درمیان ہر قسم کے روابط برقرار ہیں۔ اور یہ تعلقات کسی بھی صورت میں ٹوٹنے والے نہیں۔ ایران نے ہندستانی زندگی کے مختلف شعبوں جیسے زبان، ادب، سیاست، معماری، ہنر، موسیقی اور عرفان و تصوف میں گہرے اثرات چھوڑے ہیں اور اسی طرح ہندستانی تہذیب و تمدن کے اثرات بھی ایرانی تہذیب پر محسوس ہوتے ہیں۔ اوصاف صاحب نے فرمایا کہ ۲۰۰۰ میں اقوام متحدہ نے ۲۰۰۱ کو ''تہذیبوں کے درمیان گفتگو کا سال'' اعلان کیا اور یہ ایران کے صدر حجت الاسلام سید محمد خاتمی کی تجویز پر ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ ایران اور اہل ایران صلح و آشتی کے علمبردار ہیں۔

ہند و ایران کے تمدنی اور تہذیبی رشتوں کے پچاس سال پورے ہونے کی مناسبت سے اس جشن کے لئے جناب صفار ہرندی وزیر فرہنگ و ارشاد اسلامی ایران اور ڈاکٹر کرن سنگھ صدر انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نے پیغامات ارسال کئے تھے جو اس جشن میں پڑھے گئے۔

جناب محمد حسین صفار ہرندی وزیر محترم برائے فرہنگ و ارشاد اسلامی نے اپنے پیام میں فرمایا:

مجھے نہایت خوشی ہے کہ ''ہند و ایران ثقافتی روابط کے پچاس سال'' عنوان سے ہمارے دوست ملک ہندستان میں ایک عظیم جشن کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ یہ جشن درحقیقت اس بات کا ترجمان ہے کہ ہم ان دو عظیم ملکوں کے درمیان ثقافتی و تمدنی رشتوں کو جو قدیم زمانے سے برقرار ہیں، اہمیت دیتے ہیں اور انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ایران اور ہندستان اپنی تاریخ کے آغاز ہی سے تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہے ہیں۔ تاریخی

نشیب و فراز کے باوجود ان دونوں علاقوں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ امن و آشتی سے زندگی بسر کرتے رہے ہیں اور ان کے درمیان ایسی محبت اور رفاقت رہی ہے جس کی مشکل ہی سے کہیں کوئی مثال ملتی ہے۔

یہ روابط حسنہ برصغیر ہندستان میں اسلام کی اور خاص طور پر مسلمان ایرانیوں کی ہندستان میں آمد کے بعد اور بھی زیادہ نزدیکی اور وسیع ہوگئے۔ انہی نزدیکی روابط کی وجہ سے قرون وسطی میں تقریباً ایک ہزار سال کی مدت میں ایرانی اور قدیم ہندستانی تہذیب کے امتزاج سے ایک ایسی تہذیب نے جنم لیا جسے بہ آسانی ایک عظیم تہذیب کہا جا سکتا ہے اور جس کا عالمی تہذیب میں ایک خاص مقام ہے۔

میری نظر میں ایران اور ہندستان کے لوگوں کی تاریخ کی بازشناسی ہمارے تہذیبی روابط کو اور گہرا کرسکتی ہے اور ان روابط کا استحکام خود اس علاقے میں صلح و آشتی اور استحکام کا باعث ہوگا۔

محمد حسین صفار ہرندی

وزیر فرہنگ و ارشاد اسلامی

ڈاکٹر کرن سنگھ صدر انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز کا پیغام:

مجھے خوشی ہے کہ خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی، ہند ایران تہذیبی اور ثقافتی روابط کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ایک جشن کا اہتمام کررہا ہے۔

ہند اور ایران انسانی تاریخ کے شروع ہی سے ایک دوسرے سے متعلق اور تہذیبی رشتوں میں بندھے رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ تعلقات آئندہ بھی مستحکم ہوتے رہیں گے۔ تہذیبی وفود جن میں مفکر، طالب علم اور ہند ایرانی تعلقات کے حامی حصہ لیں گے، ایک دوسرے کے ملک کا سفر کریں گے۔ ہماری کاؤنسل کے بانی مولانا ابوالکلام آزاد خود ایک مفکر اور فارسی زبان و ادب کے محقق تھے اس وجہ سے بھی میں اپنی کاؤنسل کی طرف سے ہندستان میں خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کی تاسیس کے پچاس سال مکمل ہونے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اسلامی انقلاب کی ۲۸ویں سالگرہ

اور

''سعدی خصوصی انعام'' کی تقسیم کا جشن

۲۲ بہمن ۱۳۸۵ھ ش کو انقلاب اسلامی کی کامیابی کے ۲۸ سال مکمل ہونے پر خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی میں ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں ہندستان میں مقیم ایرانی، سفارت کار و محققین اور فارسی اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں ایرانی دوستوں نے شرکت فرمائی۔ اس علمی و ثقافتی اجلاس کا افتتاح قرآن حکیم کی تلاوت سے ہوا جس کے بعد ایران کا قومی ترانہ پیش کیا گیا۔

اس کے بعد جناب کوہی دبیر ادبیات مجتمع آموزشی ایرانیان اور پروفیسر عین الحسن جواہر لعل نہرو، یونیورسٹی، نئی دہلی نے انقلاب اسلامی سے متعلق اپنی دلچسپ نظمیں پیش کیں جنہیں حاضرین نے بہت سراہا۔

محترم مظفری صاحب مسئول خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی نے حاضرین کا استقبال کیا۔ آپ نے فرمایا: اس بار انقلاب اسلامی کی کامیابی کی سالگرہ کا جشن پچھلے برسوں کے مقابلے میں ایک طرح مختلف ہے، اس لئے کہ اس سال اس موقعے پر ہندستان میں فارسی زبان و ادب کے پانچ اساتذہ کو ''جائزۂ سعدی'' پیش کیا جارہا ہے۔ میں انعام پانے والوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آپ نے انقلاب اسلامی کے بارے میں کہا: ایران اس سال مشروطیت کی تحریک کی کامیابی کی صد سالہ تقریبات منعقد کررہا ہے۔ اسی مناسبت سے خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی نے مشروطیت کی اس ایرانی تحریک کی کامیابی میں ہندستانیوں کے حصے کو اجاگر کرنے کے لئے مراسم کا اہتمام کیا ہے۔ ایرانیوں نے مشروطیت کی تحریک ظالم بادشاہت اور داخلی مظالم کے خلاف شروع کی تھی اور خارجی اثرات و عوامل کو نظرانداز کردیا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ تحریک اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ آپ نے دیکھا کہ ایران نے بعد کے سالوں میں اپنے گذشتہ تجربات کی بنیاد پر داخلی اور خارجی مظالم اور استبداد کے خلاف اپنی تحریک جاری رکھی اور اسے بالآخر کامیاب بنایا۔

جناب استاد کوروش صفوی دہلی یونیورسٹی میں ایران کے مہمان استاد ہیں۔ آپ نے اس موقع پر اپنی تقریر میں ہند ایرانی قدیم رشتوں کا ذکر کیا اور موجودہ زمانے میں ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ آپ نے ہند ایران روابط کو اساطیری بنیاد پر بھی اجاگر کیا۔

اس کے بعد فارسی کے پانچ دانشوروں اور استادوں کی قابل قدر خدمات کے اعتراف و احترام میں ''سعدی خصوصی انعام'' کے عنوان سے پچاس، پچاس ہزار روپے اور لوح سپاس پیش کیے گئے۔ ان اساتذہ نے فارسی زبان و ادب کی ترویج اور ہند اور ایران کے تہذیبی رشتوں کو مزید استوار کرنے میں پرخلوص کوششیں کی ہیں۔ ''سعدی خصوصی انعام'' حاصل کرنے والے اساتذہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱- پروفیسر ولی الحق انصاری، شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

۲- پروفیسر شعیب اعظمی، شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۳- ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

۴- پروفیسر وارث کرمانی، شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۵- ڈاکٹر سید محمد یونس جعفری، شعبۂ فارسی ذاکر حسین کالج، نئی دہلی

رایزن فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی شفیعی شکیب صاحب نے اس موقع پر اپنی تقریر میں فرمایا: ہندستان کے فارسی اساتذہ کی خدمات کو سراہنے کے لئے ''سعدی خصوصی انعام'' پیش کرنے کا پروگرام نیا نہیں ہے۔ برسوں سے اس امر پر غور کیا جارہا تھا کہ اساتذہ کی علمی و ادبی کاوشوں کی قدردانی کے طور پر انہیں خصوصی انعام و احترام سے نوازا جانا چاہئے۔ خدا کا شکر ہے کہ آج ان کاوشوں کو عملی جامہ پہنایا جارہا ہے۔

آپ نے مزید فرمایا: میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کی عنایت و مہربانی اور ہمعاونوں کے صمیمانہ تعاون سے خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی نے ''سعدی خصوصی انعام'' پیش کرنے کا پہلا مرحلہ طے کرلیا ہے۔ یہ ایک مبارک شروعات ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ پودا جو آج خانۂ فرہنگ ایران، نئی دہلی میں لگایا جارہا ہے، جلد ہی ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرلے گا اور فارسی زبان و ادب کے خادم اس کے ثمرات سے بہرہ ور ہوتے رہیں گے۔

آپ نے کہا کہ ہم نے ہندستان میں صاحب نظر دانشمندوں کے مشورے سے پانچ اساتذہ کا انتخاب کیا ہے۔ اس سال کے بعد ہر سال یہ جایزہ فارسی زبان کے تین معتبر اساتذہ کو پیش کیا جائے گا۔

یہ انعامات اس حقیقت کے ترجمان ہیں کہ ہم فارسی زبان اور ہندستان کے ان اساتذہ کی اہمیت کے قائل ہیں جو اس زبان اور اس کے عظیم ادب کی خدمت میں مشغول ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ انعامات فارسی کے نوجوان اساتذہ اور طلبا کے لئے باعث تشویق ثابت ہوں گے اور وہ زیادہ توجہ اور دلچسپی سے اپنے اپنے کام میں منہمک رہیں گے۔ مزید برآن وہ جلد ہی اپنے اساتذہ کی خالی جگہوں کو پُر کرنے میں کامیاب ہوں گے اور گراں قدر کام اپنی یادگار چھوڑیں گے۔ مجھے امید ہے کہ افغانستان، پاکستان، تاجیکستان، بنگلادیش اور ان تمام ملکوں میں بھی جہاں فارسی پر خاص توجہ دی جاتی ہے، انعامات کا یہ سلسلہ جاری ہوگا اور اس طرح ''سعدی خصوصی انعام'' ایک بین الاقوامی انعام کی صورت اختیار کرلے گا۔

قلمی تعاون کی درخواست

قارئین کرام!

ادارہ ''راہِ اسلام'' تقریباً گذشتہ تین دہائیوں سے پہلے ماہنامہ اور بعد میں فصلنامہ کی اشاعت کے ذریعہ اسلام اور ملت اسلامیہ کی خدمت میں ہمہ تن سرگرم ہے۔ اس فصلنامہ کی اشاعت کا بنیادی مقصد تعلیمات عالیہ اسلامیہ کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت ہے تاکہ عصر حاضر کے لوگوں کو اسلامی تعلیمات تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد عظیم میں آپ جیسے بلند مرتبہ مصنفین و محققین اور دانشوروں کے علمی و قلمی تعاون کے بغیر کامیابی حاصل کرنا ناممکن ہے۔

لہذا آپ اپنے مقالات مستند منابع و ماخذ کے ساتھ اب E-Mail کے ذریعہ بھی ارسال کرسکتے ہیں البتہ جن علاقوں میں یہ سہولت موجود نہیں ہے وہ صاف اور خوشخط عبارت کے ساتھ اپنی نگارشات بذریعہ ڈاک ارسال کرسکتے ہیں۔ ہمارا ای میل ایڈریس ہے:

newdelhi@icro.ir
http://newdelhi.icro.ir

ناگپور میں فارسی بازآموزی کا ساتواں دور

علاقائی سطح پر فارسی بازآموزی کا ساتواں دور منگل ۲۰ مارچ ۲۰۰۷ء کو ناگپور میں شروع ہوا۔ خانۂ فرہنگ جمہوری اسلام ایران، نئی دہلی اور ناگپور یونیورسٹی کے شعبۂ انسانی علوم و سماجی مطالعات کے اشتراک سے منعقد ہونے والا یہ پروگرام دو ہفتے تک جاری رہا۔

پروگرام کے افتتاحی جلسے میں محترم محمد حسین مظفری مسئول خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی، ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر پٹھان، ڈاکٹر کوروش صفوی اور دانشگاہ ناگپور کے دیگر ذمہ دار حضرات کے علاوہ طلبا، اساتذہ اور فارسی زبان سے تعلق رکھنے والے حضرات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ یہ افتتاحی جلسہ شعبۂ انسانی علوم وسماجی مطالعات کے ہال میں منعقد ہوا۔

قرآن کریم کی چند آیات کی تلاوت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد نعت پیغمبرؐ پیش کی گئی۔ جلسے میں سب سے پہلے ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر پٹھان صاحب نے اپنی مختصر لیکن اہم تقریر میں ہندستانی اور ایرانی دانشگاہوں کے درمیان تعلقات پر روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ پروگرام جو یونیورسٹی کے شعبۂ انسانی علوم و سماجی مطالعات اور نئی دہلی میں خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کے باہمی تعاون سے تشکیل پارہا ہے، ایک ایسا مفید موقع فراہم کرتا ہے جس سے ہم فارسی زبان اور ایرانی تہذیب وتمدن سے بہتر طور پر آشنا ہوسکتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ناگپور یونیورسٹی اور ایران کی مختلف دانشگاہوں کے درمیان ایسے روابط برقرار ہوں جن کی مدد سے ہمارے تعلیمی تعلقات زیادہ سے زیادہ استوار ہوسکیں۔ اس طرح اس یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ ایران کی دانشگاہوں میں موجود علمی و درسی امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھاسکیں اور اسی طرح ایرانی طلبا ناگپور یونیورسٹی میں خاص طور پر سائنس اور میڈیکل شعبوں میں داخلہ لے سکیں اور یہاں کی سہولتوں سے استفادہ کرسکیں۔ ڈاکٹر پٹھان نے مزید فرمایا کہ اب ہم عالم گاؤں والے دور میں زندگی بسر کررہے ہیں، اس لئے ہمارے ملک کے طلبا یہ سمجھ لیں کہ بیرونی زبان کا سیکھنا آج کی ایک اہم ضرورت ہے اور یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ آج محض مغرب کے چند ممالک کی زبان سیکھنا ہی کافی نہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر ایک طالب علم عربی جانتا ہے تو وہ خلیج فارس کے تمام ممالک میں کام کرنے کا اہل سمجھا جاتا ہے۔اور یہی بات ایران جیسے عظیم ملک پر بھی صادق آتی ہے۔ ایران اور ہندستان میں علمی، تجارتی اور یونیورسٹیوں کے درمیان تعلقات کے بڑے امکانات موجود ہیں اور طالب علم فارسی سیکھ کر ان امکانات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے بعد محترم محمد حسین مظفری مسئول خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آپ نے سب سے پہلے ناگپور آنے، ناگپور یونیورسٹی میں اس جلسہ میں شرکت اور اس علاقے کے فارسی طلبا اور اساتذہ سے ملاقات پر خوشی کا اظہار کیا۔

آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرا یہ مقصد نہیں کہ ''دورۂ بازآموزی'' کے مقاصد پر روشنی ڈالوں۔ میں یہ ذمہ داری ان اساتذہ کے سپرد کرتا ہوں جو اس جلسے میں تشریف رکھتے ہیں۔ میں اس وقت ہندستان میں فارسی زبان و ادب کی اہمیت و مناسبت پر گفتگو کروں گا۔

ہندستان میں فارسی صدیوں تک سرکاری، عدالتی اور علم و تہذیب کی زبان رہی ہے۔ آج بھی فارسی یہاں ایک بیرونی زبان نہیں سمجھی جاتی ہے۔ فارسی، سنسکرت کی مانند یہاں کی ایک کلاسیکی زبان ہے۔

میں نے اپنے ہندستانی دوستوں سے بارہا یہ سنا ہے کہ ایران و ہند کے درمیان صدیوں سے تہذیبی تعلقات رہے ہیں یہ تعلقات اس نوعیت کے تھے کہ ان ملکوں کو دو ملت یا دو تمدن نہیں کہا جاسکتا یہ تو ہر لحاظ سے ایک ہی تھے۔ درحقیقت ان دو عظیم ملکوں نے عظیم تہذیب و تمدن کو انسانی اقدار کے دوش بدوش بنی نوع انسان کو پیش کیا ہے۔ پیہم تمدنی تعلقات کے دوران ایران نے ہندستان کو دو قیمتی اقدار تحفہ میں دی ہیں۔ ایک فارسی زبان اور دوسری عرفان و تصوف۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایران نے تصوف کی عالی اور عظیم روایات کو فارسی زبان کے قالب میں پیش کیا ہے۔ فارسی زبان کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ محض ملکوں اور ملتوں میں رشتے کی زبان ہی نہیں بلکہ تصوف و انسانی اقدار کی ترجمان بھی رہی ہے۔ ہندستان نے بھی ان اقدار کا کھلے دل سے استقبال اور انہیں قبول کیا۔ یہاں ان اقدار و روایات کی حفاظت کی گئی اور ان کی قدر قیمت میں اضافہ ہوا اور پھر یہی گرانبہا تحفہ خود ایران کو پیش کیا۔

اسی طرح ہندستان نے فارسی شاعری کے میدان میں سبک ہندی یعنی فارسی شاعری کے ہندستانی اسلوب کو اپنے تمدن پرور فکر و خیال کی گود میں پالا پوسا، اسے پروان چڑھایا اور فارسی ادب کو اس طرح ترقی دی اور اسے جلا بخشی۔ افتتاحی جلسہ دوپہر دو بجے اختتام پذیر ہوا۔

زبان و ادب فارسی کے اس علاقائی بازآموزی کے پروگرام میں ناگپور کے ۳۵ اساتذہ اور طلبا نے شرکت کی۔ اس میں ڈاکٹر صفوی اور جناب روز بہانی (ایرانی اساتذہ) نے فارسی گرامر، فارسی لکھنے کے طریقے اور مختلف ادبی اسالیب کے موضوعات پر کلاسوں میں درس دیا ان کلاسوں سے ظاہر ہے طلبا کو استفادہ کا موقع ملا۔ اس پروگرام کے دوران شرکا نے اس بات پر اصرار کیا کہ ایسے پروگرام مستقبل میں بھی کئے جائیں تاکہ فارسی سے لگاؤ رکھنے والے اس سے فائدہ حاصل کرتے رہیں۔